دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

DECEMBER 2011

یادوں کے گہرے ساگر میں.....!

نیا سال، نئے سلسلے

سچی کہانیاں نئے سال کے آغاز یعنی جنوری 2012ء سے دو نئے سلسلوں کا آغاز کر رہا ہے۔

☆ مٹی سے محبت کرنے والوں اور اس پر جان دینے والوں کے لیے **منزہ سہام** کے قلم سے دل کے تاروں کو چھو لینے والا ایک منفرد سلسلہ

"شہید کی ڈائری سے ایک ورق"

سچی کہانیاں کی سینئر لکھاری **فاطمہ بلگرامی** کے قلم سے ایک نہایت دلچسپ اور تحریر خیز سلسلہ

"جن آنکھوں میں خواب بسے تھے"

جو بے شمار وطن دشمنوں کے چہروں کو بے نقاب کرے گا۔



حق

زندگی کا سفر جاری ہے۔ 2011ء کا سورج آخری سانسیں لے رہا ہے۔ نئے سال کی آمد آمد ہے اور آنے والے سال کے لیے دُعاؤں کا ایک سلسلہ ہے۔

یااللہ! آنے والے برس میں ہمارے وطنِ عزیز پاکستان کو ترقی، کامیابی اور امن عطا کرتے ہوئے دہشت گردی سے پاک کر دے۔

عوام کو خوش حالی کے ساتھ ساتھ خوشیوں سے آشنا کر

وطنِ عزیز کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ رکھ اور......اور......دعائیں تو بہت سی ہیں لیکن قبولیت کا کچھ زیادہ یقین نہیں ہے کیونکہ یہ ساری دعائیں تو گزشتہ برس بھی مانگی تھیں تو پھر سوال یہ ہے کہ ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہو رہی ہیں؟ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ ہم دعا قبول کرنے والے کے تمام حقوق بھول کر بس اپنا حق مانگنے لگے ہوں؟

منزہ سہام

احوال

اس پرچے کا مدیر قارئین کے درمیان

ماھنامہ ”سچی کہانیاں“ کے دوست قارئین کرام ......زندگی، صحت، خوشی، کامیابی اور امن کی دعاؤں کے ساتھ سلامتی بھرا اسلام آپ تک پہنچے۔ وقت کے پرندے کی اڑان جاری ہے۔ ہماری زندگی کی کتاب سے ایک اور برس منہا ہوا جاتا ہے...... ہماری سمجھ میں تو اب یہ بالکل نہیں آرہا کہ......اس سال کے جانے ......اور نئے برس کے آنے پر دعائے سالِ نو کیا ہو......؟ سو آج کے نوجوان شاعر اور ادیب کاشی چوہان کی یہ ”دعائے سالِ نو“ آپ کی بصارتوں کے رزق کی صورت پیش ہے۔

دعائے سال نو

مرے مالک! مرے مولا!
میں تجھ سے ہر برس یارب!
دعائے خیر ہی مانگوں
الٰہی! اس برس نہ ہو
جو پچھلے سال پاٹا ہے
الٰہی! امن تُو دے دے
الٰہی! آشتی دے دے
مرے مولا! مرے مالک!
میں اب کے سال بھی تجھ سے
دعائے خیر ہی مانگوں
مرے سارے جوانوں کو
مہاجر اور پٹھانوں کو
مرے غیور پنجابی، مرے سندھی، بلوچوں کو
الٰہی! ایک کر دینا
الٰہی! نیک کر دینا
مرے معصوم بچوں پر
کوئی کرب و بلا نہیں آئے
الٰہی! اس برس میں تُو
فصل دے دے محبت کی
امن ہم کاٹتے جائیں
محبت بانٹتے جائیں
الٰہی! اس برس میں ہم......

اور اب آغاز ”احوال“ ......

✉ عکاشہ سحر، ملتان سے۔ ”قابلِ احترام ناصر انکل السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ کافی عرصے کے بعد ”احوال“ میں شامل ہو رہی ہوں۔ نئے لکھنے والوں کو خلوص دل سے خوش آمدید خدائے بزرگ و برتر آپ سب کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے، آمین۔ سیلاب نے سندھ میں جو تباہی مچائی ہے۔ دل ابھی تک ملول اور اداس ہے۔ کتنی ضوفشاں خوب صورت بستیاں شہر خموشیاں میں بدل گئی ہیں۔ آشیانوں کے بکھرے اجڑے ہوئے لاشے اور پھر جسمانی، روحانی ذہنی نفسیاتی بیماریوں کا طوفان......اَب نئے نقشے ابھریں گے۔ نئے آشیانے بنیں گے۔ نئی جنتیں آباد ہوں گی لیکن زندگی کی حرارت سے نابلد تجریدی آرٹ کا رنگ لیے ہوئے ......اور وہ خواب جو بہت سی آنکھوں نے دیکھے تھے۔ وہ خواب پانی کے منہ زور ریلے اپنے سنگ بہا لے گئے۔ اب زندگی سے عاری ویران آنکھیں رہ گئی ہیں۔ یہ پانی عذاب کیوں بن گیا ہے؟ دریاؤں نے آنسو کیا بہائے ہیں کہ میرے سندھ کا ہر کوچہ و گھر کھنڈر بن گیا ہے۔ اب

اس پانی میں ڈوبی بہشت کے کس کس کھنڈر کا جو کبھی آباد ایک ہنستا بستا گھر تھا، کن کن پھٹی آنکھوں کا، ٹھنڈے جسموں میں منجمد لہو کا معصوم بچوں کی چیخوں کا جواں ارمانوں اور رعشہ زدہ ہاتھوں کے کرب و دکھ کا نوحہ لکھوں؟...... پانی میں مدفن بچوں کی ماؤں کو کیسے پُرسہ دوں؟ کس کس کا درد بیان کروں۔ میرے سندھ سائیں میں اداس ہوں۔ اب اس کیفیت میں اور کیا لکھوں؟...... احباب سچی کہانیاں سے معذرت اور ان تمام دوستوں کی از حد ممنون ہوں جو "کتاب تبصرے" کے سلسلے کو پسندیدگی کی سند بخش رہے ہیں۔ ارم زہرا صاحبہ اور بہت پیاری شازلی سعید آپ دونوں بہت اچھا اور حیران کن لکھ رہی ہیں۔ بہت سی دعائیں آپ دونوں کے لیے۔ کیوٹ چڑیا، گڑیا سویٹ سی مہناز عبدالرشید آپ کو شادی بہت بہت مبارک ہو۔ خلوص دل سے دعا گو ہوں مالکِ کائنات تمہیں اپنے گھر میں ہمیشہ شاد و آباد رکھے، آمین۔

✍ اچھی بھتیجی! عکاشہ سحر ہماری دلی خواہش ہے کہ ایسے ہی زندہ سانس لیتے الفاظ کے ساتھ "احوال" میں ہر ماہ تمہاری حاضری ہو!

✉ محمد بلال فیاض ملتان سے۔ "محترم ناصر بھائی السلام علیکم! نومبر 2011ء کا پراسرار کہانی نمبر II اس بار بہت جلد مل گیا۔ دل شاد ہو گیا۔ ناصر بھائی! آپ نے جس خلوص اور محبت سے پراسرار کہانی نمبر II میں میری تحریر لگائی۔ اس کے لیے آپ کا بے حد شکریہ۔ نومبر 2011ء کے شمارے کا سرورق "پراسرار کہانی نمبر" کے حوالے سے ٹھیک تھا۔ سرورق پر 2011 جس انداز میں لکھا تھا وہ پراسراریت قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ منزہ سہام کا اداریہ "بچپن کا ساتھی" دل کو چھو گیا۔ خاص طور پر اداریے کی آخری سطریں۔ آپی غزالہ رشید کے بھائی کی وفات کی خبر پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ دل سے ان کی مغفرت کے لیے دعا نکلی۔ "احوال" میں تمام دوستوں کے تبصرے پسند آئے۔ صفیہ سلطانہ مغل صاحبہ کو نئی کامیابیوں پر بہت بہت مبارک باد۔ فیضان حسین عثمانی کو بیٹے کا باپ بننے پر بے حد مبارک ہو۔ "میری کہانی میری زبانی" میں اس بار اشعر جواد کی مختصر اور سادہ سی زندگی کی کہانی پڑھ کر بے حد اچھا لگا۔ "لہو کا رسیا" پراسرار کہانی نمبر کا تحفہ ثابت ہوئی جس سے ہماری معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ شازلی نے مختصر مگر پُر اثر کہانی پیش کی۔ روشانے سبعین کی کہانی "مائی پیپلاں والی" اچھی کہانی تھی۔ الفاظ کا چناؤ بہت بھایا خاص طور پر کہانی کی ابتدائی سطور بہت گہرائی لیے ہوئے تھیں۔ دل میں اتر گئیں۔ اختر شہاب بہت دلچسپ کہانی لے کر آئے۔ پروین حیدر نے "وہ ایک سفر خاص" بہت اچھی تحریر پیش کی۔ فرزانہ آغا کی تحریر "وہ جو ساتھ رہے" پسند آئی۔ کہانیوں میں فی الحال یہی پڑھ سکا ہوں۔ "تبصرہ و تذکرہ" میں حجاب عباسی کے بہت سے اشعار دل میں اتر گئے۔ خیال آرائی میں سدرہ انور علی اور اُم عادل کی حقیقتیں، خیال کی صورت دل میں اتر گئیں۔ شازلی کا قطعہ "Number is busy" پڑھ کر چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس بار "آپ کی ڈائری" کا سلسلہ غیر حاضر تھا مگر کہانیاں زیادہ دیکھ کر اس کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ شگفتہ آپی! آپ کے سفرنامے کا انتظار ہے اگر ممکن ہو تو "سفرنامہ" وہاں ہونے والی تقریب کی تصاویر کے ساتھ پیش کیجیے گا۔ ناصر بھائی! ایک نئی سچی کہانی حاضر خدمت ہے۔ کہانی کے نام کا انتخاب آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اب اجازت دیجیے۔"

✍ بھائی محمد بلال فیاض! آپ کی یہ نئی کہانی بہت جلد "سچی کہانیاں" کے صفحات کی زینت ہوگی۔

✉ شگفتہ شفیق کراچی سے۔ "محترم ناصر بھائی، السلام علیکم! نومبر کا شمارہ زبردست رہا۔ سب سے پہلے تو ٹائٹل پر بنے "لہو کا رسیا" دیکھ کر خوف محسوس ہوا لیکن ساتھ ہی خوب صورت لڑکی نے ٹائٹل کو بیلنس کیا۔ منزہ نے "بچپن کا ساتھی" خوب لکھا۔ "احوال" میں امجد اسلام امجد کی نظم "کرو جو بات کرنی ہے" بہت اچھی لگی اور محمد فہیم صاحب کا خط بے حد پسند آیا۔ فرحت جمال کا خط بھی بہت خوب تھا۔ صفیہ سلطانہ صاحبہ کو کامیابیاں مبارک ہوں اور فیضان عثمانی کو بیٹے کا باپ اور ان کی بیگم کو ممی بننا مبارک ہو۔ پروین حیدر کی کہانی "وہ ایک سفر خاص" زبردست رہی اور فرزانہ آغا نے "وہ جو ساتھ رہے" خوب لکھا۔ "میں آج بھی حیران ہوں" اختر شہاب صاحب کی کہانی اچھی لگی کہ عالیہ راہِ راست پر چل پڑی۔ سنبل کی کہانی "کالا جادو کالے لوگ" پڑھ کر بے حد افسوس ہوا کہ اس قدر جلن اور اتنا حسد......!

اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ ارم زہرا ''یہ کیسا کاروبار ہے'' کے عنوان سے بے حد خطرناک کہانی لائی ہیں۔ خدا سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔ یہ سچی داستان میرا تو دل دہلا گئی ہے۔ اس کے علاوہ ابیہا مسعود اور محمد بلال فیاض کی کہانیاں بھی بے حد پسند آئیں۔ اشعر جواد نے اپنی زندگی کی کہانی بڑے سادہ انداز میں لکھی ہے۔ بہت اچھا لگا پڑھ کر۔ ''تاشون'' اور ''گھائل آتما'' حسب معمول اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ شاعری تو مجھے سب کی ہی بے حد پسند آئی ہے اور ہاں! وہ میرا سفر نامہ؟ اب اجازت دیں، اللہ حافظ۔''

✍ اچھی بہن شگفتہ شفیق! آپ کا ''سفرنامہ'' زیر نظر شمارے میں شامل ہے۔

☒ جاوید عثمان زندانی، کراچی سے۔ ''محترم ناصر رضا، سلام خلوص! نومبر 2011ء کا شمارہ جلد مل گیا۔ ٹائیٹل پر پہلے تو دوشیزہ کی تصویر دیکھ کر دل خوشی ہو گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے نیچے ڈریکولا کی تصویر دیکھ کر خوف دور کرنے کے لیے ڈائریکٹ ''احوال'' میں چھلانگ لگائی۔ خطوط میں محمد فہیم صاحب کا خط مزا دے گیا۔ فہیم صاحب کھری باتیں کرتے ہیں۔ یہی چیز قارئین کو اس دفعہ محترمہ صفیہ سلطانہ صاحبہ کا خط پڑھ کر محسوس ہوئی ہو گی۔ ام عادل کی تجاویز بھی قابل غور ہیں۔ ان کی کہانی بھی اچھی تھی۔ راجہ محمود کی تحریر ''لہو کا رسیا'' ہمیشہ کی طرح ہماری معلومات میں اضافہ کر گئی۔ روشانے سبعین، محمد فہیم، نورین شاہد، محمد بلال فیاض، ثمر احمد غرض کہ ہر لکھاری کی تحریر کو آپ کی محنت نے نکھار دیا۔ میری نظم ''حسرتوں کے مزار'' شائع کرنے کا شکریہ۔ ''احوال'' میں اپنا خط پڑھ کر خوشی ہوئی لیکن اپنی کہانی شمارے میں نا پا کر بہت مایوسی ہوئی۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا اگر یہی کہانی کسی قریبی شمارے میں بھی لگ جائے تو میری محنت وصول ہو جائے گی اور مجھے بے انتہا خوشی ہو گی۔ آپ نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ہے اور آپ کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں نے دوبارہ لکھنا شروع کیا ہے۔ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو اگلی بار بھرپور تبصرے اور کچھ نئی تحاریر کے ساتھ حاضر ہوں گا۔''

✍ بھائی جاوید احمد زندانی! آپ کی خواہش کے مطابق آپ کی کہانی اس شمارے میں شامل ہے۔

☒ غزالہ شاہین عبدالقیوم، حیدر آباد سے۔ ''محترم ناصر رضا! ''سچی کہانیاں'' کا شمارہ نومبر پراسرار کہانی نمبر II اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ ہمیشہ کی طرح یہ ایک بہترین شمارہ ثابت ہوا۔ خوب صورت دل پر اثر کرنے والی اور منفرد پُراسرار کہانیاں رسالے کا خاصا تھیں۔ منزہ سہام کا اداریہ ''بچپن کا ساتھی'' دل میں اتر گیا۔ بچپن کی یادیں جو وابستہ تھیں۔ ''احوال'' میں بہن بھائیوں کے خطوط دلکش تھے۔ راجہ محمود کا ''لہو کا رسیا'' صدیوں پر پھیلی ایک لہو پینے والی مشہور زمانہ کہانی تھی۔ شازلی کی ''بہت دور ہوں اس سے'' ایک پُر درد پراسرار کہانی تھی۔ روشانے سبعین کی ''مائی پیپلاں والی'' اپنے انداز کی ایک پُر اثر کہانی تھی۔ ام عادل کی ''جب غیب سے امداد ہوئی'' غیبی مدد کو ظاہر کرتی ایک خاص کہانی تھی۔ ممتاز احمد سندھو کی ''یہ اللہ والے'' ایک مردِ مومن کا احوال، خاص کہانی تھی جو دل میں گھر کر گئی۔ پروین حیدر صاحبہ کی ''وہ ایک سفرِ خاص'' خوب صورت اندازِ تحریر سے مزین ایک دلکش کہانی تھی جو دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ اس کے علاوہ نازیہ بتول، سدرہ انور، ثمر احمد، نفیسہ فضل، نورین شاہد، فرزانہ آغا، اختر شہاب، سنبل، ابیہا مسعود، عدیل رزاق اور محمد فہیم نے خوب کہانیاں لکھیں۔ خلیل جبار نے بھی خوب کہانی لکھی۔ مجموعی طور پر سچی کہانیاں پراسرار نمبر II اپنے انداز کا منفرد رسالہ رہا۔ غزلیں اور نظمیں دلکش رہیں۔ تمام سلسلے زبردست رہے۔ سلسلے وار پراسرار کہانی ''گھائل آتما'' کامیابی سے اپنا سفر طے کر رہی ہے۔ ''تاشون'' بھی اچھی جا رہی ہے۔ اشعر جواد صاحب کی ''زندگی لکھ رہا ہوں میں'' سادہ سی مختصر رُودادِ حیات اچھی لگی۔ بھائی ناصر رضا ''سچی کہانیاں'' آپ کی محنت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ جلد ہی ایک نئی کہانی لے کر حاضر ہوں گی۔ دعا گو ہوں کہ وطن کا چپہ چپہ امن و سکون کا گہوارہ بن جائے اور ہم امن کی پُرسکون فضا میں زندگی بسر کر سکیں۔''

✍ غزالہ شاہین عبدالقیوم صاحبہ! آپ کی نئی کہانی کا انتظار رہے گا۔

☒ عارفہ مسعود لاہور سے۔ ''محترم ناصر رضا السلام علیکم! بہت عرصہ بعد محفل میں حاضری دے رہی ہوں۔ وجہ

دعائے مغفرت

گزشتہ دنوں ادارہ کے دیرینہ ساتھی اور ماہنامہ سپر اسٹار ڈسٹ کے مدیر نعیم حبیب کی والدہ محترمہ راہی ملکِ عدم ہوئیں۔ ادارہ اس ملال کے موسم میں نعیم حبیب کے ساتھ ہے اور والدہ محترمہ کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

دیارِ وطن سے غیر حاضری تھی۔ میرا سعودی عرب کا سفر بہت شاندار تھا۔ ریاض کے شاندار عبدالعزیز کنگ ایئرپورٹ پر قدم دھرتے ہی محسوس ہوا کہ اب اللہ کا گھر قریب ہے اور پھر بارہ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد جب مسجد نبویؐ کے مینار نظر آئے، اللہ کے رحمت کے آثار نظر آئے، وہ ڈیڑھ دن گویا زندگی کا حاصل تھے۔ سبز گنبد پر نظر پڑتے ہی لگا چاروں اور روشنیاں جھلملا رہی ہوں پھر مکے کا آٹھ گھنٹے کا سفر، راستے میں احرام باندھنے اور عمرہ کی نیت سے رکے اور پھر نماز تہجد کے وقت اس گھر کی چوکھٹ پر پہنچے جہاں پہنچنا ہر مسلمان کی دیرینہ آرزو ہوتی ہے۔ اللہ تو شہ رگ سے بھی قریب ہے مگر رضا بھائی! وہاں پہنچ کر محسوس ہوتا ہے گویا اللہ نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ جسم لرزاں، آنکھیں نم، خانہ کعبہ پر نظر ڈالتے ہی گویا وقت تھم جاتا ہے۔ زندگی کی ڈور ساکت ہو جاتی ہے۔ کہاں میں کہاں یہ مقام، اللہ اللہ۔ گزری زندگی کی فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ ہر مسلمان کو وہاں ایک دفعہ ضرور بلائے۔ وہ پانچ دن کا سفر اور اس کی منزل میری آج تک کی زندگی کا حاصل ہے رضا بھائی۔ میں اس سفر کو قلم بند کرنا چاہتی ہوں مگر ڈرتی ہوں شاید حق ادا نہ کر پاؤں۔ واپس ریاض آ کر میرا دل وہیں اٹکا رہا مگر وہاں بہت سخت ڈیوٹی ہے۔ مردوں کی ہمت کو داد دینا پڑتی ہے۔ اللہ سب کو اپنی حفاظت و امان میں رکھے میرے وطن عزیز کی حفاظت کرے اور جو جہاں ہے اللہ پریشانیاں دور کرے۔ سب احوالی ساتھیوں کو سلام۔“

✍ عارفہ مسعود صاحبہ! آپ اس سفر مقدس کی روداد تحریر کرنے کی کوشش تو کریں۔ ہماری جانب سے اس مقصد میں کامیابی کی دعا آپ کے ساتھ ہے۔

☒ محمد شعبان کھوسہ کوئٹہ سے۔ ”محترم ناصر رضا بھائی، السلام علیکم! امید کرتا ہوں آپ ”سچی کہانیاں“ کی پوری ٹیم اور قارئین خیریت سے ہوں گے۔ میں معذرت خواہ ہوں کچھ مہینے محکمہ عالیہ کی مصروفیات کی وجہ سے سچی کہانیاں کی محفل سے دور رہا۔ ”سچی کہانیاں“ پہلے سے زبردست جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید کامیابیاں عطا کرے۔ ناصر رضا بھائی میرا مشورہ ہے کہ...... ”محفل دوستاں“ کی طرح ایسا سلسلہ شروع کریں کہ ”سچی کہانیاں“ کے فرینڈز آپس میں رابطے میں رہیں۔ ”احوال“ میں باجی صفیہ سلطانہ کی کامیابی کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں لمبی عمر اور ڈھیر ساری خوشیاں اور کامیابیاں عطا فرمائے، آمین۔ کاشی چوہان، عکاشہ سحر بہت ہی اچھا لکھ رہے ہیں۔ قربان علی ایری اور ملک شاہد حسین کو سچی کہانیاں میں خوش آمدید۔ ایک غزل بھیج رہا ہوں۔ بہت جلد ایک سچی ”موبائل کہانی“ بھی بھیجوں گا۔ امید کرتا ہوں پہلے کی طرح حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔“

✍ بھائی محمد شعبان کھوسہ! ہم آپ کی کہانی کے منتظر ہیں۔

☒ راحیلہ روبی مدثر، سیالکوٹ سے۔ ”ناصر بھائی آداب! میں ”سچی کہانیاں“ کی پرانی رائٹر ہوں۔ 1987ء میں میری پہلی کہانی ”سچی کہانیاں“ کی زینت بنی اور انعام حاصل کیا۔ پھر اس کے بعد مسلسل کئی کہانیاں لکھیں اور کئی پر انعام بھی ملا۔ اب بہت مدت بعد پھر سچی کہانیاں میں لوٹنے کو جی چاہا ہے۔ سو آ گئی ہوں۔“

✍ اچھی بہن راحیلہ روبی مدثر! خوش آمدید، آپ کی آمد سے ہمارا دل شاد ہو گیا۔ یہ سلسلہ اب جاری رہنا چاہیے۔

☒ لائبہ مدثر شیخ، سیالکوٹ سے۔ ”ناصر رضا انکل، السلام علیکم! میرا نام لائبہ مدثر شیخ ہے۔ میں آپ کی پرانی رائٹر راحیلہ روبی مدثر کی بیٹی ہوں۔ آئی کام پارٹ ٹو کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ مما کو دیکھ کر مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ وہ جو کہتے ہیں ناوراثت میں اولاد کو ماں باپ کی طرف سے کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے۔ سو مجھے مما کی طرف سے

لکھنا وراثت میں ملا ہے۔ میرے اندر بھی شدید خواہش ہے کہ میں بھی مما کی طرح اپنا ایک الگ مقام بناؤں۔ آپ میری اس چھوٹی سی کاوش کو اپنی ''سچی کہانیاں'' کے صفحات کی زینت بنالیں تو میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے۔ میری مما نے بھی آپ کے رسالے سے لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ سو آج اتنے سالوں بعد میں بھی اسی رسالے سے اپنے لکھنے کا آغاز کرنا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ''سچی کہانیاں'' کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔ میری مما کہتی ہیں اس رسالے نے ہر نئے لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ لہٰذا میں نے بھی ہمت کر کے قدم اٹھا ہی لیا۔ اب آپ میری رہنمائی کریں تو انشاء اللہ میں بھی اپنی اسٹڈی سے وقت نکال کر ''سچی کہانیاں'' کے لیے ضرور کچھ لکھتی رہوں گی۔''

✍ اچھی بھانجی لائبہ مدثر شیخ! تمہاری امی نے بالکل درست کہا یہ رسالہ تمہارا اپنا ہے اور ہاں! ایک اچھی بات سنو تم نے بھی اپنی امی کی طرح بہت اچھا لکھا ہے۔

✉ عبدالرزاق گویا، بھاگناڑی بلوچستان سے۔ ''اچھے ناصر بھیا السلام علیکم! ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے دوست و تمام قارئین کرام! زندگی میں صحت، کامیابی اور کامرانی ہمیشہ آپ ساتھیوں کے قدم چومے اور دعا ہے آپ تمام کو اللہ تعالیٰ اپنے حفظ وامان میں رکھے، آمین۔ خوب صورت ٹائٹل اور بہترین کہانیوں سے سجا شمارہ نومبر پڑھا۔ شمارے کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ اس سے ناصر رضا بھیا آپ کی اور ادارتی کمیٹی کی محنت اور لگن بالکل واضح اور عیاں ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ...... ! تمام کہانیاں بہت ہی پسند آئیں۔ شاعری بھی بہت ہی پسند آئی کیونکہ بھیا! میں خود نثر سے زیادہ شاعری لکھتا ہوں۔ ویسے بھیا! شمارہ دیکھ کر اور پڑھ کر جتنی خوشی ہوئی اس کے برعکس اس شمارے میں اپنی کوئی نگارش نہ شائع ہونے پر کچھ ملال بھی ہوا مگر دل شکنی نہیں ہوئی۔ اس بار بھی ایک ''خیال آرائی'' اور شاعری کے ساتھ حاضر ہوں امید قوی ہے ضرور نوازش ہوگی۔''

✍ بھائی عبدالرزاق گویا! کیا شمارہ دسمبر دیکھنے کے بعد بھی آپ کے دل میں کوئی ملال باقی ہے۔

✉ ام عادل کراچی سے۔ ''محترم ناصر رضا بھائی السلام علیکم! پراسرار کہانی نمبر II کئی دنوں سے ہاتھوں میں ہے۔ گھر میں مہمان داری کی وجہ سے مکمل پڑھ نہیں پائی۔ اس لیے جتنا پڑھا ہے اس پر تبصرہ حاضر ہے۔ ٹائٹل خوب صورتی اور خوفناکی کا حسین امتزاج تھا۔ فہرست میں اپنی کہانی، احوال میں اپنا خط اور خیال آرائی میں اپنی تحریر دیکھ کر اچھا بلکہ بہت اچھا لگا۔ اتنی جگہ جگہ دینے کا بہت بہت شکریہ قبول کیجیے۔ پڑھی جانے والی کہانیوں میں شازلی، روشانے، ممتاز احمد، بشریٰ سعید، سنبل، سیدہ تبسم زہرہ، ارم زہرا کی کہانیاں بہترین تھیں۔ ارم زہرا ہمیشہ بہت اچھی کہانیاں لاتی ہیں۔ میں سب سے پہلے انہی کی کہانی پڑھتی ہوں۔ رضیہ علمدار کی سفر حجاز مقدس واقعی روح پرور تحریر تھی۔ پڑھ کر لگا گویا ہم ان کے ساتھ ساتھ گھوم رہے ہیں۔ خدا یہ قیمتی اور مقدس لمحات ہماری بلکہ ہر مسلمان کی زندگی میں لائے، آمین۔ خیال آرائیاں سب کی بہت اچھی تھیں۔ محترم انکل فہیم کی تحریر جو پروفیسر مجنوں گورکھ پوری کی زندگی سے جڑی تھی لاجواب انتخاب تھی۔ پڑھ کر بہت بہت اچھی لگی۔ باقی تحاریر پڑھنے کا وقت نہیں ملا سو معذرت۔ محترم اس مرتبہ ڈائری کہاں کھوگئی۔ گزارش ہے ڈائری غائب نہ کیا کریں۔ اس کی غیر موجودگی سے رسالے کی چاشنی میں پھیکا پن آجاتا ہے۔ اب اجازت۔''

✍ اچھی بہن ام عادل! آپ کی پسندیدہ ڈائری پراسرار نمبر میں اضافی کہانیوں کے باعث شامل نہیں تھی۔ اب یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

✉ عبدالحکیم ساجد منچن آباد سے۔ ''برادرم ناصر رضا! کچھ عرصہ غائب رہنے کے بعد ''احوال'' میں دوبارہ حاضر ہو رہا ہوں۔ ویسے ''سچی کہانیاں'' سے ہمارا بصری ناطہ ہمیشہ سے ہی قائم رہا ہے۔ نومبر کا شمارہ خاص زیر نظر ہے۔ آپ کا ہر شمارہ ہی اچھا ہوتا ہے مگر ''پُراسرار کہانی نمبر II'' تو بہت ہی خاص تھا۔ کہانیوں کی فہرست کو بہت اچھی طرح سے

دکھ کی خبر

گزشتہ دنوں ہمارے دوست لکھاری محمد فہیم صاحب کے بڑے بھائی محمد یامین رضائے الٰہی سے رزقِ خاک ہوئے، ادارہ محمد فہیم صاحب کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کرتا ہے۔

سجایا گیا تھا۔ جس کا جواب نہیں۔ آپا منزہ سہام کا اداریہ ''بچپن کا ساتھی'' پڑھا تو بچپن کی یادیں ذہن میں گھومنے لگیں۔ ''احوال'' میں تمام لکھاریوں نے اچھی محفل سجائی اور ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت نامے لکھے۔ جن میں محمد فہیم بھائی، شگفتہ شفیق، فرحت جمال، تحسین جونیجو جی، ممتاز احمد سندھو اور ام عادل کا تبصرہ اور ان کی تجاویز بہت پسند آئیں۔ اس کے بعد ایک خاص نامہ جو صفیہ سلطانہ جی کا تھا پڑھا اچھا لگا کہ ان کے قدم بہت سی کامیابیوں نے چومے۔ اللہ انہیں سدا کامیاب رکھے، (آمین)۔ ''خیال آرائی'' میں تمام خیال ہی بہت اچھے تھے۔ غزلوں میں غیاث الدین غیاث، میثم علی آغا، عکاشہ سحر ایمان جی، عبدالباسط اسماعیل اور شگفتہ شفیق شامل تھے۔ سب نے اپنے اپنے اندازِ قلم کے جوہر دکھائے۔ نظموں میں بے نور چاند۔ علی رضا عمرانی، کھوج۔ یاسر دلاور، کیسے ممکن ہے۔ نگہت اکرم، بھرا ہوا دل۔ فیض عالم بابر، شکایت۔ قیصر منور، نیا احساس۔ نسیمہ لاکھو، بارش۔ ثانیہ بھٹی اور آخر میں سب سے اچھی ''بوری بند، زندگی آزاد''، کاشی چوہان کی شاعری اچھی لگی۔ عکاشہ سحر جی نے ''حجاب عباسی'' کی کتاب پر تبصرہ بہت اچھا کیا۔ زندگی نے مہلت دی تو اگلی بار حاضر ہوں گا۔ بھائی جان ایک غزل بھیج رہا ہوں اشاعت کا منتظر رہوں گا۔''

✍ بھائی عبدالحکیم ساجد! پراسرار نمبر کی فہرست کے سلسلے میں آپ کی تعریف ہمارے گرافک ڈیزائنر ظہیر الدین صاحب تک پہنچادی گئی ہے۔ ''احوال'' میں آئندہ آپ کا انتظار رہے گا۔

☒ مینا تاج کراچی سے۔ ''Sir ناصر سلام عرض ہے۔ دیکھیے جناب! پھر وہی اس سال کا آخری شمارہ آپہنچا اور پھر نئے سال کا دریچہ شمارہ جنوری 2012ء سے کھلے گا۔ اسی طرح کا ایک دریچہ ''سچی کہانیاں'' کھولتے ہوئے میری آمد ہوئی تھی۔ کتنا مختصر ہوتا ہے نا یہ سال کا پھیرا۔ بالکل ہماری مختصر سی زندگی کی طرح...... مگر اس مختصر سے عرصے نے قلم کے حوالے سے میری برسوں کی تشنگی ختم کردی۔ ''سچی کہانیاں'' نے مجھے سچی خوشی سے ہمکنار کیا اور آپ لوگوں کے درمیان لاکھڑا کیا۔ میرا یقین ہے کہ برسوں پرانی نفرتوں، دکھوں اور پریشانیوں پر ایک مختصر مثبت سوچ ہمیں راحت سے ہمکنار کرسکتی ہے۔ زندگی بھی مختصر ہے۔ سال کی طرح۔ میری دعا ہے کہ کچھ مثبت سوچ کی بدولت اسی مختصر عرصے میں ہم سب صدیوں کی خوشیاں حاصل کرنے کا گر سیکھ لیں۔ میری تمام نیک خواہشات کے ساتھ آپ کو اور تمام اہلِ علم کو میرا سلام۔ حنیف سحر کا بہت شکریہ جن کی بدولت ''گھائل آتما'' ہم تک پہنچی۔ اجازت چاہتی ہوں پھر حاضر ہوں گی جب تک سانسوں کا ساتھ ہے۔

ذرے ذرے میں ہے آباد جہاں
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو!

✍ مینا تاج! یہ ہمیں Sir کا مرتبہ دینا بس آپ کی مہربانی اور عنایت ہے۔ ورنہ تو آپ ماشاء اللہ خود اتنا اچھا لکھ رہی ہو کہ...... بہت سے نئے لکھنے والے اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

☒ سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے۔ ''انکل ناصر رضا السلام علیکم! انکل اس دفعہ رسالے کے صفحات آگے پیچھے تھے اور کچھ کہانیاں دو دفعہ بھی تھیں اور ایک دو کہانیوں کا ایک ہی صفحہ تھا۔ جس کی وجہ سے بہت مشکل ہوئی۔ ''احوال'' میں سب کے خطوط بہترین تھے۔ آنٹی منزہ سہام کے اداریہ میں ''بچپن کا ساتھی'' پڑھا۔ اچھا لگا۔ راجہ محمود کی ''زندہ کہانی'' بہت دلچسپ اور معلوماتی تھی۔ شازلی کی کہانی ''بہت دور ہوں اس سے'' بہت سبق آموز ہے۔ واقعی دولت اور عورت کسی بھی انسان کا ایمان خراب کرسکتی ہے۔ محمد فہیم کی ''لکھ پتا پہ کیا بیتی؟'' بہت ہی سنسنی خیز تحریر تھی۔ سنبل کی

"کالا جادو کالے لوگ" نے ثابت کیا کہ اللہ کی لاٹھی بہت بے آواز ہے۔ ایہا مسعود کی "وہ میرے اندر رہتا تھا" اچھی کہانی تھی۔ عدیل رزاق کی "اور کہانی ختم ہوگئی" اچھی اور منفرد تحریر تھی۔ ہانی کی کہانی "اسے یاد اب کچھ نہیں" پڑھ کر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ بھلا انسان اور جن کے درمیان شادی والا رشتہ کیسے ممکن ہے؟ نازیہ بتول رضا کی کہانی "سایہ تھا اک جن کا" اچھی تھی۔ ثمر احمد کی کہانی "تم میرے ہو" بہت اچھی لگی۔ نفیسہ مغل کی کہانی "چمپا کا آسیب" دکھی کر گئی۔ ہماری دعا تو ہے لیکن عمران کی خلاصی مشکل لگتی ہے۔ چڑیلیں اتنی آسانی سے کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ نورین شاہد کی کہانی دعائے پیر کامل یہ سبق دیتی ہے کہ اگر عامل و پیر کوئی نصیحت کریں تو اسے مان لینا چاہیے۔ فرزانہ آغا کی کہانی "وہ جو ساتھ رہے" بہت زبردست کہانی تھی۔ "میں آج بھی حیران ہوں" اختر شہاب کی کہانی اچھی لگی۔ "اس رات کے بعد" محمد بلال فیاض کی کہانی بہت دلچسپ و حیران کن تھی۔ خلیل جبار کی "میں کیسے بھول جاؤں" اور عطاء الرحمٰن کی "معمہ حل نہیں ہوا" بہت دلچسپ کہانیاں تھیں۔ سیدہ تبسم زہرہ رضوی کی تحریر "ایک ڈھانچے کی کہانی" پڑھ کر یقین نہیں آیا کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ کیسے بول سکتا ہے اور آنسو؟ میرے شہر کی کہانی میں ارم زہرا نے بہت زبردست کہانی لکھی۔ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ "لکھ رہا ہوں زندگی کو میں" میں اشعر جواد نے زندگی کم اور ملاقاتوں کو زیادہ لکھا۔ "سفر کہانی" میں رضیہ علمدار نے سفر حجاز مقدس کے بارے میں لکھا پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا دعا ہے اسے ہر مسلمان کو اس سعادت سے فیض یاب کرے۔ "خیال آرائی" میں صائمہ سحر کا خیال پسند آیا۔ پھر وہی بات کہ انسان انتہائی بے رحم ہوگیا ہے۔ تبصرہ تذکرہ میں حجاب عباسی کے بارے میں عکاشہ کا تبصرہ لاجواب تھا۔ سلسلے وار کہانی "تاشون" میں تاشون کا کردار بہت متاثر کن ہے، شازلی کو اتنی اچھی کہانی لکھنے پر بہت مبارک۔ غرض پراسرار کہانی نمبر II بہت لاجواب رہا۔ انکل میں ایک نئی کہانی لکھ رہی ہوں۔ مکمل ہوتے ہی بھجوادوں گی اور ہاں انکل میری موبائل کہانی کب شائع ہوگی؟"

✍ اچھی بھتیجی سدرہ انور علی! تمہاری "موبائل کہانی" اس شمارے میں موجود ہے۔ اور ہاں! سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم وہ غلط صفحات والا شمارہ فوراً ہمیں ارسال کرو، ہم تمہیں دوسرا شمارہ روانہ کرنے کے علاوہ یہ بھی دیکھیں گے کہ یہ غلطی ہمارے شعبہ پرنٹنگ اور بائنڈنگ سے ہوئی یا کچھ اور مسئلہ ہے؟

✉ رضیہ علمدار کراچی سے۔ "محترم ناصر بھائی، السلام علیکم! آپ سب لوگوں کی خیریت کے لیے دعا گو ہوں۔ پورے ایک سال کے بعد آپ سے "احوال" میں مخاطب ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بے حد مصروفیت کی وجہ سے رابطہ نہ کر سکی۔ گزشتہ دنوں اچانک آپ کی طرف سے "سچی کہانیاں" ملا اور اس میں اپنی کہانی دیکھی۔ تو بے حد خوشی ہوئی۔ میں اس وقت آفس میں تھی۔ چھوٹے بیٹے نے جو کہ بارہ سال کا ہے فون کیا اور کہا امی آپ کی کہانی شائع ہوئی ہے اور ایک رسالہ آیا ہے، بہر حال میں کچھ سمجھ نہ سکی۔ بے چینی لگی رہی۔ شام کو گھر جا کر سب سے پہلے یہی پوچھا اور جب "سچی کہانیاں" دیکھا تو بے انتہا خوشی ہوئی آپ کا شکریہ آپ نے یاد رکھا۔ اس مرتبہ پراسرار نمبر بے حد اچھا ہے۔ تمام رائٹرز نے اچھی تحریریں لکھی ہیں۔ سب کو مبارک باد۔ ایک کہانی بھیج رہی ہوں۔ عنوان آپ رکھ دیں۔ کرم نوازی ہوگی۔"

✍ اچھی بہن رضیہ علمدار! ہم کرم نوازی کے لیے تیار ہیں لیکن پہلے کہانی تو ہم تک پہنچے۔

✉ روبینہ شاہین کراچی سے۔ "محترم رضا بھائی السلام علیکم! پراسرار کہانی نمبر II کے ٹائٹل پر موجود حسینہ کے ساتھ ڈریکولا کی خون آلود تصویر اس شمارے کی پراسراریت کو بڑھا گئی۔ اس نمبر میں روشانے جی کی تحریر بہت اچھی مگر دکھی دکھی سی لگی۔ فرزانہ جی کی تحریر ذہن میں ایک ہلچل مچا گئی۔ اختر شہاب کی تحریر اچھی ہے اور اسے پڑھ کر یہ بھی سوچا کہ ایسے بزرگ نما رہنما کی ہمارے معاشرے کو بہت ضرورت ہے۔ محمد فہیم کی تحریر میں قرآنی تعلیمات کی روشنی میں روح کی حقیقت بیان کی گئی۔ "کالا جادو کالے لوگ" بھی ایک سبق آموز تحریر تھی۔ جادو کرنے اور کرانے والے یہ نہیں جانتے کہ وہ اس عمل سے ایمان جیسی دولت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ "اس رات کے بعد" غیر مرئی قوتوں سے دوچار لوگوں کی دلچسپ کہانی تھی۔ "میں کیسے بھول جاؤں" ایک عمدہ کہانی تھی۔ ہمارے اردگرد کے ماحول میں گھومتے پھرتے

نومبر 2011ء کی انعام یافتہ کہانیاں

قارئین کے ارسال کردہ ٹوکن کے ذریعے مندرجہ ذیل کہانیاں اس ترتیب سے انعام کی حقدار ٹھہریں

پروین حیدر کی تحریر "وہ ایک سفرِ خاص" پہلے انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 700.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

فرزانہ آغا کی تحریر "وہ جو میرے ساتھ رہے" دوسرے انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 500.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

روشانے سبعین کی تحریر "مائی پیپلاں والی" تیسرے انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 400.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

ایہا مسعود کی تحریر "وہ میرے اندر رہتا تھا" چوتھے انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 300.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

محمد بلال فیاض کی تحریر "اس رات کے بعد" پانچویں انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 250.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

سیدہ تبسم زہرہ رضوی کی تحریر "ایک ڈھانچے کی کہانی" چھٹے انعام کی حقدار ٹھہری' ادارے کی جانب سے مبلغ 200.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جا رہے ہیں۔

حوصلہ افزائی

مرحوم کرنل رفیق ایس ایم کی یاد میں سدرہ انور علی کی تحریر "نادیدہ مکین" کو بطور انعام مبلغ سو روپے پیش کیے جا رہے ہیں۔

بہترین شعر

قارئین نے اس بار نعیم احمد آکاش۔ حیدر آباد کا بھیجا ہوا جون ایلیا کا یہ شعر سب سے زیادہ پسند کیا۔

آج کا دن بھی عیش سے گزرا
سر سے پا تک بدن سلامت ہے

بدکردار مردوں کے لیے بھی ایسی ہی بکل قسم کی آسیبی روحوں کی ضرورت ہے کیونکہ ابھی حال ہی میں ایک ایسا درندہ صفت انسان گرفتار کیا گیا ہے جس نے مردہ خواتین کو بھی نہیں چھوڑا۔ اللہ ہمارے معاشرے کی اس بدحالی پر رحم فرمائے۔ ''یہ کیسا کاروبار'' بڑی حساس تحریر تھی اور اس شمارے کی جان بھی تھی۔ آج ہمارے اخبارات اور مختلف چینلز پر قبرستانوں اور مُردوں کی بے حرمتی کے حوالے سے کہانیاں سامنے آرہی ہیں۔ ہماری ارم زہرا نے تو بہت پہلے ہی ''سچی کہانیاں'' میں اپنے شہر کی کہانی سناتے ہوئے اس خبر کو بریک کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں ارم زہرا مبارک باد کی مستحق ہیں۔''

✍ اچھی بہن روبینہ شاہین! ارم زہرا صاحبہ کے اس کارنامے کا ذکر تو ایک ٹی وی چینل نے بھی ''سچی کہانیاں'' کے حوالے کے ساتھ کیا ہے۔ بہرحال آپ کی مبارک باد ان تک پہنچائی جارہی ہے۔

✉ فرحت جمال کراچی سے۔ ''ناصر بھائی السلام علیکم! بہت ساری نیک خواہشات اور دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں۔ ''احوال'' کے آغاز میں آپ نے صحیح کہا کہ دل میں جو بات ہو کہہ دینی چاہیے۔ کیا خبر اپنی بات کہنے کے لیے مہلت ملتی بھی ہے یا نہیں،

زمانہ ایک لوگوں سے بھرا فٹ پاتھ ہے جس پر
کسی کو ایک لمحے کے لیے رکنا نہیں ملتا
کرو جو بات کرنی ہے

میں بھی یہی کہوں گی آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیجیے۔ دل میں نہ رہنے دیں۔ بس اس بات کا خیال رکھیں۔ آپ کی کسی بات سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ اس بار کا شمارہ ''سچی کہانیاں'' بے حد شاندار رہا۔ سب ہی تحریریں ایک سے ایک بڑھ کر تھیں۔ اس ماہ صفیہ سلطانہ کا خصوصی خط پڑھ کر اچھا لگا۔ ''بہت دور ہوں اس سے'' شازلی کی تحریریں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ روشانے سبعین کی ''مائی پیپلاں والی'' ام عادل کی ''جب غیب سے امداد ہوئی'' ممتاز احمد سندھو کی ''یہ اللہ والے'' بشریٰ سعید کی ''ایک تھا مسیحا'' بہت ہی اچھی کہانیاں لگیں۔ پروین حیدر کی کہانی ''وہ ایک سفرِ خاص'' بہت خاص کہانی لگی۔ ہانی کی کہانی ''اسے یاد اب کچھ نہیں ہے'' جی ہاں انسانوں کی طرح جنوں میں بھی اچھے برے ہوتے ہیں۔ نازیہ بتول، سدرہ انور، ثمر احمد، نورین شاہد، اختر شہاب، محمد فہیم، سنبل، ایما مسعود، عدیل رزاق، محمد بلال، خلیل جبار، سیدہ تبسم کی کہانیاں بہت زیادہ پسند آئیں۔ ارم زہرا کی تحریر ''یہ کیسا کاروبار ہے'' ارم آپ نے صحیح لکھا ہے اب کوئی بعید نہیں رہی کہ لوگ عملی طور پر ایک دوسرے کا گوشت نوچنے پر آمادہ نہ ہو جائیں ''گھائل آتما'' اور ''ناشون'' کی کیا تعریف کروں یہ تو ہیں ہی لاجواب سلسلے! شاعری کا بھی جواب نہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک کلام تھا۔ جاوید عثمان زندانی، شگفتہ شفیق، فیض عالم بابر، عکاشہ سحر ایمان کی بے حد پسند آئیں۔ کاشی آپ نے اپنے کلام سے اداس کر دیا۔ اب میں اپنے کلام کی کیا تعریف کروں وہ تو آپ سب کریں گے۔ خوش رہیے۔ اب اجازت اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بری گھڑی سے بچائے، آمین۔''

✍ اچھی بہن فرحت جمال! ''احوال'' میں آئندہ بھی آپ کی آمد کا انتظار رہے گا اور اگر کہانی کے ساتھ آمد ہو تو کیا بات ہوگی۔

✉ وفا صدام حسین غازی، حیدرآباد سے۔ ''محترم ناصر رضا السلام علیکم! ''سچی کہانیاں'' کا پراسرار نمبر ملا۔ سرورق اچھا لگا۔ منزہ سہام کا اداریہ ''بچپن کا ساتھی'' پڑھا بالکل ایسے ہی حالات ہیں ریلوے کے۔ ''احوال'' میں سب دوستوں کے خط پڑھے۔ اپنا خط دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ راجہ محمود کی دلچسپ تحریر ''لہو کا رسیا'' پڑھ کر حیرت ہوئی۔ شازلی کی ''بہت دور ہوں اس سے'' بھی بہت اچھی لگی۔ روشانے سبعین کی ''مائی پیپلاں والی'' بھی اچھی لگی۔ ام عادل کی ''جب غیب سے امداد ہوئی'' بڑی زبردست کہانی تھی۔ میں ابھی بس اتنا ہی پڑھ پایا ہوں۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ اب آپ سے اجازت چاہتا ہوں بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔''

☜ محترم وفا صدام حسین غازی! ہم تو ہمیشہ سب کو اپنی دعاؤں میں شامل رکھتے ہیں کہ...... یہ نیکی اور بھلائی کا سب سے آسان اور پکا راستہ ہے۔

✉ ممتاز احمد سرگودھا سے۔ ''محترم ناصر رضا! سدا شاد و آباد رہیں، آمین۔ سب سے پہلے ''سچی کہانیاں'' کی تمام ٹیم اور قارئین کرام کو میری طرف سے سلام۔ بہت ساری بے لوث محبتوں، پیار اور ڈھیروں دعاؤں کا گلدستہ قبول فرمائیں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر اللہ کریم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ سب سے پہلے میں آپ کا بے حد دلی ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے میری حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے میری کہانی شائع کی اور میرے خطوط بھی ''احوال'' میں شائع کرتے ہیں۔ آپ کی طرف سے ارسال کردہ اعزازی شمارہ نومبر 2011ء موصول ہوا، بہت شکریہ۔ سچی کہانیاں میرا محبوب رسالہ ہے۔ محترم! آپ جس طرح مجھ جیسے نو آموز اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی فرما کر تحریروں اور کہانیوں کی نوک پلک سنوارتے ہیں اور قابل اشاعت بناتے ہیں اس سے مزید لکھنے کی جستجو پیدا ہوتی ہے اور یہ آپ ہی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ ایک اور سو فیصد سچی کہانی حاضر خدمت ہے اور ''خیال آرائی'' میں ''یادیں'' کے عنوان سے ایک مختصر تحریر بھی۔ امید ہے حسب سابق اس بار بھی پذیرائی ہوگی اور اب بات ہو جائے شمارہ نومبر پراسرار کہانی II کی۔ ٹائٹل میں بجی خوب صورت دوشیزہ کی خوب صورت آنکھوں کا خوب صورت دیکھنے کا انداز اور سیاہ کالی زلفوں کے عین نیچے ویمپائر کی تصویر یقیناً ماڈل کو نظر بد سے بچانے کا اچھا اہتمام تھا۔ ''احوال'' میں سب کے تبصرے اچھے لگے۔ تمام کہانیاں بلاشبہ زبردست اور انتہائی پراسرار تھیں۔ محترمہ روشانے سبعین صاحبہ کی کہانی ''مائی پیپلاں والی'' میں بہت سے اسرار پوشیدہ تھے۔ جب انسان سچے دل سے توبہ کر کے اللہ کی طرف رجوع کرے تو کوئی شک نہیں کہ ولایت کی منزل بھی مل جاتی ہے۔ بہن ام عادل کی کہانی ''جب غیب سے مدد ہوئی'' اس بات کا درس دیتی ہے کہ آپ صدق دل سے اپنے سوہنے رب کو پکاریں تو سہی۔ وہ پکارنے والوں کی اس طریقہ سے مدد فرماتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ محترمہ بشریٰ سعید کی کہانی ''ایک تھا مسیحا'' بہت ہی لاجواب کہانی ہے۔ ڈاکٹر انور علی واقعی مسیحا تھے۔ پروین حیدر کی کہانی ''وہ اک سفر خاص'' ہانی کی ''اسے یاد اب کچھ نہیں'' نازیہ بتول رضا کی ''سایہ تھا اک جن کا'' سدرہ انور علی کی ''نادیدہ مکین'' ثمر احمد کی ''تم میرے ہو'' واقعی انتہائی پراسرار اور عقل کو حیران کر دینے والی کہانیاں ہیں اور ان میں کئی بھید چھپے ہوئے ہیں۔ ان کہانیوں نے شمارے کو چار چاند لگا دیے۔ نفیسہ مغل کی ''چمپا کا آسیب'' پڑھ کر دل بہت مغموم ہوا۔ دعا ہے کہ اللہ کریم عمران کو جلد از جلد صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ فرزانہ آغا کی کہانی ''وہ ساتھ ہے'' بڑی حیران کن کہانی ہے۔ یقیناً اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے مخلوق خدا کی خدمت میں ہر وقت کمربستہ رہتے ہیں۔ اختر شہاب کی کہانی ''میں آج بھی حیراں ہوں'' سے درس ملتا ہے کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ جب اللہ رب العزت اپنا کرم فرماتا ہے تو ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان کی زندگی کی کایا یکدم پلٹ جاتی ہے۔ سنبل کی کہانی ''کالا جادو کالے لوگ'' پڑھ کر دل خون کے آنسو رویا۔ یہ جادو ٹونے کرنے اور کروانے والے کیوں بھول جاتے ہیں کہ یہ ایک ایسا قبیح فعل ہے جس سے انسان کافر ہو جاتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ کا ایندھن بن جاتا ہے۔ عدیل رزاق کی کہانی ''اور کہانی ختم ہوگئی'' محمد بلال فیاض کی کہانی ''اس رات کے بعد'' خلیل جبار کی کہانی ''میں کیسے بھول جاؤں'' پڑھ کر ورطہ حیرت میں گم ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ عطاء الرحمٰن کی کہانی ''معمہ حل نہیں ہوا'' سیدہ تبسم زہرہ رضوی کی کہانی ''ایک ڈھانچے کی کہانی'' بہت متاثر کن تھیں۔ یہ قدرت کے راز ہیں جو ہر کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ ارم زہرہ کی کہانی ''یہ کیسا کاروبار ہے'' پڑھ کر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ معاشرے کے ایسے بدکردار لوگ انسان کہلانے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ معاشرے کا ناسور ہیں اور زمانہ جاہلیت سے بھی چار ہاتھ آگے نکل گئے ہیں۔ خدا کرے ایسے ناعاقبت اندیش لوگ جلد اپنے انجام بد کو پہنچیں۔ ''خیال آرائی'' میں سب کی تحریریں بہت عمدہ تھیں۔ بالخصوص ام عادل کی تحریر ''بدعنوانی کا ٹھیکہ'' بہت ہی لاجواب اور سبق آموز ہے۔

اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا اللہ کریم آپ کو اپنی رحمتوں کے حصار میں رکھے، آمین۔"

✍ ممتاز احمد صاحب! آپ نے جن اچھے الفاظ سے ہماری تعریف کی ہم اس کے لیے دل کی گہرائیوں سے آپ کے شکر گزار ہیں۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہمارے ادارے کے مرحوم سربراہ سہام مرزا صاحب کی اولین ترجیح اور ہدایت تھی۔ بس ہم اسی ہدایت پر عمل پیرا ہیں۔

☒ عطیہ ہدایت اللہ پشاور سے۔ "رضا صاحب السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ میری کہانی "زیست کے دلدل میں" چھاپنے کا از حد شکریہ۔ "سچی کہانیاں" میں عرصے سے پڑھ رہی ہوں۔ یہ رسالہ بہت اچھا لگتا ہے اور اب تو اپنا نام پڑھ کر اور بھی اچھا لگنے لگا ہے۔ کاشی چوہان کی شاعری بہت اچھی ہے۔ خوفناک کہانیاں تھوڑی دیر کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے نکال کر فینٹسی لینڈ میں لے جاتی ہیں جو کہ بری بات نہیں۔ میں دو مزید "سچی کہانیاں" بھیج رہی ہوں۔ امید ہے چھپ جائیں گی۔ کیا خیال ہے؟ سب کو درجہ بہ درجہ سلام و دعائیں۔"

✍ عطیہ ہدایت اللہ صاحبہ! آپ اچھا لکھتی ہیں، لکھنے کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ آپ کی دونوں نئی کہانیاں جلد شامل اشاعت ہوں گی۔

☒ تنویر خالد میلسی ضلع وہاڑی سے۔ "ناصر انکل السلام علیکم! انکل جی، میرے پاس رسالہ کافی لیٹ پہنچتا ہے۔ اس لیے میں دس تاریخ تک خط بھیجنے کی شرط کی وجہ سے کہانیوں کے بارے میں تبصرہ نہیں لکھ سکتا۔ ویسے سب لکھنے والے بہت اچھا لکھتے ہیں مگر بہت حد تک سنجیدہ سے رہتے ہیں۔ انکل جی! ایک مشورہ ہے آپ لکھنے والوں کی سنجیدگی کو ختم کرنے کے لیے کوئی ہنسی مذاق کا سلسلہ شروع کر دیں۔ اس سے رونق اور بڑھ جائے گی۔ انکل جی! میں نے پہلے آپ کو ایک کہانی بھیجی تھی۔ آپ میری کہانی آپ کو کیسی لگی بتانا ضرور؟"

✍ اچھے بھتیجے تنویر خالد! تمہاری کہانی کا خیال اچھا ہے لیکن اسے شائع کرنے کے لیے کچھ کام کرنا ہوگا۔

☒ آصفہ اقبال بلوچ، کراچی سے۔ "ناصر صاحب السلام علیکم! آپ کا خط موصول ہوا اور یقین جانیے پڑھ کر خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے "زندگی لکھ رہی ہوں" کے لیے مجھ ناچیز سے لکھنے کو کہا۔ زندگی میں بہت کچھ ہوتا ہے جو ہم آدھا لکھتے ہیں تو آدھا مصلحتوں کی وجہ سے چھپاتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ پھر بھی اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ ایک بار پھر آپ کا بے حد شکریہ کہ اتنی محبت اور اتنے اچھے طریقے سے لکھنا ہر کسی کی بس کی بات نہیں ہوتی۔"

✍ آصفہ اقبال صاحبہ! آپ ہماری بہت اچھی لکھنے والی ہیں۔ آپ نے ہمارے کہنے پر اپنی زندگی کے کچھ گوشوں سے "زندگی لکھ رہی ہوں" کی صورت پردہ اٹھایا...... ہم دل کی گہرائیوں سے اس سلسلے میں آپ کے شکر گزار ہیں۔

☒ یمی غزالہ نہاں، کراچی سے۔ "ناصر صاحب السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ بہت عرصے بعد "احوال" میں لکھے اس خط کی صورت رابطہ ہو رہا ہے۔ گزشتہ سال سے میں کشاکش حیات میں گھری ہوئی ہوں۔ پہلے ابا، پھر ٹھیک چار مہینے کے بعد میری اماں، ڈیڑھ سال بعد بھائی، پھر کچھ اور خاندان کے عزیز اس کے ڈیڑھ سال بعد میرے شوہر سید سلیم احمد ان کے چار مہینے کے بعد میری چھوٹی بہن داغ مفارقت دے گئے۔ ایسے میں لکھنے لکھانے کا ہوش کس کو تھا۔ شوہر کے انتقال کو بھی ایک سال ہو گیا ہے۔ ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں لیکن لکھنے کی عادت نہیں گئی۔ ایک سچی کہانی "میں بہک سکوں یہ مجال کیا" بھیج رہی ہوں جس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ میری قریبی دوست پر گزر چکی ہے۔ کافی عرصے بعد قلم اٹھایا ہے۔ شاید موضوع پر گرفت مضبوط نہ ہو۔

✍ یمی غزالہ نہاں صاحبہ! آپ کا یہ خط ہمارے لیے بہت زیادہ ملال کا باعث بنا ہے۔ اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ ان کے درجات بلند کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آپ کی کہانی اچھی ہے۔ انشاء اللہ نئے سال کے پہلے شمارے میں شامل ہو گی۔

✉ شاہد وفا، کراچی سے۔ ''شفیق و مہربان انکل ناصر رضا السلام علیکم! میں نے چند ماہ پہلے آپ کو ایک کہانی بھیجی تھی مگر افسوس آپ نے میری کہانی شاید نہیں دیکھی۔ اب ایک اور کہانی بھیج رہا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ میری کہانی اتنی دلچسپ نہیں ہوگی۔ بے شمار غلطیاں بھی ہوں گی لیکن امید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی ضرور کریں گے؟ ''سچی کہانیاں'' کی میں جتنی تعریف کروں اتنی کم ہے۔ ''گھائل آتما'' اور ''تاشون'' دونوں سلسلے بہت اچھے جا رہے ہیں اور لکھنے والے بھی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ناصر انکل! میں اور بھی رسالے پڑھتا ہوں مگر میں لکھنا صرف ''سچی کہانیاں'' میں چاہتا ہوں۔''

✍ اچھے بھتیجے شاہد وفا! تمہاری کہانیوں پر بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے تھوڑا سا وقت درکار ہے لیکن کہانی شائع ضرور ہوگی۔

✉ مَن شاہ ٹھٹھہ سے۔ ''محترم بھائی ناصر رضا السلام علیکم! ایک لمبی غیر حاضری کے بعد ''احوال'' میں حاضری لگا رہی ہوں۔ وجہ پانچ ماہ پہلے میری امی مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئیں۔ پہلے میرے ابو مجھے چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلے گئے تھے تو امی ہی میرے لیے سب کچھ تھیں۔ ان ہی کی وجہ سے میری دنیا میں روشنی تھی۔ اب ان کے جانے کے بعد مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میری تمام قارئین سے درخواست ہے کہ وہ میری امی کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ امی کے بعد اب ''سچی کہانیاں'' ہی بس میرا ساتھی ہے۔ شمارہ اکتوبر کے ''احوال'' کے آغاز میں آپ کی جاپان والی بات نے میرا دل باغ باغ کر دیا تھا۔ بھائی تسی گریٹ ہو...... ''پراسرار کہانیاں نمبر II'' بھی لاجواب ہے۔ تمام کہانیاں اچھی ہیں۔ شاعری میں علی رضا، جاوید عثمان، شگفتہ، فرحت جمال وغیرہ کی شاعری بہت اچھی تھی۔ کاشی چوہان کی نظم ''بوری بند زندگی آزاد'' لاجواب رہی۔ یہ آج کی حقیقی تصویر ہے۔ ناصر بھائی! میں نے امی کی موت کے بعد شاعری کی ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔''

✍ اچھی بہن مَن شاہ! تمہارا یہ خط پڑھ کر ہمارا دل دکھ سے آباد ہو گیا ہے۔ اللہ تمہاری امی کی مغفرت کرے اور تمہیں سکون اور صبر عطا کرے۔

✉ ندا اسعد، یو اے ای سے۔ ''محترم ناصر انکل آداب! بہت عرصے بعد آپ سے یہ آدھی ملاقات ''احوال'' میں خط کی صورت ہو رہی ہے۔ آپ کے تو علم میں ہے کہ گزشتہ دنوں ابو دل کی شرارت کے سبب صاحب فراش رہے اور انجیو گرافی کی نوبت آگئی۔ بس اس پریشانی نے بہت پریشان رکھا۔ میری تمام قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ابو کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ اس دوران میں ''سچی کہانیاں'' سے رشتہ برقرار رہا ہے۔ ''سچی کہانیاں'' کا معیار بہتر سے بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ ''سچی کہانیاں'' کا تازہ شمارہ پراسرار نمبر II مجھ تک پہنچ چکا ہے لیکن میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گی۔ بہت معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ میں پراسرار کہانیوں کو سچی کہانی کے بالکل برعکس چیز سمجھتی ہوں۔ میری اس بات کا ثبوت میڈم صفیہ سلطانہ مغل کی موبائل کہانی ''وہ ناری میں خاکی'' ہے۔ میرے لیے ایک بات اور بھی باعث حیرت ہے جب کہ شمارہ اگست 2011ء میں یہ کہانی بہت حد تک قابل قبول انداز میں شائع ہو چکی تھی۔ تو پھر میڈم صفیہ سلطانہ نے اسے ایک نہایت ناقابل یقین حصے کے ساتھ دوبارہ شائع کرنے پر زور کیوں دیا؟ بہرحال یہ میری ذاتی رائے ہے کسی کا اس سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے۔ کچھ عرصے سے ''سچی کہانیاں'' کے لیے ایک کہانی شروع کی ہوئی ہے جیسے ہی مکمل ہوگی ارسال کر دوں گی۔ اب اجازت بہت سی اچھی دعائیں آپ کے ساتھ سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف، لکھاریوں اور قارئین کے لیے۔''

✍ بہت اچھی بھتیجی ندا اسعد! آپ کے ابو جمیل صدیقی بہت پیارے انسان ہیں جب وہ افسر تھے اور اب جب وہ عوامی ہیں، ان کی لوگوں سے اور لوگوں کی ان سے محبت کا سلسلہ جاری ہے، سو صرف ہم ہی نہیں اور بھی بے شمار لوگ ان کی صحت اور زندگی کے لیے ہم دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہیں۔ پراسرار کہانیوں کے حوالے سے آپ کی جو رائے

ہے ہم اس کا احترام کرتے ہیں لیکن اکثریت کی اس حوالے سے سوچ کچھ اور ہے۔

✉ صفیہ سلطانہ مغل جیکب آباد سے۔ ”محترم ناصر رضا السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں۔

میں خود بھی تیری محبت سے پیشتر یوں تھا
کہ جیسے کوئی امت کتاب سے پہلے

پرچہ اولین تاریخوں میں مل گیا تھا۔ صد شکر گو کہ میں نے دوسرے دن ہی خط حوالہ ڈاک کر دیا تھا ہمیشہ کی طرح مگر جب آپ سے فون پر شرف ہمکلامی ہوا تو آپ نے یہ فرما کر کہ تمہارا خط اب تک کیوں نہیں ملا، کہہ کر مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا اور پھر یہ پیار بھری سرزنش کہ فوراً سے پیشتر دوسرا خط لکھ کر بھیجو

ہر لفظ میں خلوص اور ہر لفظ میں دعا
مقروض کر دیا ہے اس تیرے پیار نے

بہر حال آپ نے میرا چونکہ ہمیشہ مان رکھا ہے سو میں نے بھی آپ کا مان رکھا ہے اور احسان نہیں، خلوص کے جواب میں صرف خلوص ہی ہوتا ہے۔ اب آئیے تبصرے کی جانب۔ مگر سب سے پہلے میں نعیم صاحب کے دروازے پر دستک دوں گی کہ انہوں نے شکوہ کیا ہے کہ میں صرف اپنے بارے میں ہی لکھتی ہوں۔ میرے محترم! آپ صرف ستمبر کا شمارہ دیکھئے، اس خط میں تو سب کی کہانیوں پر ہی تبصرہ تھا۔ وہ دو صفحات کا خط میں نے ”صفت تعلی“ میں نہیں لکھا تھا اور دیگر پرچوں میں بشمول دوشیزہ، میں نے ہمیشہ دوسروں کی کہانیوں پر ہی تبصرے کیے ہیں شاید آپ کی کہانی پر تبصرہ بھرپور نہ تھا اس لیے یہ بات آپ کو گراں گزری۔ بہر حال میں بے حد معذرت خواہ ہوں۔ مجھ سے زندگی نے جہاں بہت امتحان لیے ہیں شاید اس وجہ سے؟ کوتاہی بھی سرزد ہو گئی ہو

میں کیسے بھلا پھرتا حوصلہ جوان لیے
کہ زندگی نے مجھ سے بڑے امتحان لیے

شگفتہ جی، تمہارے سفرنامے کا شدت سے انتظار ہے۔ یقین مانو ایسا لگ رہا ہے تمہارے اس شعری و ادبی سفر میں ہم بھی تمہارے ہمسفر تھے اور وطن عزیز میں لوٹ کر بھی تمہاری خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔ بہت مبارک باد قبول ہو۔ راجہ بھائی کی کہانی ”لہو رسیا“ سچ مچ اس نے لہو گرما کر رکھ دیا۔ راجہ محمود قارئین کے لیے ہمیشہ ہی بہت اچھا ”منفرد اور تحفہء خاص“ لے کر آتے ہیں۔ پیارے بھیا بہت شکریہ۔ تبسم زہرا رضوی تمہاری کہانی بہت عمدہ تھی مگر ڈیئر تم نے فون کیا تھا۔ وہ V Fone نمبر میں محفوظ نہ کر سکی۔ پلیز میرے سیل نمبر پر رابطہ کرو۔ تمہاری ادبی اور شعری گفتگو کو بہت Miss کر رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم ضرور فون کرو گی۔

ان سے باتیں کیں تصور میں تو یہ ہم پر کھلا
کشورِ الفت میں ٹیلی فون کا دفتر کھلا

تو پلیز وہی دفتر دوبارہ کھولیے۔ ممتاز احمد سندھو کی کہانی ”یہ اللہ والے“ بہت اچھی رہی مگر اس قبیل کی اور کہانیاں بھی پڑھ چکے ہیں۔ بشریٰ سعید بہت منجھی ہوئی لکھاری ہیں۔ ان کے قلم سے نکلنے والا ہر لفظ صفحہء قرطاس پر زینت بن کر کہانی کو لاجواب بنا دیتا ہے۔ انہی صفحات پر شگفتہ شفیق کی غزل بھی بہت خوب تھی۔ بعینہ پروین حیدر کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش ہے۔ وہ بھی کہنہ مشق لکھاری ہیں، ان کی کہانی بھی لاجواب ہے۔ سدرہ انور کی کہانی ”نادیدہ مکین“ بھی بے حد عمدہ تھی۔ یہ تو بعین ہماری طرح ہے۔

جس جا مکین بننے کے دیکھے تھے میں نے خواب
اس گھر میں ایک شب کی مہمان بھی نہ تھی

✍ صفیہ سلطانہ صاحبہ! ہم نے تو ہمیشہ اپنے لکھاری دوستوں کا مان رکھا ہے اور رکھیں گے......!

سوچو ذرا!

میرے شہر کے جسم سے
اُٹھ رہی ہے بُو بارود کی
اِس کی گلیوں میں چیخیں ہیں
بے گناہ لوگوں کی
اِس کے آنگنوں میں سسکیاں ہیں
بے گناہ سہاگنوں کی
دھنک رنگ آنچلوں کی! حنا رنگ ہتھیلیوں کی
پریشاں چہرے، حیراں آنکھیں اور......
ہاتھوں میں ٹوٹے کھلونے
صرف یہ سُنا ہے، پھر دھماکا ہوا ہے!
آج پھر کوئی بِکا، کوئی لُٹا ہے
اور تاریخ کا سر جھک گیا ہے
سہمی ہوئی زندگی ہے اور موت کا دھمال
لہو رنگ محفلیں، کفن اوڑھے لاشے
جن پہ لکھا ہے، ہماری کیا خطا ہے؟
تباہیوں کے سائے منڈلا رہے ہیں
انسان نما گِدھ شہر میں آ رہے ہیں
سنو!
اِن گلیوں میں پروان چڑھے کئی چہرے
تمہارے ہیں، تمہیں بہت پیارے ہیں
کل اُن کی اور تمہاری باری ہے
کب بچ پاؤ گے انجامِ عمل سے
اور پھر! کسی دھماکے میں
بکھری لاشوں میں! کوئی لاش ادھوری سی
تمہاری ہو گی
لاوارث بے نشان

مسرت گیلانی

اس ماہ کا خصوصی خط

محمد فہیم، کراچی سے۔ ”برادر عزیز ناصر رضا! ڈھیروں دعاؤں اور تمام نیک خواہشات کے ساتھ سلام مسنون اور آپ کے توسط سے تمام قارئین اور ادارے سے وابستہ خواتین و حضرات کو عید الاضحیٰ کی دلی مبارک باد قبول ہو۔ اس دعا کے ساتھ کہ ہم سب کو سنت ابراہیمی کی اصل حقیقت کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق و ہدایت نصیب فرمائے...... کہ سات آٹھ لاکھ کی خوب صورت سی گائے اور 60 سے 65 ہزار کا بکرا دروازے پر عید الاضحیٰ سے 15 بیس روز پہلے لا باندھنے سے ہماری نمود و نمائش اور واہ واہ سننے کی اندرونی خواہش کی تسکین تو ہو سکتی ہے لیکن اس سنت کی اصل روح تک ہرگز ہرگز نہیں پہنچنا ممکن نہیں۔ اللہ ہم سب کو اس ظاہری نمود و نمائش سے محفوظ رکھے، آمین۔ نومبر کا پرچہ ملا۔ آپ کی پرچے کو دن رات بہتر سے بہتر بنانے کے سلسلے میں کی جانے والی کاوشیں رنگ لانے لگی ہیں جو کہ اس پراسرار کہانی نمبر II سے بھی عیاں ہیں۔ تقریباً تمام ہی کہانیوں کا معیار بہت بلند تھا اور آپ کے اس دعوے کو یقیناً صحیح ثابت کرتا ہوا کہ ”پراسرار کہانی نمبر“ سچی کہانیاں کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا نمبر ہے۔ بھائی ناصر! آپ کی کوشش یقیناً قابل ستائش تو ہیں لیکن ہمیں اجازت دیں تو عرض کریں کہ جب تک آپ بیشتر پرانے لکھاریوں کو سچی کہانیاں میں واپس نہیں لاتے ماہنامہ اپنا وہ مقام نہیں حاصل کر سکتا جو کہ اسے آج سے سات آٹھ سال پہلے حاصل تھا۔ آپ یہ محاورہ کیوں فراموش کر دیتے ہیں ”نیا نو دن کا پرانا سو دن کا“۔ کوئی پرانا قاری کیا؟ رابیل عطاری، فائزہ شہزاد، مخدوم سسٹر، خامان سسٹرز، ماریہ عرفان، اچار والی باجی، فرینہ رزاق، افشاں سحر وغیرہ وغیرہ۔ کی تحریروں کو فراموش کر سکتا ہے؟ ہم ایک بار پھر آپ سے التجا کرتے ہیں کہ پرانے لکھاریوں کی ناراضگی دور کریں انہیں واپس لائیں اور انہیں ان کا جائز مقام دیں یعنی انہیں نئے لکھنے والوں کے مقابلے میں جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کی پالیسی میں تبدیلی لائیں تو دیکھیں پرچہ کس طرح دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ مفت مشورہ نہ آپ کو پسند آئے گا نہ ہی آپ ہماری اس بات سے اتفاق کریں گے۔ بلکہ اس مشورہ کو اسی طرح نظر انداز کر دیا جائے گا جیسا کہ آج کل کے حکمران عدلیہ کی جانب سے کی جانے والی ہدایات کو کرتے ہیں حالانکہ بہت سے قارئین کی آواز ہماری آواز کے ساتھ ہے اور یہ سب پرانے لکھاری ادارے اور پرچے کے بہی خواہ ہیں مخالف نہیں۔ شوق سے نئے لکھنے والوں کی پذیرائی کیجیے لیکن تناسب اور اعتدال کے ساتھ کہ یہی پرانے لکھاری بھی کبھی نئے لکھنے والے تھے۔

محترم محمد فہیم بھائی! زندگی کا سفر جاری رہتا ہے اور منظر بدلتے رہتے ہیں۔ جو کل تھا وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔ اس ادارے میں کبھی میرے ”باس“ مرحوم سہام مرزا، میرے استاد دانش دیروی، شمیم نوید، ابن حسن عثمان آبادی، حاجی عدیل وغیرہ اور...... اللہ زندگی، صحت اور کامرانی دے بھائی پرویز بلگرامی بھائی، سلیم فاروقی، بھائی زبیر عباسی وغیرہ اسی ادارے میں ہوا کرتے تھے۔ آج میں ہوں ”کل“ کوئی اور ہوگا کہ یہی زندگی ہے۔ ”سچی کہانیاں“ اپنے آغاز سے نئے لکھنے والوں کا ماہنامہ تھا لیکن کچھ سینئرز بھی ساتھ ہوا کرتے تھے لیکن اس بات کے قطع نظر...... ہم نے آج تک کبھی کسی سینئر دوست لکھاری سے دوری اختیار کرنے کا سوچا تک نہیں ہے، جو جو جب جب آیا ہمارے دل اور سچی کہانیاں کے صفحات کا مہمان بنا۔ خدا گواہ ہے ہم نے کبھی جونیئرز کو سینئرز پر ترجیح نہیں دی۔ ایسا تو اس وقت ہوگا جب ان کی تحریریں ہمارے پاس موجود ہوتے ہوئے نہ لگیں۔ اصل میں اب وقت کے ساتھ ہمارے سینئر دوستوں کی زندگی اور حالات مختلف ہو گئے ہیں یقیناً ان کی مصروفیات اور ترجیحات بھی بدل گئی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اب ”سچی کہانیاں“ اُن کی بصارتوں کا مہمان ہی نہ بن رہا ہو۔ اس کے باوجود بھی چلیے ہم یوں کرتے ہیں کہ...... آپ کے سپرد یہ کام کرتے ہیں (کیونکہ بہت سے قارئین کی آواز آپ کی آواز کے ساتھ ہے۔) آپ ہمارے ان محترم سینئرز لکھاریوں سے کہیں کہ...... وہ ”سچی کہانیاں“ سے فوری طور پر قلمی رشتہ جوڑیں اور اس بات کی خبر آپ کو بھی دیں...... اور آپ ہمیں! ہوا اور حرف آخر کے طور پر ہم خود بھی تمام سینئرز دوستوں کو دل کی گہرائیوں سے آواز دے رہے ہیں...... چلے بھی آؤ کہ......

اچھا اب اجازت...... پھر ملیں گے گر خدا لایا...... ناصر رضا

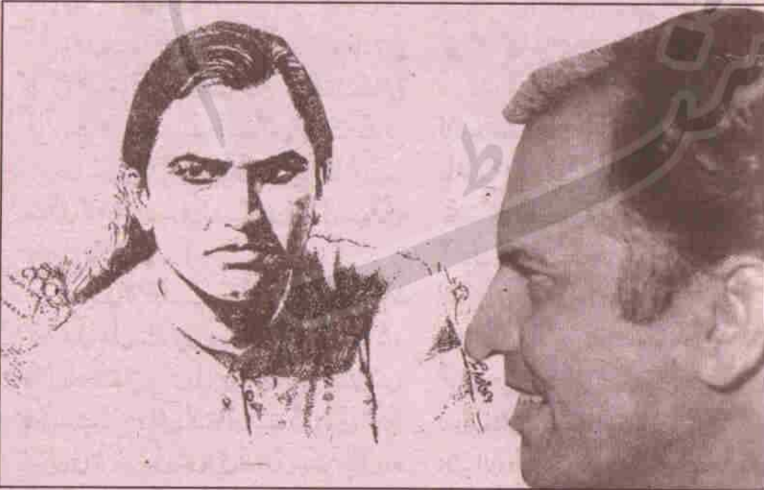
راجہ محمود

ان کہی یادیں

احمد نواز کا خیال

نظر کہے، وہ کہیں نہیں ہے
یہ دل پکارے، یہیں کہیں ہے

ٹیلی ویژن کے لیجنڈری فنکار سلیم ناصر کی زیست کا مختصر احوال نامہ



وہ نوجوان گریجویٹ تھا اور گریجویشن کے فوراً بعد ہی اسے باعزت روزگار مل گیا تھا۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی (D.H.A) میں پبلک ریلیشن آفیسر کی حیثیت سے وہ اپنے فرائض بہ احسن وخوبی انجام دے رہا تھا۔ اس کی جاب ہر لحاظ سے بہترین تھی۔ اس کی آمدنی بھی معقول تھی اور اسے عزت بھی خوب میسر تھی۔ بظاہر زندگی میں اس کے لیے سب کچھ ہی اطمینان بخش تھا۔ عزت بھی تھی۔ کسی حد تک خوش حالی بھی تھی اور ایک خاص طبقے میں شہرت بھی تھی مگران سب کے باوجود اس نوجوان کے من میں کچھ انوکھا کرنے کی تڑپ تھی کچھ مختلف کام کرنے کے جذبات اس میں انگڑیاں لیتے تھے اسی لیے بظاہر مطمئن نظر آنے والا وہ نوجوان اندر سے بے قرار رہتا تھا۔ ویسے مزاجاً وہ بذلہ سنج اور ہنس مکھ نوجوان تھا۔ چہرے پر ہمہ وقت ایک شرارت آمیز مسکراہٹ بکھری رہتی تھی۔ بولتا تو زبان سے جملوں کی صورت شگوفے پھوٹتے تھے۔ شگفتہ جملے بازی اس کی عادت تھی، تاہم اس کی شگفتگی کے رنگ میں کسی کی تحقیر یا تذلیل مقصود نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنی چلبلی باتوں سے احباب کی محفل کو گل وگلزار بنانا اس کا مطمع نظر ہوتا تھا مگراس کے اردگرد رہنے والے اس کی قربت کا دعویٰ کرنے والے نہیں جانتے تھے کہ دوسروں میں مسکراہٹیں اور قہقہے دینے والا خود کس بے چینی کا شکار ہے۔ ہر گزرتے دن اس کی بے چینی سوا ہوتی جارہی تھی۔

انگریزی کا مقولہ ہے۔ ”آپ اپنی سوچ بدل کر اپنی زندگی بدل سکتے ہیں اور زندگی میں وہ سب کچھ حاصل کرسکتے ہیں جس کی خواہش آپ کے من میں جاگتی ہے۔“ سو اس نوجوان نے بھی اپنی سوچ تبدیل کی تاکہ زندگی میں اپنی خواہش کے مطابق وہ کچھ حاصل کرے جس کے لیے اس کا من تڑپتا تھا۔

شگفتہ اور شرارتی جملوں پر اس کے احباب اکثر اسے مشورہ دیتے تھے کہ وہ شعبۂ اداکاری میں ضرور قسمت آزمائی کرے کیونکہ جملے بازی کے ساتھ ساتھ اس میں مختلف لوگوں کی نقل اتارنے کی بھی بھرپور صلاحیت تھی۔ اس کا پروفیشن کچھ اس نوعیت کا تھا کہ بھانت بھانت کے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا۔ ان ہی افراد میں کچھ ایسے عجیب کرداروں سے بھی اس کا سامنا ہوتا رہتا تھا جو اس کے اندر چھپے اداکار کو باہر لانے پر اکساتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے بہت جلد ادراک ہوگیا کہ اس میں کس قسم کا جوہر چھپا ہوا ہے، بس اپنے اندر کے گوہر کو پہچاننا تھا کہ اس نے سنجیدگی سے اس شعبے میں جانے کی تگ ودو شروع کردی۔ وہ 70ء کے عشرے کی دہائی کا اوائل زمانہ تھا۔ پاکستانی فلم انڈسٹری اپنے پورے شباب پر تھی۔ ان دنوں لاہور سے زیادہ کراچی میں فلمیں بنا کرتی تھیں۔ اس نوجوان کو بھی کسی طرح کوشش کر کے ایک فلم میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔

1976ء میں ریلیز ہونے والی ”زیب النساء“ نامی فلم میں اس کا کردار گو کہ مختصر مگر انتہائی دلچسپ تھا۔ فلم کے نمایاں اداکاروں میں وحید مراد، شمیم آراء اور عالیہ شامل تھے۔ اس نوجوان نے ان معروف فنکاروں کے روبرو اپنی پرفارمنس سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ اس فلم کے ہدایت کار فرید احمد تھے۔ فلمی پردے پر اس نوجوان کی یہ پہلی آمد تھی جو آخری بھی ثابت ہوئی کیونکہ بعد میں اس کی صلاحیتوں سے ٹی وی والوں نے خوب خوب فیض اٹھایا اور وہ ٹی وی پر ایسا معروف ہوا کہ پھر اسے فلم کی طرف دیکھنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ پی ٹی وی کا دروازہ اس کے لیے ایک بار کھلا تو پھر کبھی بند نہیں ہوا۔ ان دنوں ٹی وی کی نئی نئی آمد ہوئی تھی اور یہ میڈیم لوگوں میں تیزی سے مقبول ہورہا تھا۔ ٹی وی

اداکاروں کا بخار معاشرے میں وبا کی صورت پھیل رہا تھا۔ روز بروز ٹی وی کے ناظرین میں تیزی سے اضافہ ہورہا تھا۔ ٹی وی اداکاروں کی مقبولیت بھی اسی تیز رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ جلد ہی اس نوجوان کا نام بھی عوام میں جانا پہچانا جانے لگا اور یوں سلیم ناصر کے نام سے ایک زمانہ واقف ہوتا چلا گیا۔

18 نومبر 1944ء کو پشاور کے ضلع مردان



سلیم ناصر اپنی بیگم اور بچوں نوی، بینش اور مہوش کے ساتھ

میں پیدا ہونے والے سلیم ناصر کا تعلق ایک روشن خیال اور ممتاز خاندان سے تھا۔ اس پٹھان سید فیملی میں جب ننھا چشم وچراغ وارد ہوا تو اس کا نام سید شیر خان رکھا گیا۔ اب شیر خان کس طرح سلیم ناصر میں بدل گیا اس حوالے سے ان کے قریبی لوگ بھی نہیں جانتے، ممکن ہے نام تبدیل کرنے پر کچھ لوگ یہ سمجھیں کہ وہ اپنے پٹھان ہونے کی شناخت کو چھپانا چاہتے ہوں جبکہ ایسا بالکل نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی شناخت چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ وہ فخریہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ وہ ایک پٹھان ہیں اور پشتو ان کی مادری زبان ہے۔ شاید نام بدلنے کی وجہ یہ رہی ہو کہ اپنی نرم مزاج طبیعت کے ساتھ شیر خان جیسا بھاری بھرکم نام انہیں میل کھاتا محسوس نہ ہوتا ہو یا پھر بچپن میں ہی ان کی فیملی میں سے کسی نے ان کا نام بدل دیا ہو۔ بہر حال وجہ خواہ کوئی بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ جو عزت وشہرت انہیں ملی، شاید وہ سلیم ناصر کے نام میں ہی چھپی تھی۔

ان کا بچپن عام بچوں کی طرح گزرا، تاہم ان کی فیملی عام پٹھان خاندانوں سے الگ ایک معزز اور پڑھی لکھی فیملی تھی لہٰذا ان کی تربیت بھی عام پٹھان بچوں سے مختلف انداز میں ہوئی۔ بچپن ہی سے ان کی پڑھائی لکھائی پر خصوصی توجہ دی گئی جبکہ اس وقت اکثریت پٹھان گھرانوں میں تعلیم کا ایسا خاص رواج

نہیں تھا۔ گھر کی سخت تربیت اور فطری ذہانت کا ہی نتیجہ تھا کہ سلیم نے ابتدائی تعلیمی مدارج کامیابی سے طے کر لیے اور پھر گریجویشن کے فوری بعد انہیں ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں قابلِ عزت جاب مل گئی۔ گھر والوں کے مطابق سلیم میں پیدائشی طور پر حیرت انگیز صلاحیتیں تھیں۔ ان ہی خوبیوں کے طفیل وہ حیرت انگیز طور پر ہر قسم کا کام کر لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پبلک ریلیشن آفیسر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی ذمہ داریاں بہت ہی کمال طریقے سے نبھائیں۔ ان کے کام میں لوگوں سے میل جول اور تعلقات بڑھانا شامل تھا جو سلیم جیسے ہنس مکھ انسان کے لیے قطعی مشکل ثابت نہیں ہوا جو ایک بار ان سے مل لیتا پھر ایسا گرویدہ ہوتا کہ ان کے ساتھ ایک خاص تعلق میں بندھ جاتا تھا۔

ٹی وی پر سلیم ناصر کے ابتدائی ڈراموں میں سے ایک ڈرامہ ''یا نصیب کلینک'' تھا۔ یہ مزاحیہ ڈرامہ 75-1974ء میں آن ایئر گیا اور اسے ناظرین میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس ڈرامے میں سلیم ناصر نے ایک مریض کا کردار ادا کیا تھا اور دیکھنے والوں کو خوب ہنسایا تھا' تاہم ان کے اندر کا اصل جوہر پی ٹی وی کی ڈرامہ سیریل ''آنگن ٹیڑھا'' میں نظر آیا۔ اس ڈرامے میں وہ اپنے فن کے عروج پر نظر آئے۔ لوگ آج بھی ان کی پرفارمنس کو یاد کرتے ہیں جو انہوں نے آنگن ٹیڑھا میں دی۔ اس مزاحیہ سیریل میں سلیم ناصر نے اکبر نامی ایک نوکر کا کردار کیا تھا۔ کہانی کے مطابق اکبر ایک ریٹائرڈ سول سروس آفیسر محبوب احمد (شکیل) کا گھریلو ملازم ہوتا ہے۔ ماضی میں اکبر ڈانسر بھی رہ چکا ہے اسی لیے اس کے انداز و اطوار میں کچھ کچھ زنانہ پن تھا۔ اکبر ایسا بے تکلف ملازم ہے جو مختلف معاملات پر اپنے صاحب کو مشورے بھی دیتا ہے۔

پی ٹی وی کے اس سپرہٹ ڈرامے کے ہدایت کار قیصر فاروق تھے جبکہ یہ شاہکار انور مقصود کے قلم سے تخلیق ہوا تھا۔ اس کی دیگر کاسٹ میں بشریٰ انصاری، شکیل اور ارشد محمود شامل تھے گو کہ اکبر کا کردار کچھ اس طرح پوٹرے کیا گیا تھا کہ وہ مخنث کے قریب تر ہو گیا تھا مگر سلیم ناصر نے اس کردار کو اتنے باوقار انداز میں ادا کیا کہ اس میں کہیں بھی پھکو پن یا لچر پن شامل نہیں ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اکبر کے کردار کو ہر قسم کی آلودگی سے بچا کر بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ ڈرامہ سیریل پی ٹی وی کے کلاسک ڈرامہ سیریلیز میں شامل کی جاسکتی ہے۔

پی ٹی وی کے ہی ایک اور ڈرامے ''دستک'' میں وہ ایک بااصول وکیل کے طور پر نظر آئے اور اس مختلف کردار میں بھی خود کو منوایا۔ انہیں اگر چھوٹی اسکرین کا لیجنڈ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ انہیں بہت جلد ہی اتنی شہرت مل گئی جو بہت کم فنکاروں کا نصیب ہوتی ہے۔ وہ غیر معمولی فنکار تھے۔ ان میں جملوں کی گہرائی سمجھنے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ ان کی یہ خوبی مکالموں کی ادائیگی میں بہت کام آتی تھی' خصوصاً وہ اشعار اور ثقیل الفاظ پوری سمجھ بوجھ کے ساتھ ادا کرتے تھے' تاہم ان کی سب سے نمایاں خوبی ان کی آواز تھی ایسی آواز بہت کم فنکاروں کو ملتی ہے ان کی آواز میں خاص قسم کا لوچ بھی تھا اور گرج بھی تھی جو مختلف النوع کرداروں کے لیے آئیڈیل ثابت ہوتی تھی۔

سلیم ناصر کو کبھی یہ خواہش نہیں رہی کہ ان کا مقابلہ ہم عصر فنکاروں سے کیا جائے۔ انہیں اپنی خداداد صلاحیتوں پر مکمل یقین تھا۔ سلیم ناصر نے ڈراموں کے علاوہ ایک شو بھی ہوسٹ کیا جو کامیاب تجربہ ثابت ہوا۔ انہوں نے عید شو کی میزبانی کی تھی

[illegible] لباس میں ملبوس انتہائی باوقار انداز [illegible] اداکاروں کے ساتھ اپنے احساسات شیئر [illegible] انہوں نے اپنے کیریئر میں ہر قسم کے [illegible] بھی کردار کی چھاپ خود پر نہیں لگنے [illegible] معنوں میں ورسٹائل فنکاروں کی [illegible] شامل کیا جاسکتا ہے۔ انہیں مکالموں کی [illegible] حاصل تھا۔ وہ مکالموں کو مکمل جذبات و



احساسات کے ساتھ بولتے تھے اور کردار میں [illegible] کا رنگ بھر دیتے تھے۔ ''ان کہی'' میں وہ اپنی [illegible] کے باعث کمال درجے پر نظر آئے۔ ان کہی کی کہانی ایسے عام سے افراد کے گرد گھومتی ہے جو زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ہنستے مسکراتے اپنی منزل کی جانب بڑھنے میں لگے ہوتے ہیں۔ اس ڈرامے میں ادبی اور فلسفیانہ جملوں کی بھرمار تھی یوں اس پلے کو ادبی لحاظ سے تحقیقی [illegible] ڈرامہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ حسینہ معین اس کی رائٹر تھیں۔ ''ان کہی'' میں سلیم ناصر نے ماموں کا کردار کیا تھا اور اپنی کمال کی پرفارمنس سے اس میں زندگی ڈال دی تھی۔ ڈرامے کی کاسٹ میں شہناز شیخ اور چائلڈ اسٹار جبران نمایاں تھے۔

''کیپٹن سرور شہید' نشان حیدر'' بھی ان کا کامیاب لانگ پلے ہے۔ قومی ہیرو کے اس زندہ کردار کو انہوں نے اپنی ذہانت سے اس طرح کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے اور جو لوگ انہیں محض ایک مزاحیہ اداکار سمجھتے تھے' انہیں اپنے خیال میں ترمیم کرنی پڑی۔ اس پلے سے انہوں نے ثابت کر دکھایا کہ وہ عام سی صلاحیتوں کے فنکار نہیں بلکہ ان میں ایسی نادر روزگار خوبیاں ہیں جو عام فنکاروں سے انہیں نمایاں کرتی تھیں۔ 1983ء کے سپرہٹ اسٹیج شو ''سلور جوبلی'' میں بھی انہوں نے اپنے فن سے خوب محظوظ کیا تھا۔ یہ معروف شو انور مقصود کی میزبانی میں ہوتا تھا۔ بقول سلیم ناصر' انہوں نے اس شو کے لیے خاصی محنت کی تھی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ نئے انداز میں وہ لوگوں کو نظر آئیں۔

سلیم ناصر کا پورا کیریئر کامیابیوں سے عبارت ہے۔ ان کی راہ میں ایک کے بعد ایک کامیابی آتی چلی گئی۔ وہ اپنے ہر کردار میں ڈوب کر اداکاری کرتے تھے اور کام کے معاملے میں اتنے ذمہ دار تھے اگر کبھی سیٹ پر لیٹ ہو جاتے تو خود ہی کفارہ ادا کرتے تھے۔

...میں ساتھیوں کو کھانا کھلا دیتے تھے۔

سلیم ناصر کے کیریئر کا ذکر ہو اور ''آخری چٹان'' کا تذکرہ نہ ہو تو بات نامکمل اور تشنہ رہ جائے گی۔ اس تاریخی ڈرامہ سیریل میں انہوں نے سلطان جلال الدین خوارزم کا مشکل ترین کردار اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس طرح ادا کیا کہ ناظرین و ناقدین حیران رہ گئے۔ نقادوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ ''آخری چٹان'' جیسی میگا ہٹ سیریل پر ڈائریکٹر قاسم جلالی کو داد دی جائے یا سلیم ناصر کے فن کو سراہا جائے؟ ''آخری چٹان'' کی کہانی کچھ یوں تھی کہ سلطان جلال الدین خوارزمی، چنگیز خان کے خلاف مسلمانوں کو متحد کرنے کا شدید خواہش مند ہوتا ہے تاکہ تاتاریوں پر فتح حاصل ہو۔ اس وقت اسلامی دنیا کے لیے جلال الدین ہی واحد امید تھا۔ جلال الدین کو اپنی بہادر سپاہ پر مکمل بھروسا تھا۔ جلال الدین کی فوج نے تو اپنی بہادری کا بے مثال مظاہرہ کیا مگر اسلامی دنیا کا کوئی حکمران اس کی مدد کو نہیں آیا۔ یوں اسلامی تاریخ کا یہ شیر دل بہادر حکمران تنہا رہ گیا۔ اس ڈرامے کے مکالمے اور شاعری اپنی مثال آپ تھے' خصوصاً آخری قسط میں سلیم ناصر نے ثقیل الفاظ پر مشتمل شعر جس طرح آسانی اور روانی سے اپنے مخصوص انداز میں ادا کیے ہیں' وہ حیران کن ہے۔ ایک بار اپنے فن پر گفتگو کرتے ہوئے سلیم ناصر نے کہا تھا کہ وہ اپنے ہر کردار سے انصاف کرتے ہیں اور یہ بات پوری طرح درست ہے۔ آپ ان کے پورے کیریئر میں کوئی ایک ڈرامہ اٹھا کر دیکھ لیں' کوئی ایک کردار بھی ایسا نہیں ملے گا جسے دیکھ کر کہا جائے کہ سلیم ناصر نے اس کردار کا حق ادا نہیں کیا۔

اداکار سلیم ناصر سے تو ایک جہاں واقف ہے مگر یہ بات کہ ان کا تعلق قلم و قرطاس سے بھی رہا ہے۔ عام لوگ کم ہی جانتے ہیں سوائے شوبز سے تعلق رکھنے والوں کے۔ سلیم ناصر کو علم و ادب سے گہرا شغف تھا۔ قلم سے محبت کی بناء پر انہوں نے کئی ایک رسائل و جرائد بھی نکالے۔ ان کا مشہور و معروف میگزین ''ٹی وی ٹیمپو'' تھا۔ 80ء کی دہائی میں کراچی سے نکلنے والے اس میگزین میں ٹی وی فنکاروں اور ٹی وی کے پروگرامز کے حوالے سے مضامین انٹرویوز اور خبریں وغیرہ ہوتی تھیں۔ یہ اپنے دور کا بہت ہی مقبول میگزین تھا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ٹی وی کا ہر فنکار اس میں چھپنے کا خواہش مند ہوتا تھا۔ سلیم ناصر چونکہ خود ٹی وی سے وابستہ تھے لہٰذا ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کے میگزین میں کبھی کوئی ایسی بات یا خبر جانے نہ پائے جس سے کسی فنکار کی ہجو یا تحقیر ہو۔ انہوں نے ہمیشہ زرد صحافت کی حوصلہ شکنی کی۔ وہ فنکاروں کو مان اور عزت دیتے تھے۔ اس میگزین کے علاوہ انہوں نے ایک اور رسالہ ''جلوہ'' بھی نکالا۔ ان کے ادارے سے ''چائلڈ اسٹار'' نامی بچوں کا رسالہ بھی نکلتا تھا چونکہ لکھنے لکھانے کا انہیں شغف تھا لہٰذا سہام مرزا صاحب سے ان کے خصوصی مراسم تھے۔ وہ اکثر دوشیزہ، سچی کہانیاں کے دفتر آتے تھے اور جس دن آتے تھے، آفس قہقہوں سے گونجتا رہتا تھا۔ سلیم ناصر جہاں جاتے، جہاں بیٹھتے' بس جملے اچھالتے رہتے اور مسکراہٹیں بکھیرتے رہتے تھے۔ شاید قدرت نے انہیں اس دکھوں سے اٹی دنیا میں مسکراہٹیں لٹانے کے لیے ہی بھیجا تھا۔

سلیم ناصر کی زندگی سے ایک عجیب و غریب واقعہ بھی جڑا ہے۔ گو کہ یہ واقعہ کہانی کی صورت میں تفصیلاً اگست 2011ء کے ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں شائع ہو چکا ہے مگر چونکہ بات سلیم ناصر کی چل رہی ہے تو ضمناً اس واقعے کا ذکر بھی لازمی ہو

جاتا ہے۔ یہ واقعہ بڑا پراسرار نوعیت کا ہے اور سلیم ناصر کے ساتھ اس وقت پیش آیا تھا جب ان کے کیریئر کا ابتدائی زمانہ تھا۔ انہیں ایک ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے پنڈی جانا تھا۔ اس سلسلے میں ٹی وی والوں کی طرف سے انہیں جہاز کا ریٹرن ٹکٹ دیا گیا تھا۔ پنڈی میں شوٹنگ کی وجہ سے ان دنوں سلیم ناصر کا مستقل قیام لاہور میں تھا۔ سلیم ناصر بزرگانِ دین سے خاص عقیدت رکھتے تھے اسی لیے وہ صوفیوں کے مزار پر بھی جاتے رہتے تھے۔ اسی حوالے سے داتا صاحب سے بھی ان کی خاص عقیدت تھی۔ اکثر جمعرات کو وہ داتا صاحب جایا



ڈرامہ ''کیپٹن سرور شہید نشانِ حیدر'' کا ایک منظر

کرتے تھے' تاہم خود ساختہ فقیروں اور ملنگوں سے اجتناب کرتے تھے۔ ایک جمعرات وہ داتا صاحب پر حاضری دے کر مزار سے باہر آ رہے تھے کہ ایک لمبے تڑنگے فقیر نے ان کا راستہ روک لیا۔ اُس فقیر کے سر اور بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے' آنکھیں سرخ تھیں' اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی جس سے سلیم ناصر کو گھن آ رہی تھی۔ انہیں اس بات کا ادراک تھا کہ اس قسم کے لوگ عموماً نشہ بھی کرتے ہیں اسی لیے انہوں نے اس فقیر کی آنکھوں کی سرخی کو نشے کی زیادتی سمجھا۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ اس فقیر سے بچ کر نکل جائیں مگر بھیڑ اچھی خاصی تھی اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

اس فقیر نے آستین سے رال پونچھتے ہوئے کہا۔

''تیرے سر پر موت ناچ رہی ہے۔''

سلیم ناصر نے جان چھڑانے کے لیے جیب سے ایک روپیہ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو یہ رکھ لو اور مجھے جانے دو۔'' مگر اس فقیر نے ایک روپے کا نوٹ لے کر پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیا۔

''اتنی بڑی خبر دینے کی یہی قیمت ہے، بس ایک روپیہ؟'' اب اس فقیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''بابا، مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو؟ جانے دو نا مجھے؟'' سلیم ناصر نے بے چارگی سے کہا۔

''کیوں مرنا چاہتا ہے؟'' اس کے لہجے میں سرزنش تھی۔ ''شاید تجھے میری بات پر یقین نہیں آیا

کہ تیرے سر پر موت ناچ رہی ہے۔"
"تمہیں پیسے چاہئیں تو لے لو مگر میرے سر پر موت کو نچانے کی ضرورت نہیں۔"
"پگلا ہے کیا؟ موت کو میں نچاؤں گا‘ موت تو سب کو نچاتی ہے اور تجھے بھی نچانے والی ہے۔ دیکھ نکل کر لاہور سے۔" اس بات پر سلیم ناصر چونکے کیونکہ انہیں تین دن بعد پنڈی جانا تھا‘ وہ سوچنے لگے کہ اس فقیر کو کیسے علم ہوا کہ ان کا ارادہ لاہور سے باہر جانے کا ہے؟ خیر‘ کوئی اٹکل بھی ہو سکتی ہے۔
"یقین نہیں آرہا؟" یہ کہہ کر وہ فقیر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "جب تیرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہوں گے تو سمجھے گا مگر اس وقت کیا سمجھے گا کہ خاک میں مل چکا ہوگا۔"



پھر اس فقیر نے کالا مرغا کھانے کی فرمائش کی اور سلیم ناصر نے اس سے جان چھڑانے کے لیے سوا نو روپے نکال کر دے دیئے کیونکہ اس فقیر نے ان کی جان کا صدقہ سوا نو روپے ہی مانگا تھا پھر وہ فقیر چشم زدن میں بھیڑ میں غائب ہو گیا اور سلیم ناصر اس سے جان چھوٹنے پر گھر آگئے پھر تین دن بعد وہ پنڈی چلے گئے اور ڈرامہ "سفید سایہ" کی ریکارڈنگ میں حصہ لیا اور پھر لاہور واپسی کے لیے نائٹ کوچ فوکر سے سیٹ ریزرو کرا لی اور ٹکٹ لے لیا مگر عین وقت پر قمر علی عباسی صاحب کے اصرار پر سلیم ناصر نے لاہور جانے کا پروگرام کینسل کر دیا اور قمر صاحب کے ساتھ مری چلے گئے البتہ ٹکٹ کینسل نہیں کرا سکے۔ اگلے دن قمر علی عباسی نے انہیں جھنجوڑ کر جگایا اور تازہ اخبار ان کے سامنے کر دیا۔ اخبار کے پہلے صفحے پر نظر پڑتے ہی جیسے انہیں سکتہ ہو گیا کیونکہ جس جہاز میں انہیں لاہور جانا تھا‘ وہ کریش ہو گیا تھا اور اخبار میں ان کے انتقال کی خبر چھپ گئی تھی۔ وہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ ایک مسافر بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ مسافروں کی فہرست میں چونکہ ان کا نام بھی تھا اس لیے انہیں مردہ تصور کر لیا گیا تھا۔ خبر پڑھ کر اُن کے دماغ میں اس فقیر کا فقرہ گونج رہا تھا۔ "تیرے سر پر موت ناچ رہی ہے۔" یوں اُس فقیر کے صدقے سے انہیں دوسری زندگی ملی تھی جس کا ذکر وہ اکثر کرتے تھے۔

1976ء سے 1989ء تک کا عرصہ سلیم ناصر نے بطور اداکار بہت بھرپور طریقے سے گزارا ہے۔ سلیم ناصر کی ڈائیلاگ ڈلیوری‘ کردار نگاری میں جذباتیت کے حوالے سے ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ مشکل سے مشکل کردار بہت آسانی سے کر جاتے تھے۔ 1989ء میں شوکت صدیقی کے پلے "جانگلوس" میں انہوں نے ایک سنگدل بھائی کا کردار بھی بہت خوب صورتی سے ادا کیا تھا‘ تاہم یہ اُن کی زندگی کا آخری ڈرامہ ثابت ہوا۔

19 اکتوبر 1989ء کی دوپہر اچانک ان پر شدید نوعیت کا ہارٹ اٹیک ہوا۔ انہیں فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا مگر مسیحا تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ ہر قسم کی مسیحائی سے بے نیاز ہو گئے اور آناً فاناً اس فانی دنیا کو خیرباد کہہ گئے۔

"ہمارے لیے بس اتنی دعا کرو کہ خدائے بزرگ و برتر ہمیں عزت کی موت سے محروم نہ کرے۔" یہ مکالمہ سلیم ناصر نے "آخری چٹان" میں بولا تھا جو حقیقی زندگی میں سچ ثابت ہوا اور انہیں خدا نے واقعی عزت کی موت نصیب کی۔ انہوں نے ۴۵ برس کی عمر پائی اور پسماندگان میں بیوی، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑا۔

سلیم ناصر مرحوم کی صاحب زادی

بینش سلیم کے تاثرات

"میرے بابا کی شخصیت میری یادوں کے سمندر میں اس کی اٹھتی، گرتی، پھیلتی موجوں میں کبھی روشنی کا مینار بن جاتی ہے تو کبھی ساحلوں تک پہنچنے والی بادبانی کشتی۔ ۱۱۹ کتوبر ۱۹۸۹ء کو یعنی ۲۲ سال پہلے نظروں سے اوجھل ہو جانے والا انسان میری یادوں میں آج بھی اسی طرح زندہ ہے۔ وہ شیر کی طرح بہادر تھے مگر مزاج میں دھیما پن تھا۔ ہر آدمی کی عزت نفس کا خیال رکھتے تھے۔ کبھی انہوں نے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ جب میں کسی کو بابا کی نقل کرتے دیکھتی ہوں تو مجھے کبھی برا نہیں لگتا۔ ان کا انداز اپنانا ان کے فن کی کامیابی ہے‘ ان کے فن کو زندہ رکھنے کا جواز ہے۔ سلیم ناصر میرے تو بابا تھے اس لیے میں ان سے پیار کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی مگر یہ جان کر مجھے انجانی خوشی ملتی ہے جب میں ہمارے لوگوں کو بھی بابا سے پیار کرتے دیکھتی ہوں۔ وہ چھوٹی اسکرین پر آئے یا بڑی اسکرین پر‘ ان کے کام میں زندگی تھی اسی لیے ان کی یادیں آج بھی زندہ ہیں اور سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ بہت ایماندار تھے۔ بابا نے اپنے کردار اس خوبی سے نبھائے کہ امر ہو گئے اور ہر دیکھنے والوں کے دل میں گھر کر گئے۔ یہ ان کے کام کی مہارت تھی یا اپنے کام کی سچی لگن یا ایک مثال چھوڑ جانے کی جستجو۔

بابا کے ساتھ میری بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ہم اپنے بابا کے ساتھ پارک جاتے تھے اور ہم وہاں ’چور سپاہی‘ کا کھیل کھیلتے تھے۔ وہ ہمارے پیچھے بھاگتے تھے اور ہمیں پکڑ ہی نہیں پاتے تھے جبکہ ہم انہیں پکڑ لیتے تھے مگر اب سمجھ میں آیا کہ وہ دل رکھنے کا ہنر جانتے تھے‘ وہ تو ہم سے بہت تیز دوڑتے تھے۔ وہ بہت شفیق باپ تھے‘ محبت کرنے والے شوہر تھے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ان کی یاد میں



آنکھیں نہ بھیگتی ہوں۔ کاش اللہ نے انہیں لمبی عمر دی ہوتی۔

بابا......! آپ کی آواز‘ آپ کی شکل کے تاثرات مجھے اُسی طرح یاد ہیں جیسے ۱۱۹ کتوبر ۱۹۸۹ء کل ہی کی بات ہے جب آپ نے مسکرا کر آخری بار مجھے پیار سے دیکھا تھا۔ جب بھی آپ کے کسی دوست سے ملتی ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے‘ اب بھی آپ کی شخصیت کے وہ تمام پہلو لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ اب دل کو یہ تسلی ہے کہ میری وہ ۲۲ سال لمبی تلاش مکمل ہوئی۔

آپ بہت اچھے باپ تھے۔ آپ کے لیے ڈھیر سارا پیار۔ آپ کی بیٹی!" ☆☆

میجر (ر) امتیاز حسین

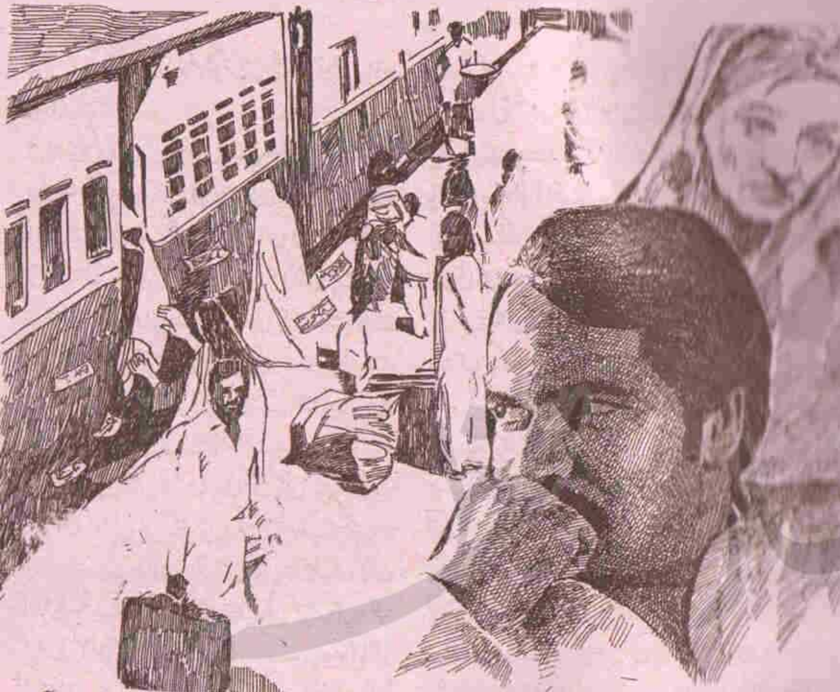
باقی ہے ابھی رنگ

شاداب صدیقی کا خیال

کوئی مرہم اثر کرتا نہیں ہے رسنے بہنے پر
علاج زخمِ دل ممکن نہیں۔ غمزادہ رہنے دے

قیام پاکستان سے جڑی ہجرت کی ایک ناقابلِ فراموش الم ناک کہانی

جب سے مرزا صاحب (مرحبا والے' صاحباں والے نہیں) امریکہ سے آئے ہیں۔ ان کی شوگر قابو میں نہیں آ رہی۔ اچھے خاصے تعلقات تھے اس سے ان کے۔ پندرہ' بیس سال سے بڑی ٹھیک ٹھاک نبھ رہی تھی۔ نہ وہ مرزا صاحب کو تنگ کرتی تھی نہ مرزا صاحب اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ سمجھوتہ ایکسپریس تھی جو چل رہی تھی۔ بس امریکہ کیا گئے کہ یہ محترمہ جیسے ناراض ہو گئیں۔ لگتا ہے' ان کا بھی القاعدہ سے کوئی تعلق ہے۔ جب سے واپس آئے ہیں' چراغ پا چلی آ رہی ہیں۔ دوا دارو منت سماجت کر کے اسے نیچے لاتے ہیں لیکن ان کی ذرا سی حرکت پر تیغ پا ہو جاتی ہے۔ ویسے مرزا صاحب خود کون سے کم ہیں' ان کو بھی اس کی خاموشی یا آرام اچھا نہیں لگتا۔ اس کی ایک ایک چھیڑ کا انہیں پتہ ہے' جان بوجھ کر وہی چیز کھائیں گے جن سے چڑتی ہے۔ دو دن ان کا شوگر لیول ٹھیک رہے تو ان کا مزہ خراب ہو جاتا ہے اس لیے ذرا سا آم' خربوزہ یا مٹھائی وغیرہ چکھ لیں گے۔ کوئی کھانے نہ دے تو پڑوس کی مسجد کے پھڈوں میں ہاتھ ڈال دیں گے۔ وہ بھی نہ ملے تو کوئی گڑا مردہ' کوئی پرانا مقدمہ ہی اکھاڑ لائیں گے تا کہ کم از کم ہفتہ دو ہفتہ تو شوگر کو اس میں الجھائے رکھیں' بس شوگر سے انتقام کا یہ طریقہ ڈھونڈ لیا ہے کہ نہ خود آرام سے بیٹھیں گے نہ اسے بیٹھنے دیں گے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے کسی کی سنی بھی نہیں' مرد تا سن بھی لیں تو مانتی نہیں۔ جو مرضی ہے' مشورہ' ہدایت دیتے رہیں' کرنی انہوں نے اپنی مرضی ہی ہے۔ شاباش ہے صدر بش اور کولن پاول کو جنہوں نے پورے پانچ مہینے انہیں سنبھالے رکھا۔ ہم غریبوں سے تو یہ نہیں سنبھالے جاتے۔ ہم تو جتنی مرضی ہے' انہیں ہدایات دے لیں' جتنی مرضی



[illegible] مشوروں سے نوازیں' جیسا مرضی ہے' نہیں کہیا ان کے حوالے کر دیں' کرنی انہوں نے اپنی مرضی [illegible]۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ میں ان کی شوگر [illegible] تھی [illegible] کیوں اور کیسے ٹھیک رہتی تھی؟ ان کا اپنا خیال ہے کہ وہاں دوائیاں اچھی اور خالص ہوتی ہیں۔ اب ہم یہ کیسے مان لیں کہ ہمارے یہاں دوائیاں کم خالص یا دو نمبر ہوتی ہیں۔ ہم تو ان کو یہی کہتے ہیں اور ہمارے خیال میں یہ ہے بھی حقیقت کہ وہاں ان کی شوگر کے ٹھیک رہنے کی وجہ دوائیاں نہیں؛ وہاں کا ماحول تھا۔ وہاں نہ ان کے مسجدوں کے پھڈے تھے' نہ کورٹ کچہری اور فلورمل کے جھنجھٹ۔ وہاں آرام تھا یا سیر و تفریح۔ جب شوگر سے چھیڑ چھاڑ ہی نہ ہوگی تو وہ تنگ کیوں کرے گی؟ وہاں شوگر ٹھیک رہنے کی اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہاں میٹھا یا مٹھائی شاید خالص نہیں ہوتی۔ اب یہ بھی کوئی مٹھائی ہوئی کہ میٹھے کا پتہ ہی نہ چلے۔ مٹھائی ہو تو اپنے جیسی جس میں شیرہ ہو تو ٹپکتا نظر بھی آئے' گھی ہو تو نالیاں بہیں' ویسے شوگر سے ان کے تعلقات خاندانی ہیں' ان کے والد صاحب کو بھی شوگر تھی' اس حساب سے تو ان کو شوگر مل لگانی چاہیے تھی۔ کچھ تو خاندانی تعلقات کا خیال کیا ہوتا۔ انہوں نے لگائی بھی تو فلورمل' شوگر برا نہ مانتی تو اور کیا کرتی۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ امریکہ میں بھی ان کی شوگر ٹھیک رہی ہوگی۔ وہاں کیا خاک شوگر ٹھیک رہے گی جہاں بندے کو زندگی کا مزہ ہی نہ آئے۔ وہاں مزہ آئے گا بھی کیا جہاں بندہ نہ کچھ سن سکے نہ سنا سکے' نہ لڑ سکے نہ لڑا سکے' نہ چھیڑنے والا نہ گالیاں اور ڈانٹیں کھانے والا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ وہاں اگر ان کی شوگر ٹھیک بھی رہی ہوگی تو چلتے چلتے امریکنوں نے ان سے سارا بدلہ لے لیا۔ شوگر ٹیسٹ کرنے کی ایسی مشین ان کے حوالے کر دی جس نے آج تک کبھی خیر کی خبر ہی نہیں دی۔ یقین نہ آئے تو کبھی خود پوچھ

لیجیے گا'اس نے کبھی ان کو کم شوگر نہیں بتائی' ہمیشہ زیادہ ہی بتائی ہے۔

اپنے گروپ کی محفلوں میں ان کی شوگر اکثر زیر بحث رہتی ہے۔ ان کی موجودگی میں بھی اور ان کی غیر موجودگی میں بھی۔ ویسے ان کی موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی خاص فرق بھی نہیں پڑتا اس لیے کہ ان کے جوابات کی بھی اتنی ہی وقعت ہوتی ہے جتنی ہمارے مشوروں کی۔ نہ تو وہ ہمارے مشورے سنتے ہیں نہ ہم ان کے جواب۔ اپنا گروپ بھی کیا گروپ ہے' سارے ہی ساٹھ کے اردگرد کے ہیں لیکن بوڑھا کوئی بھی نہیں ہے۔ کچھ تو ساٹھ بھی کراس کر گئے ہیں لیکن سٹھیائے نہیں۔ پچپن سے نیچے والوں کو تو اس میں داخلہ ہی نہیں ملتا۔ ایک نور بلوچ کو پتہ نہیں کیسے مل گیا۔ بس وہی کم عمر یا کم سن ہیں' وہ بھی چھ سات فٹ کے' غالباً عمر کی کمی قد سے پوری کی گئی ہے۔ سب اخلاق میں' کردار میں ایک سے بڑھ کر ایک۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے اور چاہنے والے۔ دکھ درد' خوشی اور غم کے شریک' اپنی اپنی عمر کے مطابق سب ہی نے کچھ نہ کچھ پالا ہوا ہے۔ کوئی دل والا ہے تو کوئی جگر والا' کسی کو شوگر ہے تو کسی کو بلڈ پریشر' بس ہر ایک اپنا اپنا حصہ لے کر چل رہا ہے۔ غالباً زیادہ شوگر ملوں کی وجہ سے چونکہ ملک میں شوگر عام ہے اس لیے ہمارے گروپ میں بھی یہ دوسری بیماریوں سے زیادہ ہے۔ ان میں سے بھی سب سے سنگین لیکن رنگین شوگر چونکہ مرزا صاحب کے حصے میں آئی ہے اس لیے سب کو ان کی شوگر کی فکر رہتی ہے۔ سب ایک دوسرے کی عادات' اطوار' طبیعت اور مزاج کی اونچ نیچ کو سمجھتے ہیں مثلاً ہم میں سے ہر ایک مرزا صاحب کو دیکھتے ہی بتا سکتا ہے کہ اس وقت ان کا شوگر لیول کہاں ہے یا کتنی ہے؟ کسی سے لڑ کر آئے ہیں یا پروگرام ہے۔ شوگر ٹیسٹ کرنے کی مشین کا تو انہوں نے تکلف ہی کیا ہے۔ یہ تو ہم میں سے کوئی بھی ان کو بتا سکتا ہے۔ ہمارے پاس وہ عموماً ڈائریکٹ نہیں آتے' کہیں بھڑاس نکال کر ہلکے ہو کر آتے ہیں۔ بھرے ہوئے ہوں تو ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ یہاں ہمارے پاس بھڑاس نکال نہیں سکتے کیونکہ پتہ ہے کہ سب گت بنا دیں گے۔

سب مرزا صاحب کی طبیعت کو بھی سمجھتے ہیں اور ان کے مزاج کی تلخی کی وجہ کو بھی۔ سب کو پتہ ہے کہ جب بھی وہ کسی سرکاری ادارے سے ہو کر آتے ہیں' ان کا موڈ سخت خراب ہوتا ہے۔ ان اداروں میں بدعنوانی اور نااہلی دیکھ کر انہیں بہت دکھ ہوتا ہے۔ دکھ تو خیر' سب کو ہی ہوتا ہے لیکن انہیں دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ ان کی حساس طبیعت اور پاکستان سے ان کی محبت ہے۔ کسی چیز کی خاطر جتنا وقت' محنت اور مال خرچ کیا جائے' اس سے اتنی ہی زیادہ محبت ہوتی ہے۔ قربانی محبت کا معیار' پیمانہ یا میزان ہے۔ اس کسوٹی کے ذریعے کسی سے کسی کی محبت کو پرکھا جا سکتا ہے۔ جس نے کسی کے لیے جتنی قربانی دی ہوگی' وہ اسے اتنی ہی عزیز ہوگی۔ اس قدر اور اس حد تک عزیز کہ اس کا نقصان تو دور کی بات ہے' اس کے متعلق کوئی بری بات بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا صاحب کسی قومی ادارے کو بگڑتا یا بگڑے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ ان میں ذرا سی بھی ان کو خامی نظر آ جائے تو بپھر جاتے ہیں اور پھر جو بھی آگے چڑھ جائے' اس پر برس پڑتے ہیں۔ بعض اوقات ایک کا غصہ دوسرے پر بھی نکل جاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ان کے پارے کے ساتھ ساتھ ان کی شوگر بھی چڑھ جاتی ہے اور ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس معاملے میں اتنے حساس کیوں ہیں؟ اس کو وہ ہی سمجھ سکتا ہے جو ان کا خاندانی اور تاریخی پس منظر جانتا ہو۔

مرزا صاحب کے آباء کا تعلق مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر سے تھا۔ وہ لدھیانہ کے قریب ایک قصبہ نور محل میں رہتے تھے۔ جالندھر اور لدھیانہ دونوں جگہ ان کی جائیداد تھی۔ ان کے داداد ماہر مستری اور لوہار تھے جو غالباً 1870ء کے اردگرد بلوچستان میں آئے۔ ان دنوں بلوچستان میں ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی۔ اس دور کی ریلوے کی تعمیرات میں سے کافی ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے کسی سرنگ پر تو ان کا نام بھی لکھا ہوا ہے چونکہ ان کے دادا ریلوے کے لیے کام کر رہے تھے اس لیے ان کے چچوں کو ریلوے میں ملازمت مل گئی۔ ان کے والد نے بھی سبی میں اسلحے کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس طرح یہ خاندان بلوچستان میں مقیم ہو گیا۔ 1944ء میں ان کے والد کو برطانیہ جانے کا موقع ملا اور وہ برطانیہ چلے گئے لیکن ان کے بھائی بلوچستان میں ہی رہے۔ 1946ء میں ان کے دادا کی طبیعت خراب ہوئی تو انہوں نے مرزا صاحب اور ان کی والدہ کو نور محل بلا لیا جہاں یہ لوگ آزادی تک رہے۔ مرزا صاحب کی اس وقت عمر تو ایسی زیادہ نہیں تھی لیکن غالباً حالات کی نوعیت کی وجہ سے سب یادیں ان کے ذہن پر نقش ہے جسے اتنا لمبا عرصہ بھی نہیں مٹا سکا۔ ان کا "محلہ کردگاراں" قصبے کے مرکز میں تھا۔ اردگرد سکھ اور ہندو محلے تھے۔ ان کے محلے کی بھی زیادہ تر آبادی سکھ اور ہندو ہی تھی۔ مسلمانوں کے صرف پندرہ' بیس ہی گھر تھے جو تقریباً محلے کے مرکز میں ایک گلی میں رہتے تھے۔ ہندو' سکھ اور مسلمان سب وہاں بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ ان کے دادے کی حیثیت وہاں محلے کے بزرگ اور معتبر کی تھی۔ ہندو' سکھ اور مسلمان سب ہی ان کی عزت کرتے اور حکم مانتے تھے۔ سب اپنے جھگڑوں کے فیصلے بھی ان ہی سے آ کر کرایا کرتے تھے۔

1947ء کے اوائل سے ہی ملک کی تقسیم اور اکا دکا ہندو مسلم فسادات کی خبریں ملنا شروع ہو گئی تھیں لیکن ان کا علاقہ پرامن رہا۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ یہ علاقہ پاکستان میں جا رہا ہے اس لیے یہ لوگ مطمئن تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اردگرد کی تشویشناک خبریں بڑھتی گئیں لیکن ان کی طرف پھر بھی امن رہا غالباً مئی میں وہاں پہلی واردات ہوئی جس میں ایک مسلمان مارا گیا جس سے محلے میں تشویش کی لہر دوڑ گئی لیکن اس علاقے کے پاکستان میں جانے کا چونکہ یقین تھا اس لیے یہ لوگ اطمینان سے بیٹھے رہے البتہ مئی کے واقعہ کے بعد خواتین اور بچوں کا گھروں سے نکلنا بند ہو گیا۔ اس کے بعد کشیدگی تو شروع ہو گئی لیکن کوئی خاص واردات نہ ہوئی۔ جولائی میں جا کر یہ واضح ہوا کہ یہ علاقہ ہندوستان میں جا رہا ہے جس سے پریشانی شروع ہوئی جو دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ نظریں بدلتی اور فاصلے بڑھتے نظر آ رہے تھے۔ بھائی چارہ بھی ختم ہو گیا تھا لیکن ایک خاموشی سی طاری تھی جو غالباً کسی واقعہ کی منتظر تھی۔ بیرونی دنیا سے ان کا رابطہ بس اب ماموں کے ذریعے رہ گیا تھا جو ریلوے اسٹیشن اور نور محل سرائے کے قریب رہتے تھے۔ اس کے بعد کی داستان وہ خود ہی بہتر سنا سکیں گے اس لیے ان ہی کی زبانی سنیے۔

"13 اگست کی رات کو ماموں دو سکھ دوستوں کے ساتھ آئے۔ انہوں نے بتایا کہ کل اس محلے پر حملے کی باری ہے اس لیے کل تک ہمیں اس علاقے سے نکل جانا ہے۔ میں نے دو بیل گاڑیوں کا بندوبست کر لیا ہے۔ صبح منہ اندھیرے یہاں سے نکل جانا ہے۔ ماموں' سکھ دوستوں کے ساتھ ان ہی کی طرح پٹکا وغیرہ باندھ کر سکھوں کے بھیس میں

آئے تھے۔ اس سے پہلے بھی جب سے کشیدگی ہوئی تھی' وہ جب بھی آئے' سکھوں کے ہی بھیس میں سکھ دوستوں کے ساتھ آتے تھے۔ رات بھر والدہ' خالہ اور دوسری رشتہ دار خواتین جانے کی تیاریوں میں لگی رہیں۔ میری خالہ کا گھر ہمارے بالکل ساتھ والا تھا۔ دوسرے دن یعنی 14 اگست کو ماموں صبح سویرے منہ اندھیرے ہی آ گئے۔ ہم لوگ تو تیار تھے لیکن پڑوس کے کچھ لوگ تیار نہیں تھے۔ ایک رشتہ دار خاتون تو چائے وغیرہ بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ خالو نے انہیں چولہے سے یہ کہتے ہوئے کھینچ کر اٹھا لیا کہ تمہیں زندگی عزیز ہے یا چائے؟ ہمارے پڑوس میں سالو اور منی نامی دو ہندو رہتے تھے۔ جب خالو اپنے گھر کو تالا لگانے لگے تو سالو دیکھ رہا تھا' کہنے لگا۔ "میاں جی' تالا کیوں لگاتے ہیں؟ کیوں ہمیں تالا توڑنے کی تکلیف دیتے ہیں؟" یہ وہی ہندو پڑوسی تھے جو کبھی ان کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ خالو نے تالا لگا کر چابی یہ کہتے ہوئے سالو کے حوالے کر دی کہ یہ تم ہی رکھ لو تا کہ تمہیں تالا توڑنے کی زحمت نہ ہو۔" سالو کا ذکر آیا تو مرزا صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے۔

"سالو جیسے لوگ تو ہمارے سامنے بات تک نہیں کر سکتے تھے' وہ بھی اس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی ہمارے محلے میں ہی پرچون کی دکان تھی۔ دوسری چیزوں کے علاوہ وہ بچوں کے کھانے کی چیزیں بھی رکھتا تھا۔ مجھے اس کی دکان کی چاول کی پھلیاں اور بیسن کی پکوڑیاں پسند تھیں۔ میں جب بھی چاہتا' اس کی دکان سے جتنی مرضی ہے' پھلیاں یا پکوڑیاں اٹھا لیتا۔ پھلیاں بوری میں رکھی ہوتی تھیں' میں مٹھی بھر نکال لیتا۔ اس کی کبھی جرات نہ ہوئی کہ مجھ سے پوچھتا کہ کیا کر رہے ہو؟ کتنی پھلیاں لے رہے ہو یا پیسوں کا کیا ہوگا؟ اس لیے کہ میرے دادا کا اسے حکم تھا کہ کبھی میرے پوتے کا ہاتھ نہ روکنا۔ یہ جو کچھ لیتا ہے' اسے لینے دینا' پیسے آ کے مجھ سے لے لینا۔ حکم کے مطابق' اس نے کبھی میرا ہاتھ نہ روکا۔ اب اس کے منہ میں بھی زبان آ گئی تھی۔"

"ہم لوگ مختلف راستوں سے ماموں کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں بازار پڑتا تھا جہاں خطرہ تھا اس لیے میری والدہ نے اسے چھوڑ کر نسبتاً لمبا راستہ اختیار کیا۔ میں چونکہ چل نہیں سکتا تھا اس لیے انہوں نے مجھے گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ میری ٹانگ پر چوٹ لگی ہوئی تھی جو میری اپنی ہی شرارت کا نتیجہ تھی۔ ہمارے محلے میں پانی کا کنواں تھا جس کے اردگرد منڈیر بنی ہوئی تھی۔ منڈیر کی ایک طرف نسبتاً اونچی جگہ تھی جہاں سے اس پر آسانی سے چڑھ سکتے تھے لیکن اس کی دوسری طرف خاصی گہری جگہ تھی۔ ہم لوگ شرارتاً ایک طرف سے منڈیر پر چڑھتے اور دوسری طرف کود جاتے۔ ہمارے لیے یہ ایک کھیل تھا جس کے مقابلے بھی ہوتے۔ ایک دن نہ جانے کیا ہوا کہ کودتے وقت میرا توازن خراب ہو گیا اور میں بری طرح گرا۔ ٹانگ میں بری طرح چوٹ آئی جو اندرونی تھی۔ غالباً اندر سے گوشت پھٹ گیا تھا۔ اس کی وجہ سے میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ حالات ٹھیک نہیں تھے اس لیے ٹھیک طرح علاج نہ ہو سکا اور زخم خراب ہوتا گیا۔ پھیلتے پھیلتے اس کا زہر ساری ٹانگ میں پھیل گیا۔ چھوٹے موٹے زخموں کا علاج ہمارا کانائی کیا کرتا تھا' اس کے خیال میں اس کا چیرا (آپریشن) ضروری تھا جو ان حالات میں ممکن نہیں تھا۔ آخر ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ زخم اتنا خراب ہو چکا ہے کہ شاید ٹانگ کاٹنی پڑے لیکن میری والدہ نے ٹانگ کٹوانے سے انکار کر دیا اور روتی دھوتی واپس آ گئیں۔ اب اس مشکل وقت میں مجھے اٹھا کر چلنا بھی ان کے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا۔ راستے میں ایک جگہ دو سکھ چھپے ہوئے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی ہم لوگ قریب پہنچے ایک نے دوسرے سے کہا۔

"لڑکی ہے' پکڑ لو۔" اس کے ہاتھ میں کرپان تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں پکڑتا' خدا نے دوسرے کے دل میں رحم ڈال دیا اور اس نے کہا۔

"چھوڑو یار' بے چاری پہلے ہی بچے کے ساتھ پریشان پھر رہی ہے' اس کو مار کر کیا کرو گے؟"

اس پر انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ آخر ہم لوگ چھپتے چھپاتے' گرتے پڑتے ماموں کے گھر پہنچ ہی گئے۔ دوسرے لوگ وہاں پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ دونوں ماموں گھر پر نہیں تھے۔ صحن کے درمیان میں چارپائی پر نانی بیٹھی حقہ پی رہی تھیں۔ ان سے ماموؤں کا پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ابھی آ جاتے ہیں' مجھے یہاں بٹھا کر گئے ہیں کہ واپس آ کر لے جائیں گے۔ نانی آنکھوں سے معذور تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ماموں بھی آ گئے۔ انہوں نے میری والدہ سے بچوں کا پوچھا اور پھر فٹافٹ نکل چلنے کا کہا۔ باہر دو بیل گاڑیاں تیار تھیں' بیل گاڑیوں پر سامان لاد دیا گیا۔ کسی کو بھی ایک سے زیادہ سوٹ کیس یا صندوق لے جانے کی اجازت نہ تھی اس لیے کہ جگہ ہی نہ تھی۔ جتنی کچھ قیمتی چیزیں ایک صندوق یا سوٹ کیس میں رکھی جا سکتی تھیں' لوگوں نے رکھ لیں' جس کسی نے بھی سامان رکھنے کا کہا' ماموں نے اجازت دے دی۔ فیصلہ کیا گیا کہ بیل گاڑیوں پر صرف سامان رکھا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ سامان کی گنجائش نکل سکے۔ نانی کا البتہ مسئلہ تھا' ایک تو وہ بوڑھی بہت تھیں' دوسرا وہ چل بھی نہیں سکتی تھیں۔ آخر سارا سامان لادنے کے بعد انہیں سامان کے اوپر بٹھا دیا گیا۔"

"نور محل سے کوئی چھ سات میل دور قصبہ نکودر میں میری خالہ رہتی تھیں۔ ان کا بیٹا فوج میں تھا' اسے حالات کی خبر ہوئی تو اسی طرح وردی میں ہی رائفل سمیت گاؤں آ گیا۔ سب لوگوں نے اسے منع کیا کہ نکودر میں سارے مارے جا چکے ہیں' وہاں مت جاؤ لیکن وہ نہ مانا اور چلا گیا۔ وہاں اسے وردی میں دیکھ کر کسی نے کچھ نہ کہا۔ اس نے گھر کا سارا سامان باندھا اور ایک بیل گاڑی میں لاد کر نور محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ کوئی بیل گاڑی والا چلنے کو تیار نہیں تھا۔ ایک کو اس نے زبردستی رائفل کے زور پر تیار کیا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اسے ایک دو بلوائیوں نے روکنے کی کوشش کی تو اس نے انہیں گولی مار دی' بس اس سے حالات خراب ہو گئے۔ وہ نکودر سے تین چار میل ہی دور گیا ہوگا کہ مسلح بلوائیوں نے اسے گھیر لیا۔ کس کس سے لڑتا اور کس کس کو مارتا' آخر خود بھی مارا گیا۔ اس کی ایک ٹانگ پینٹ اور بوٹ سمیت کاٹ کر عبرت کے لیے سڑک کے کنارے لٹکا دی گئی۔ اس کی ساری کہانی ماموں کے سکھ دوستوں نے بعد میں سنائی تھی۔"

"نور محل سے قافلہ کوئی صبح دس بجے چلا۔ منزل لدھیانہ کے قریب نکودر کیمپ تھی۔ قافلہ تقریباً چار میل لمبا تھا جس کی حفاظت کے لیے جیپ میں سوار دو سپاہی تھے۔ جیپ میں مشین گن لگی ہوئی تھی۔ ایک جیپ کہاں کہاں جاتی اور کس طرح قافلے کی حفاظت کرتی جبکہ چاروں طرف ہندو اور سکھ بھیڑیوں کی طرح پھر رہے تھے۔ جیپ آگے ہوتی تو پیچھے سے حملہ ہو جاتا۔ پیچھے جاتی تو آگے سے حملہ ہو جاتا۔ یہی سلسلہ اور حالات کیمپ پہنچنے تک جاری رہا۔ قافلے میں شامل مرد بھی ممکن حد تک قافلے کی حفاظت کرتے رہے۔ ہم لوگ قافلے کے آخر میں

تھے۔ حالت یہ تھی کہ سامان دونوں بیل گاڑیوں پر لدا ہوا تھا۔ ایک بیل گاڑی پر سامان کے اوپر نانی بیٹھی ہوئی تھیں' باقی سب خواتین اور مرد سوائے بیل گاڑی چلانے والوں کے گاڑیوں کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ نکودر کیمپ تک بارہ میل کا سفر تھا۔ یہ سفر شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی جی ٹی روڈ پر ہونا تھا جس کے کناروں پر مسافروں کی سہولت اور آرام کے لیے سایہ دار درخت اور کنویں کھودے گئے تھے۔ ابھی چار ہی میل گئے تھے کہ نانی والی بیل گاڑی کا پہیہ ٹوٹ گیا۔ سارا سامان اس طرح گرا کہ نانی سامان کے نیچے دب گئیں۔ وہ بے چاری پہلے ہی بہت ضعیف تھیں' جب تک سامان ہٹا کر انہیں باہر نکالا گیا' وہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ بیل گاڑی تو اب چل نہیں سکتی تھی اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ جو جتنا سامان اٹھا کر چل سکتا ہے' اٹھا لے' باقی وہیں پھینک دیا جائے۔ لوگوں نے اپنا قیمتی سامان نکال کر بیگوں اور پوٹلیوں میں ساتھ رکھ لیا' باقی وہیں پھینک دیا گیا۔ کتنی ہی قیمتی چیزیں وہاں چھوڑنی پڑیں لیکن کیا کیا جا سکتا تھا' انہیں اٹھاتا کون؟ نانی کے لیے سڑک کے کنارے بمشکل اتنی زمین کھودی گئی کہ ان کا جسم چھپ سکے۔ ابھی انہیں دفنایا ہی تھا کہ حملے کا شور مچ گیا۔ ویسے بھی قافلہ آگے نکلا جا رہا تھا جو خطرناک ہو سکتا تھا۔ ان کو ویسے ہی چھوڑا اور بھاگ کر قافلے میں شامل ہو گئے۔ میری والدہ کے لیے مجھے اٹھا کر قافلے کے ساتھ چلنا کافی مشکل ہو رہا تھا لیکن کر بھی کیا سکتے تھے۔ میں تو زمین پر پاؤں بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ باقی سب نے کچھ نہ کچھ اٹھایا ہوا تھا۔ اسی دوران پتہ چلا کہ پچھلے روز ہمارے ساتھ گاؤں 'چوہے کی' پر حملہ ہوا تھا۔ 'چوہے کی' نور محل سے کوئی چار میل دور تھا۔ وہاں کے مسلمانوں نے بے مثال بہادری دکھائی۔ مردوں اور عورتوں نے مل کر مقابلہ کیا۔ پتہ چلا کہ وہاں کوئی بھی مسلمان زندہ نہیں بچا لیکن مقابلہ آخری مرد کے مارے جانے تک جاری رہا۔ بعد میں سکھوں نے بتایا کہ 'چوہے کی' سے زیادہ کہیں بھی بہادری سے مقابلہ نہیں ہوا۔ راستے میں کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو گئیں کیونکہ جلدی میں زیادہ تو لا ہی نہیں سکے تھے' اوپر سے اگست کی گرمی' راستے میں کہیں پانی بھی نہیں مل رہا تھا کیونکہ راستے کے کنوؤں میں زہر ڈال دیا گیا تھا تاکہ قافلے والے استعمال نہ کر سکیں۔ میں نے تنگ کیا تو والدہ مجھے ایک کنویں پر لے گئیں۔ وہاں کئی لوگ مرے پڑے تھے۔ لوگوں نے والدہ کو روک دیا اور مرے ہوئے لوگ دکھائے کہ یہ لوگ زہر آلود پانی پینے سے مرے ہیں۔ والدہ مجھے لے کر آگے روانہ ہو گئیں۔ راستے میں ایک جگہ بارش کا پانی جمع ہوا تھا۔ زیادہ عرصہ کا ہونے کی وجہ سے اس کا رنگ بھی پیلا ہو گیا تھا' کیڑے بھی صاف نظر آ رہے تھے لیکن میری حالت کی وجہ سے والدہ مجھے ایسا پانی پلانے پر مجبور ہو گئیں۔ انہوں نے میرے منہ پر دوپٹہ رکھا اور چلو میں پانی لے لے کر میرے منہ میں ڈالتی رہیں تاکہ کیڑے میرے منہ میں نہ جائیں۔ راستے میں جگہ جگہ ہم نے قتل کیے گئے مسلمانوں کی لاشیں دیکھیں جن میں مرد' عورتیں اور بچے سب شامل تھے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو نیزوں میں پروئے ہوئے بھی دیکھا۔ ان لاشوں کو دیکھ کر سارے قافلے میں پریشانی' خوف اور وحشت پھیلی ہوئی تھی۔ بالآخر شام کے وقت ہم لوگ کیمپ پہنچ گئے۔ نور محل سے نکودر تک کا بارہ میل کا سفر ہم لوگوں نے پورے دن میں کیا پھر بھی شکر کیا کہ بخیریت پہنچ تو گئے۔"

"ہمارا کیمپ نکودر سے باہر ایک ہائی اسکول میں تھا۔ لدھیانہ بھی یہاں سے قریب ہی تھا' تین چار

میل ہی ہوگا۔ نکودر سے لڑکے پڑھنے کے لیے لدھیانہ جاتے تھے۔ اسکول کی بلڈنگ انگریزی کے حرف "H" کی شکل میں تھی۔ کمرے کافی سارے تھے لیکن جتنے بھی ہوتے' کم ہی پڑتے کیونکہ ہزاروں کی تعداد میں مہاجرین کہاں سما سکتے تھے' جگہ اس لحاظ سے اچھی تھی کہ کھلی تھی جس میں کھلے آسمان کے نیچے ہزاروں مہاجرین بے سروسامانی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے۔ دھوپ چھاؤں یا بارش سب موسم ان کے لیے ایک جیسے تھے کیونکہ کسی سے بھی "پناہ" کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ مجبوری تو خود ایک موسم بن جاتی ہے' ویسے بھی گھر کی چھت چھن جائے تو پھر موسموں کا کسے ہوش رہتا ہے۔ یہاں ہم کوئی اڑھائی مہینے رہے۔ ہر موسم اور صعوبت ہم لوگوں نے اس سکھ کی امید میں برداشت کی جو ہمیں منزل پر ملنی تھی۔ کیمپ میں موسم کے علاوہ جس چیز کا سب سے زیادہ مسئلہ تھا' وہ تھی خوراک۔ جو کچھ ساتھ تھا آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور اکثر کی نوبت فاقوں تک پہنچ گئی تھی۔"

"کیمپ میں کیا گزری' کیا بتائیں' بس مستقل ایک 'عرصہ عذاب' میں رہے۔ ہر چیز ذہن میں نقش ہے لیکن کچھ چیزیں شاید میں کبھی بھی بھلا نہ سکوں۔ ان میں سے ایک میری ٹانگ کا آپریشن تھا۔ میری ٹانگ خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو ساری ٹانگ ہی پھوڑا بن گئی تھی جسے چھونا بھی مشکل تھا۔ اس کی رنگت بھی بدلنا شروع ہو گئی تھی۔ سب کچھ ہمارے خاندانی سرجن 'کاکے نائی' کی نظر میں تھا۔ نظر تو اس کی اس پر نور محل سے ہی تھی لیکن وہاں حالات کی بے یقینی کی وجہ سے کچھ کیا نہیں جا سکتا تھا' لہٰذا اس کا واحد علاج اب آپریشن ہی تھا۔ کیمپ میں یوں بھی اب کافی وقت تھا اس لیے 'کاکے' نے میری والدہ کو مشورہ دیا کہ اس کا آپریشن کر ہی دیا جائے ورنہ ایسا نہ ہو کہ بعد میں ٹانگ ہی کاٹنی پڑے۔ نائی پنجابی معاشرے کا ایک خاص کردار ہے جس کا کام صرف بال کاٹنا ہی نہیں ہوتا' گھر کے چھوٹے موٹے کاموں اور بال کاٹنے کے علاوہ پیغامات لانا' لے جانا' شادی بیاہ کے انتظامات بشمول کھانا پکانا اور چھوٹے موٹے زخموں' پھوڑوں کا علاج جیسے کام بھی ان ہی کے ذمے ہوتے ہیں۔ ہر خاندان کا اپنا اپنا نائی ہوتا ہے' ہمارا 'کاکا نائی' تھا جسے زخموں کے علاج اور جراحی میں مہارت حاصل تھی۔ کاکا اس کا نام تھا یا تخلص وغیرہ' ہمیں یاد نہیں۔ والدہ سے اجازت ملنے پر آپریشن کی تیاری شروع ہو گئی۔ ماموں کے ذریعے روئی اور خالص دیسی گھی منگایا گیا جو ماموں کے سکھ دوستوں نے دوسرے ہی دن پہنچا دیا۔ آپریشن کے روز جس جگہ ہم لوگ مقیم تھے' جھاڑیوں کی آڑ میں ایک جگہ زمین میں کھڈا کھودا گیا۔ گھی کو اچھی طرح گرم کیا گیا پھر روئی کو اس میں اچھی طرح بھگو کر کئی فٹ لمبی 'بتی' سی تیار کی گئی۔ یہ سب کچھ میرے سامنے ہوتا رہا لیکن میں اس سے بے خبر تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ مجھے پتہ اس وقت چلا جب مجھے لا کر کھڈے کے ساتھ اس طرح لٹا دیا گیا کہ میری زخمی ٹانگ عین کھڈے کے اوپر آ گئی۔ پانچ آدمیوں نے آ کر مجھے دبوچ لیا۔ دو نے میرے بازو پکڑے' دو نے ٹانگیں اور پانچویں یعنی 'کاکا' صاحب میری ٹانگ پر حملہ آور ہوئے۔ پہلے تو انہوں نے مجھے لیکچر دیا' میری بہادری اور حوصلے کی تعریف کی' میرے زخم کی حالت کی بات کی اور پھر باتوں باتوں میں اپنا نشتر میری ٹانگ میں گاڑ دیا۔ میری چیخ شاید سارے کیمپ نے سنی ہوگی۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارنے کی بہت کوشش کی لیکن پانچوں تیار تھے اور گرفت بہت مضبوط تھی' میں ہل تک نہ سکا۔ اس بے بسی پر میں نے دائیں بائیں سر گھما کر "مادر

مہربان" کو تلاش کیا کہ شاید وہ مجھے ان ظالموں سے بچا لیں لیکن وہ بھی کہیں نظر نہ آئیں' غالباً انہیں بھی وہاں سے دور ہٹا دیا گیا تھا کہ شاید میری چیخ و پکار برداشت نہ کر سکیں۔ واقعی یہ ان کے لیے ہوتا بھی مشکل۔ اب میں اگر کچھ کر سکتا تھا تو وہ تھا چیخنا چلانا کیونکہ منہ پر تو کوئی پابندی نہیں تھی اس لیے میں کھل کر چیخا چلایا۔ کاکے نے زخم کا منہ کھڈے پر کر کے ساری ٹانگ سے گند نکالنا شروع کیا' پہلے تو صرف گند اور پیپ ہی نکلے پھر پیپ کے ساتھ ہلکا ہلکا خون بھی نکلنے لگا اور آخر میں صرف خون آنے لگا۔ کاکے کی تسلی ہوگئی تو اس نے گھی سے تر روئی کی بتی زخم میں بھر دی۔ زخم بھر کر اسے آہستہ سے بند کر دیا اور اوپر سے پٹی لپیٹ دی۔ اس وقت تک میری چیخیں بھی سسکیوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ شروع میں تو کافی درد رہا لیکن پھر آہستہ آہستہ سکون ملنے لگا۔ دوسرے دن پھر میری چیخ و پکار میں پہلی بتی نکالی گئی جو پیپ اور خون سے تر تھی اور زخم کو صاف کر کے دوسری بتی ڈالی گئی پھر ہر روز یہی عمل دہرایا جاتا۔ آہستہ آہستہ پہلے پیپ آنا بند ہوئی اور پھر خون آنا بھی کم ہوگیا۔ جیسے جیسے زخم بھرتا گیا' بتی بھی چھوٹی ہوتی گئی حتیٰ کہ کیمپ سے روانگی سے پہلے ہی زخم بالکل بھر گیا۔ زخم تو خیر بھر ہی جاتے ہیں لیکن یہ زخم جیسے بھرا اور جیسے حالات میں بھرا' وہ شاید میں کبھی بھی نہ بھلا سکوں۔"

"نور محل سے ہم لوگ جن کپڑوں میں نکلے' کیمپ میں بھی وہی چل رہے تھے۔ نہ تو اور کپڑے ہمارے پاس تھے نہ کہیں اور سے اس دوران مل سکے۔ ملتے بھی کہاں سے' اس وقت تو چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے۔ نور محل سے افراتفری میں کچھ ساتھ نہ لے سکے کیونکہ جان بچانے کی فکر تھی۔ کچھ تھا بھی تو بیل گاڑی کے حادثے میں رہ گیا' صرف ہماری ہی نہیں' سب ہی کی یہی حالت تھی۔ میری چھوٹی بہن کے کپڑوں کی حالت تو بہت ہی خراب ہوگئی تھی اس لیے والدہ نے اتروا کر دھو دیئے۔ دوسرا جوڑا تو تھا نہیں اس لیے اس کے گرد غالباً کوئی چادر وغیرہ لپیٹ دی گئی۔ والدہ نے سوکھنے کے لیے یہ کپڑے قریب ہی ایک جھاڑی پر لٹکا دیئے لیکن کچھ دیر بعد جب وہ یہ دیکھنے کے لیے گئیں کہ سوکھ گئے ہیں یا نہیں تو کپڑے غائب تھے' شاید کوئی ہم سے بھی زیادہ ضرورت مند لے گیا تھا۔ والدہ کو بہت پریشانی ہوئی' مسئلہ یہ تھا کہ میری بہن کو پہنائیں کیا جو بغیر کپڑوں کے چادر میں لپٹی بیٹھی تھی؟ اتفاقاً اسی دوران قریب ہی کسی کی بچی فوت ہوئی تھی' میری بہن ہی کی ہم عمر تھی۔ میری والدہ ان کے پاس گئیں' ان سے اس بچی کا افسوس کیا اور پھر معذرت کے ساتھ بچی کے کپڑوں کی درخواست کی۔ خاتون سمجھدار تھیں' حالات اور ضرورت سمجھ گئیں اس لیے انہوں نے چپ چاپ بچی کے کپڑے میری والدہ کے حوالے کر دیئے لیکن جو کچھ ان کے دل پر گزری ہوگی' وہ ہم سمجھ سکتے تھے۔"

"کپڑوں کے متعلق ہی ایک اور واقعہ میری تایازاد بہن کے ساتھ پیش آیا۔ نور محل سے نکودر کیمپ آتے ہوئے جب بیل گاڑی کو حادثہ پیش آیا تو میرے ماموں نے سب سے کہا کہ سب سامان تو لے جا نہیں سکتے اس لیے اپنے سامان میں سے قیمتی چیزیں نکال لیں اور باقی وہیں پھینک دیں۔ میری ان تایازاد بہن نے اپنا سوٹ کیس کھول کر اس میں سے زیورات نکال لیے اور باقی سامان وہیں رہنے دیا۔ پتہ نہیں کس دل سے اس نے یہ سامان وہاں چھوڑا ہوگا کیونکہ یہ سب اس کی بیٹی کے جہیز کا سامان تھا۔ کیمپ میں ان کے پاس کپڑوں کا ایک ہی جوڑا تھا جسے وہ تبدیل بھی نہیں کر سکتی تھیں پھر کیمپ میں ہی

ایک دن جب انہوں نے اپنے ہی کپڑے فروخت ہوتے دیکھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کوئی وہاں سے اٹھا لایا تھا اور اب بیچ رہا تھا۔ بیٹی کے جہیز کا یہ حال دیکھ کر وہ برداشت نہ کر سکیں۔"

"کیمپ میں رہائش کے دوران ایک دفعہ شدید سیلاب بھی آیا' کافی لوگوں کا سامان بہہ گیا۔ بے چاروں کے پاس تھا ہی کتنا' جو تھا' اس میں سے بھی کافی سیلاب کی نذر ہوگیا۔ سیلاب میں سانپ بھی بہہ کر آئے لیکن یاد نہیں کہ کسی کو ڈسا بھی تھا یا نہیں۔ کیمپ میں کافی عرصہ تقریباً ڈھائی فٹ پانی کھڑا رہا۔ ہم لوگ کر بھی کیا سکتے تھے' باہر تو نکل ہی نہیں سکتے تھے' اسی پانی کے اندر ہی گزارہ کرتے رہے۔ مجھے یاد ہے' دوسرے کاموں کے علاوہ پیشاب' پاخانہ بھی اسی کے اندر کرتے تھے۔ اسی گندگی کی وجہ سے بعد میں میرے جسم پر چھوٹے چھوٹے پھوڑے نکل آئے تھے جن کا علاج ہوتا رہا۔"

"میں اکلوتا ہونے کی وجہ سے بہت لاڈلہ تھا۔ والدہ' ماموں' دادا سب میرے نخرے سہتے۔ دادا جن کا میں لاڈلہ تھا' وہ تو ہجرت سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ غالباً 1946ء کے آخر میں انہوں نے وفات پائی لیکن باقی سب ان حالات میں بھی میرا دوسروں سے زیادہ خیال رکھتے۔ ٹانگ کے زخم کی وجہ سے تو میرے نخرے اور بھی بڑھ گئے تھے۔ کیمپ میں سب نمک والی چائے پیتے لیکن میرے لیے علیحدہ شکر والی چائے بنتی۔ (شاید اسی کا خمیازہ آج شوگر کی صورت میں بھگت رہا ہوں۔) اس سے پہلے گھر میں بھی یہی ہوتا تھا' سب سے زیادہ کھاتا پیتا اور عیش کرتا۔ دادا کی زندگی میں تو کوئی میرا ہاتھ ہی نہیں روک سکتا تھا' جتنا مرضی ہے' کھاتا پیتا اور جو مرضی ہے' کھاتا پیتا۔ دادا مرحوم مجھے کھاتا پیتا

بہت دیر سے آئے

وہ میرے جنازے پہ بہت دیر سے آئے
افسوس' انہیں ہم یاد بہت دیر سے آئے

ٹھہری ہوئی لگتی ہیں تمہیں دیکھ کے سانسیں
تم آج مرے دوست' بہت دیر سے آئے

مرنا تھا گوارہ نہ کسی طور بھی ہم کو
احباب پسِ مرگ بہت دیر سے آئے

چالیس قدم سب نے دیا ساتھ ہمارا
جو خاص تھے' وہ یاد بہت دیر سے آئے

دیکھا دمِ آخر تو کہا یہ مرے دل نے
طعنہ نہ دیں احباب بہت دیر سے آئے

آجانا ذرا جلد میری گنجِ لحد پر
کہنا نہ پڑے آپ بہت دیر سے آئے

محمد فہیم

دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ میری والدہ بے چاری نے تو کئی دفعہ میری وجہ سے ان سے ڈانٹیں بھی کھائیں بلکہ وہ تو والدہ سے کہتے کہ اسے سب کے سامنے مت کھلایا کرو' اندر لے جا کر کھلایا کرو' شاید اس لیے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ ان کی وفات میرے لیے بہت بڑا صدمہ تھی۔ ان کے آخری ایام تو مجھے آج بھی یاد ہیں۔ آخری دنوں میں وہ بیماری کی وجہ سے بستر سے لگ گئے تھے۔ ہر وقت بستر پر پڑے رہنے کی وجہ سے ان کی پیٹھ پک کر پھوڑا بن گئی تھی جس پر کیڑے چڑھ جاتے تھے۔ میں اور میری والدہ انہیں اتارتے رہتے۔ آخر جب انہیں اپنی موت کا یقین ہو گیا تو وہ ہمیں کیڑے اتارنے سے منع کرتے۔ کہتے تھے۔ ''آخر اس جسم کو کھانا تو انہوں نے ہی ہے' کل کی بجائے اگر آج ہی کھاتے ہیں تو کھانے دو۔'' کیڑے کاٹتے ہوں گے تو تکلیف تو ہوتی ہوگی لیکن برداشت کرتے تھے اور انہیں اتارنے سے منع کرتے تھے۔''

''کیمپ سے روانگی سے ایک دن پہلے ماموں کے سکھ دوستوں نے ہمیں خفیہ اطلاع دی کہ صبح اس کیمپ کی ٹرین پاکستان روانہ ہونی ہے۔ تم لوگ منہ اندھیرے ہی ریلوے اسٹیشن پہنچ جانا تا کہ جگہ مل سکے ورنہ جگہ نہیں ملنی۔ انہوں نے یہ بھی تاکید کی کہ کسی اور کو نہ بتانا۔ ہم نے کسی کو نہیں بتایا لیکن پتہ نہیں کیسے لوگوں کو پتہ چل گیا۔ شاید ہماری تیاریوں سے انہوں نے اندازہ لگایا یا شاید ان کے بھی ہماری طرح اطلاع دینے والے ہوں۔ صبح سویرے جب ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے تو آدھی ٹرین بھر چکی تھی۔ ماموں کے سکھ دوست ٹرین میں ہماری سیٹیں روکے بیٹھے تھے' جیسے ہی ہم لوگ پہنچے' وہ فوراً وہاں سے چلے گئے۔ انہیں خود بھی وہاں خطرہ تھا لیکن انہوں نے ماموں کے ساتھ دوستی خوب نبھائی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ خواتین اور بچے گاڑی کے اندر بیٹھیں گے جبکہ تمام مرد گاڑی کی چھت پر بیٹھیں گے۔ سارا دن لوگ آتے اور سوار ہوتے رہے۔ ریلوے اسٹیشن پر حفاظت کا معقول بندوبست تھا اس لیے کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ شام کے قریب گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی۔ گاڑی کے آگے گارڈ کے کھلے ڈبے لگائے گئے تھے جن پر مشین گنیں فٹ کر کے گاڑی کی حفاظت کے لیے فوجی بیٹھے تھے۔ گاڑی کی کھڑکیاں وغیرہ بند کر دی گئی تھیں اس لیے ہمیں باہر کا کچھ نہیں نظر آ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار بھی بمشکل چار پانچ میل فی گھنٹہ ہوگی جو بہت خطرناک تھی لیکن فوجیوں کی وجہ سے ہم لوگ محفوظ رہے۔ راستے میں رات کے وقت کوئی چیز نیچے گری لیکن اندھیرے کی وجہ سے پتہ نہ چل سکا کہ کیا گرا ہے۔ زنجیر کھینچی گئی لیکن گاڑی رکتے رکتے بھی کافی آگے نکل گئی۔ گاڑی رکنے پہ فوجی اور کچھ دوسرے لوگ پتہ کرنے کے لیے پیچھے گئے۔ دیکھا تو بڑی خالہ زخموں سے لہولہان گاڑی کے پیچھے بھاگتی آ رہی تھیں۔ شکر ہے' نزدیک کوئی آبادی نہیں تھی اور وقت بھی رات کا تھا ورنہ یا تو ماری جاتیں یا اغوا ہو جاتیں۔ رات کو تھکاوٹ اور نیند کی وجہ سے نیچے لڑھک گئیں۔ دروازہ کھلا تھا اس لیے باہر جا گریں۔ راستے میں اور کیا ہوتا رہا' ہمیں کچھ پتہ نہیں چلا۔ چھت پر بیٹھے مرد خود بھگتتے رہے۔ گاڑی امرتسر ریلوے اسٹیشن پر جا کر رکی۔ گاڑی پلیٹ فارم سے آگے نکال کر خالی جگہ پر لگائی گئی تھی۔ اسٹیشن کے پلوں اور اردگرد کرپانیں لہراتے سکھ ہمیں نظر آ رہے تھے۔ فوجیوں نے ایک مشین گن کا رخ گاڑی کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف کر کے اعلان کر دیا کہ اگر کسی نے گاڑی کے قریب آنے کی کوشش کی تو گولیوں سے بھون دیں گے۔ جب کافی دیر گاڑی نہ چلی تو فوجی' ڈرائیور کے پاس گئے۔ فوجی

[illegible] ڈرائیور سکھ تھا۔ فوجیوں نے اس سے پوچھا کہ گاڑی یہاں روکی کیوں ہے اور پھر چلاتا کیوں نہیں؟ تب ڈرائیور نے ٹال مٹول کی فوجی [illegible] سمجھ گئے انہوں نے ڈرائیور کو خوب مارا اور گاڑی چلانے پر مجبور کر دیا۔''

''امرتسر سے گاڑی چلی تو لاہور جا کر رکی۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر عجب سماں تھا' لوگ ہمیں دیکھ کر پاگلوں کی طرح حیران اور خوش تھے۔ جشن یا عید کا منظر تھا۔ کوئی اپنوں کو ڈھونڈ رہا تھا تو کوئی گلے مل رہا تھا۔ کئی لوگوں کو کہتے سنا۔ ''شکر ہے' اس میں تو لوگ زندہ ہیں۔'' پتہ چلا کہ اس سے پہلے آنے والی تینوں گاڑیوں میں صرف لاشیں ہی آئی تھیں' کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔ لاہور تو پھر لاہور ہے' اس نے اپنا دل ہی کھول دیا اور بازو بھی۔ اتنا پیار اور محبت ملی کہ ایک دفعہ تو لوگ سب کچھ بھول گئے۔ لوگوں نے ہر طرح کی مدد کی۔ احساس ہوا کہ اپنوں میں آ گئے ہیں۔ سب سے بڑھ کر احساسِ تحفظ تھا۔ اب نہ کسی ہندو کا ڈر تھا نہ سکھ کا۔ بھیڑیے سرحد کے پاس رہ گئے تھے۔ لاہور میں ایک خالو رہتے تھے۔ خالو اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے' ہم لوگ ان کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے۔ چھوٹا سا مکان تھا مگر پیار اور خلوص سے بھرا۔ انہوں نے ساتھ ہی رہنے کی پیشکش کی لیکن چھوٹے سے مکان میں کتنے لوگ رہتے اس لیے میری والدہ نے وہاں زیادہ عرصہ رہنا مناسب نہ سمجھا۔ [illegible] میں میرے تایا اور چچا رہتے تھے' میری والدہ نے وہیں جانے کا فیصلہ کیا۔ دو تین دن لاہور میں رہ کر ہم کوئٹہ کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ان [illegible] گاڑی کا ٹکٹ نہیں ہوتا تھا۔ بس میں چچا [illegible] نہیں تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر لوگوں سے [illegible] کو پتہ نہیں تھا اس لیے ہم اسی گاڑی میں [illegible] گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ چچا بھی مچھ شفٹ کر گئے تھے۔ مچھ ریلوے اسٹیشن پر تایا فیض محمد کا پوچھا تو سب ان کو جانتے تھے۔ ہم لوگ مچھ میں اتر گئے۔ ایک صاحب ہمیں تایا جان کے گھر لے گئے۔ تایا جان خود ہمیں ڈھونڈنے کے لیے لاہور اور واہگہ گئے ہوئے تھے لیکن انہیں ہم نہ ملے۔ ان کے گھر میں سب بہت خوش ہوئے' بڑے پیار اور محبت سے ملے۔ ہم نے وہیں ان کے ساتھ ہی رہنا شروع کر دیا۔ سب عزیزوں کو ہمارے بخیریت پہنچنے کی اطلاع دے دی گئی۔ میرے والد کو بھی انگلینڈ میں ہماری خیریت سے مطلع کر دیا گیا۔ تایا کے گھر میں ہمیں ہر طرح کا آرام تھا لیکن جب تک گھر اپنا نہ ہو' سکون نہیں ملتا اس لیے والدہ نے زیورات بیچ کر آہستہ آہستہ اپنی چیزیں بنانی شروع کر دیں۔ والد صاحب کو بھی چونکہ ہمارے حالات کا پتہ چل گیا تھا اس لیے انہوں نے وہاں سے =/13,000 روپے بھیج دیئے جو اُس وقت کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ کچھ عرصہ بعد سب کو میری تعلیم کی فکر ہوئی۔ تایا محمد حافظ پہلے مچھ کولپور اور پھر تایا شیر محمد کے پاس کوئٹہ لے گئے۔ اس وقت میری عمر نو سال ہو گئی تھی اور قد بھی اچھا خاصا لمبا ہو گیا تھا اس لیے داخلے کے لیے مجھے اسکول لے گئے تو اسکول والوں نے مجھے داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے عمر وغیرہ کم کرا کے داخل کرایا گیا۔ میرے داخل ہونے کے بعد والدہ بھی مچھ سے کوئٹہ آ گئیں۔ رزاق نامی ایک شخص سے ہم نے کواری روڈ پر کرائے پر گھر لے لیا اور اس میں رہنے لگے حالانکہ اس نے بھی ہندوؤں کے مکان پر قبضہ کیا ہوا تھا لیکن ہم سے کرایہ وصول کر رہا تھا۔ 1948ء کے آخر میں والد صاحب انگلینڈ سے واپس آ گئے۔ یہاں آ کے جب انہیں پتہ چلا کہ رزاق قبضے کے مکان پر ہم سے کرایہ وصول کر رہا ہے تو انہیں بہت غصہ آیا۔ انہوں نے نہ صرف کرایہ دینے

سے انکار کر دیا بلکہ مکان پر بھی قبضہ کر لیا۔ بعد میں رزاق نے منت سماجت کر کے اور سفارشیں کرا کے ہم سے مکان خالی کرا لیا۔ نور محل اور جالندھر میں ہماری اچھی خاصی جائیداد تھی۔ مشورہ دیا گیا کہ ان کے کلیم (claim) داخل کریں چنانچہ کلیم داخل کر دیا گیا لیکن کلیم میں جو کچھ ملا' وہ ہمیں لے کر بھی شرمندگی ہوئی اور بتاتے ہوئے بھی شرمندگی ہوتی ہے۔ میرے دادا کی جائیداد کے میرے والد اور ان کے بھائیوں پانچوں کو 10,720/= روپے ملے جن میں سے میرے والد کے حصے میں 2,140/= روپے آئے۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیں' نہائیں کیا اور نچوڑیں کیا۔ اس کے بعد ایک عزیز کے مشورے پر ہم لوگ موجودہ مکان میں شفٹ کر گئے۔ شروع میں یہ مکان کرائے پر تھا' بعد میں ہم نے خرید لیا۔ والد صاحب 1956ء میں کویت چلے گئے۔ میں نے بھی کچھ پڑھ لکھ لیا تو 1961ء میں' میں بھی کویت چلا گیا' خوب محنت کی اور خوب کمایا۔ والد صاحب 1966ء میں واپس آ گئے لیکن میں 1982ء تک وہاں رہا۔ میری وہاں اچھی سروس تھی اور خوب کما رہا تھا لیکن میں اپنے وطن میں ہی رہنا چاہتا تھا۔ پاکستان آ کر میں نے خوب محنت کی' بزنس میں پیسہ لگایا پھر فلور مل لگائی۔ خدا نے برکت دی اور آج خدا کے فضل سے ہمارے پاس سب کچھ ہے' شاید پہلے سے بھی زیادہ۔"

"میرے پاس یہاں خدا کے فضل سے سب کچھ ہے' پیسہ' جائیداد' اولاد' ہر وہ چیز جس کی انسان کو خواہش ہو سکتی ہے' سب سے بڑھ کر آزاد وطن ہے جہاں نہ کسی ہندو کا ڈر ہے نہ سکھ کا نہ قافلوں کے لٹنے کا ڈر ہے نہ کیمپ پر حملوں کا لیکن پھر بھی سکون نہیں۔ جانے کیوں مجھے یہ وہ ملک نہیں لگتا جس کے لیے ہم اپنا سب کچھ لٹا کر یہاں آئے تھے۔ یہ ملک تو ہم نے اسلام کے نام پر لیا تھا' ایک ایسا ملک جہاں پر ہم اسلام کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں لیکن کہاں گیا وہ اسلام؟ اوپر سے نیچے تک' صدر سے عام آدمی تک' کسی کو بھی دیکھ لیں' کتنا عمل کرتے ہیں ہم اسلام پر؟ کرپشن' جھوٹ' دغا' فریب اور بے ایمانی اور دہشت گردی' کیا یہی کچھ سکھاتا ہے اسلام؟ اگر ایسا ہی ملک بنانا تھا تو پھر اسے ہندوستان ہی کیوں نہ رہنے دیتے' نہ لٹتے نہ مالی اور جانی قربانیاں دینی پڑتیں' بس یہی سب کچھ دیکھ کر میں کڑھتا رہتا ہوں اور شاید اسی لیے مجھے سکون نہیں ملتا۔ کسی دفتر میں جب کسی کو رشوت لیتے یا حرام کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے اس میں سالو ہندو نظر آتا ہے۔ جب میں یہاں وزیروں' لیڈروں اور افسروں کو بے دردی سے قوم کا پیسہ لوٹتے اور لٹاتے دیکھتا ہوں تو مجھے نکودر کیمپ کے بھوک اور پیاس سے بلکتے بے سر و سامان بچے یاد آتے ہیں۔ یہ لٹیرے بھی مجھے "نور محل" اور "چوبے کی" پر حملے کرنے والے بھیڑیے لگتے ہیں اور میں پھٹ پڑتا ہوں۔ دوست احباب کہتے ہیں کہ اتنے جذباتی کیوں ہو جاتے ہو؟ لیکن ان کو کیا پتہ کہ میں اس وقت کیا دیکھ رہا ہوتا ہوں۔ خیر' کچھ بھی ہے' جیسا بھی ہے' یہ ہمارا ملک ہے اور ہمیں جان سے عزیز ہے۔ اس کے لیے ہم نے پہلے بھی قربانیاں دی تھیں اور اب بھی ہر قربانی کے لیے تیار ہیں لیکن اس کو اپنے خوابوں کے مطابق بنانے کے لیے ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔ ان مقاصد کو سامنے رکھ کر جن کے لیے اسے بنایا گیا تھا' ایک دفعہ پھر ہمیں قربانیاں دینی ہوں گی۔

آیئے' عہد کریں کہ ہم اسے اپنے خوابوں کا پاکستان بنا کر دم لیں گے خواہ اس کے لیے ہمیں کتنی ہی اور کیسی بھی قربانی دینی پڑے۔

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ میرے خونِ جگر میں





صبیحہ شاہ

موم کا گھر

مہناز بٹ ناز کا خیال

میں عورت ہوں اکثر رلائی گئی ہوں
میں حد سے زیادہ ستائی گئی ہوں

دکھوں کی آنچ میں چپ چاپ پگھلتی ایک عورت کا ماجرا

وہ کچھ انوکھی سی مظلوم تھی۔ مسکراتی ہنستی کبھی شکوہ نہ کرنے والی اس لیے اس کی مظلومیت کے بارے میں کچھ شکوک تھے۔ نکتہ دانوں نے اکثر غور کیا اور کہا بھی کہ آنکھ کے دائروں میں سمٹا ہوا درد کا ایک شہر ہے جو مسکراتا ہے لیکن درد کے اس شہر کو جانے کا راستہ کوئی کولمبس نہ پا سکا۔

سر سے پیر تک چادر تان کر سونے کی اداکاری کرتے ہوئے اسے دیکھ کر میں سوچ رہی ہوں کہ



اگر لوگ راز آشنا ہو بھی جاتے تو کیا کر لیتے؟ جب ہم کسی کے لیے کچھ کر نہیں سکتے تو ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کسی کے فیصلے پر رائے زنی کا؟ اس کو احمق یا مجرم گرداننے کا؟ لیکن صاحب، حقوق و فرائض اور ان کی اہمیت اور ان دونوں کے آپس میں رشتے کے بارے میں کون کیا جانتا ہے؟ طوبیٰ کے بارے میں بچپن سے ہی امی کی یہ رائے تھی کہ بڑی ہی گھنی لڑکی ہے اس کے پاتال کو پانا مشکل ہے، اس کی گفتگو میں حقیقت کی تلخی اور طنز کی چبھن اس قدر ہوتی کہ ہماری شیریں زبان امی گھبرا اٹھتیں۔ ہمارے خوش شکل اہلِ خانہ میں طوبیٰ قدرے کم رو تھی، اس کو اس کی کم روئی کا احساس گھر میں تو کسی نے نہیں دلایا، ہاں، باہر کے لوگ اکثر حیرت کا اظہار کرتے۔

''ارے، یہ طوبیٰ کس پر گئی ہے؟''

جو بھی وہ سن لیتی تو بڑے اطمینان سے کہتی۔

''اپنے آپ پر گئی ہوں۔''

لیکن شاید اس کو احساس تھا، تب ہی تو اس نے تمام شعبوں میں اپنے آپ کو منوایا کہ اسکول سے لے کر کالج تک ہر جگہ طوبیٰ افسر علی کا ہی ڈنکا بجتا تھا۔ کبھی کبھی تو میں بہت حسد محسوس کرتی اس سے، اس نے مجھے بھی اپنی سرگرمیوں میں شامل کرنا چاہا تھا لیکن...... میں، صرف کبھی کبھار حسد ہی افورڈ کر سکتی تھی۔ ایک ہجوم کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرنا یا ایکٹنگ کرنا، توبہ ہے۔ اتنا دل گردہ میرے پاس کہاں تھا، پہلی اور آخری مرتبہ اسٹیج سے اتر کر میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے کہ مجھے بخش دے بہن! تب وہ بہت ناراض ہوئی تھی۔ ''کم ہمت، بے حوصلہ، ڈرپوک، کیا کرو گی زندگی میں؟''

''بس شادی کر لوں گی اور روٹیاں تھوپ تھوپ کر بچوں کے باپ کو کھلاؤں گی۔'' میں نے بات مذاق میں ٹالی اس لیے کہ اس سے بحث کرنے کے لیے دلائل میرے پاس نہ تھے۔

''کیا کہا؟ تمہارے خیال میں ہاؤس وائف کی جاب اتنی ہی آسان ہے؟'' وہ بلبلا اٹھی۔

''تو اور کیا، رکھا ہی کیا ہے اس میں؟ میاں کما کر لائے گا، میں خرچ کروں گی۔'' میں نے بڑے مزے سے کہا۔

''بداندیش، ناسمجھ کہیں کی۔'' مجھ سے گیارہ ماہ چھوٹی طوبیٰ گھنٹوں مجھے لیکچر دیتی رہی لیکن ہوا یہ کہ شادی شدہ زندگی کو بہت مشکل سمجھنے والی اس لڑکی کی شادی بڑی جلدی ہو گئی۔

............*......*

اس رات سونے سے پہلے طوبیٰ نے کہا۔ ''سنو، کل کالج نہیں جائیں گے۔''

''کیوں؟'' میں نے کروٹ بدل کر پوچھا۔

''کل مشاعرہ سننے چلیں گے گورنمنٹ کالج۔''

''لیکن طوبیٰ......!''

''ارے، گولی مارو لیکن ویکن کو۔'' اس نے بے پروائی سے کہا اور اگلے دن گورنمنٹ کالج کے پرہجوم ہال میں وہ مجھے اسٹیج سے قریب کی نشست گاہ پہ بٹھا کر دوسرے کالج کی شاعرات کے درمیان اسٹیج پر جا بیٹھی تو میں اس کا سانولا، ستھرا، پراعتماد چہرہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

''ارے طوبیٰ! شاعرہ؟ کب؟ کب سے بھئی؟'' مجھے یوں ہونق دیکھ کر مسکراہٹ کی کرن اس کے ہونٹوں پہ دمکی۔ میرا جی جل کر خاک ہو گیا۔ ''گھنی کہیں کی۔''

ذرا جو اس نے ہوا لگنے دی ہو۔ اپنی باری آنے پر وہ بڑی سنجیدگی سے بڑے خوبصورت انداز میں نظم کے لیے دیئے گئے موضوع 'بام و در پہ ۱۹۷۱ء اور سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نظم سناتی رہی۔ ہال پر سکوت طاری تھا۔ لوگوں کی پلکوں پر چمکتے قطرے، آنکھوں سے ڈھلکتے آنسو بھی میں نے دیکھے اور پھر واہ...... واہ...... مکرر، مکرر کے شور میں اس نے دو مرتبہ اپنی نظم سنائی۔ اتنا درد، احساس کی اس قدر رنزائیتیں۔ بخدا، یہ طوبیٰ کا نیا روپ تھا۔

[illegible]وں میں معروف ادیب و شاعر...... لیکن [illegible]ے، شاید یہاں اُن کا اصل نام لکھنا مناسب نہ ہو، یوں سمجھیں کہ اثر جاودانی بھی شامل تھے۔ حسب توقع طوبیٰ کی نظم اول رہی۔ ریفریشمنٹ روم میں جاودانی صاحب بطورِ خاص طوبیٰ کے پاس داد دینے آئے، شلوار قمیص، واسکٹ میں یہ دبلا پتلا، عینک زدہ لڑکا وہ جاودانی تو نہ تھا جس کی تخلیقات کے پردے میں سے ایک جہاندیدہ، پختہ کار چہرہ جھانکتا تھا۔ اس نے طوبیٰ کو اس قدر دلی مبارک باد دی کہ وہ گھبرا اٹھی۔

............*......*

وہ ایک عام سی صبح تھی، ویسی ہی جیسی روز ہوتی ہے، اپنے دامن میں وہی گھسے پٹے معمولات، وہی لگے بندھے کام لیے، ناشتے کی میز پر ابو کے اٹھ جانے کے بعد امی نے کہا تھا کہ آج کچھ مہمان آئیں گے، کالج سے آ کر کچھ بنا لینا۔ اس ایک چھوٹے سے، سادہ سے جملے میں بڑی لمبی چوڑی ہدایات پنہاں تھیں۔ امی کے ہٹتے ہی خاموشی سے ناشتہ کرتی طوبیٰ بڑبڑائی۔ 'جانے کب ختم ہوگا یہ سلسلہ؟ آئیں گی، ٹھونس ٹھانس کر چل دیں گی دوسرا گھر جھانکنے، میرا بس چلے تو چائے کے بجائے زہر کی پیالی پلاؤں۔' کئی مرتبہ رد کیے جانے کا کرب [illegible] مسکراہٹ بن کر میرے لبوں پر بکھر گیا۔ 'جانے [illegible] مائیں، بہنیں اپنے بیٹوں، بھائیوں کے لیے دلہن [illegible] انہوں نے اپنے گھروں کے سارے آئینے توڑ کر [illegible] کیوں رکھتی ہیں؟'

شام کو لدی ہوئی ٹرالی لیے میں 'سلیکشن بورڈ' کے سامنے حاضر ہوئی، آٹھ آنکھیں مجھے ٹٹول رہی تھیں، اندر تک گڑی جا رہی تھیں۔ میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں، میکانکی انداز میں سرو کر کے جب میں زرد پھول دار سوٹ والی لڑکی کے پاس بیٹھی تو وہ بڑی ادا سے مسکرائی۔

''ہاں جی، نام تو بہت خوبصورت ہے آپ کا طوبیٰ!''

اور میں نے بغیر نگاہ اٹھائے جان لیا کہ امی بے طرح چونکی ہیں۔ میں دھیرے سے بولی۔

''جی میں طوبیٰ نہیں، اقصیٰ ہوں۔ طوبیٰ مجھ سے چھوٹی ہے۔''

''او سوری، پلیز، طوبیٰ کو بھی بلوایئے ناں۔''

اس نے بالکل یوں کہا گویا دکان پہ کھڑی کپڑا جانچ رہی ہو۔ 'نہیں بھائی، یہ نیلا نہیں، وہ سرخ تھان دکھایئے ناں۔'

''جی بہتر۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی، ہانپتی کانپتی طوبیٰ کے پاس پہنچی۔

''چل طوبیٰ، وہ لوگ بلا رہے ہیں۔''

''مجھے؟'' طوبیٰ نے ادھڑے دامن کی ترپائی کرتے ہوئے ہاتھ روک کر حیرت سے پوچھا۔ ''پر کیوں؟'' اس نے گرہ لگا کر دھاگا توڑا۔

''بس ناں، وہ اصل میں آئی ہی تیرے لیے ہیں۔''

اپنا حال

گم سم رہنا
رات کو اکثر
اپنے کمرے کی دیواریں
تکتے رہنا
کسی سے کچھ نہ کہنا
دل کی باتیں
بس
اپنے ہی دل سے کہنا!!

ندیم عباس بخاری

میں نے اطلاع دی۔

"مگیں ٹرے......" وہ بے اختیار بولی۔

"چلو جلدی کپڑے تو بدل لو۔" میرے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے۔

"کیوں؟ میں جیسی ہوں، ہوں، میں تو ایسے ہی جاؤں گی۔" وہ وائل کے بدرنگے سوٹ کی سلوٹیں ہاتھ سے درست کرتی ہوئی ہٹ دھرمی سے بولی۔

"طوبیٰ، امی ڈانٹیں گی۔" اس کے کپڑے واقعی بہت برے ہو رہے تھے۔

"ارے نہیں، امی تو خود چاہ رہی ہوں گی کہ برے حال آؤں، آخر تم بڑی ہو گیارہ ماہ، پہلا حق تو تمہارا بنتا ہے۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

طوبیٰ کمرے میں داخل ہوئی تو میں اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ میں نے واضح طور پر ناپسندیدگی اور مایوسی چاروں معزز خواتین کے چہروں پر چھاتے دیکھی۔ میں بڑے متضاد، بڑے عجیب جذبات کے بھنور میں ڈوب کر ابھر رہی تھی کہ جاودانی کا نام سن کر چونکی۔ طوبیٰ نے بھی میری طرف دیکھا۔

"آپ تو جانتی ہوں گی ہمارے بھیا کو؟" زرد سوٹ والی روشن آراء، طوبیٰ سے پوچھ رہی تھی۔ انداز کچھ یوں تھا جیسے پوچھنا چاہ رہی ہو کہ کہاں گھیرا تھا میرے بھیا کو؟

"جی ہاں، ان کے افسانے و غزلیں اخبار و رسائل میں پڑھتی رہی ہوں۔ اچھا لکھتے ہیں۔" طوبیٰ بہت ہی مطمئن و پراعتماد تھی۔

"کبھی ملی نہیں آپ ان سے؟" دوسری بہن جہاں آراء کا لہجہ اور جملہ واضح طور پر قابل گرفت تھا۔ طوبیٰ نے پل بھر کو اس کی آنکھوں میں دلیری سے جھانکا اور پھر بڑی بے نیازی سے بولی۔

"جی نہیں، کبھی اتفاق نہیں ہوا۔"

دونوں بہنوں اور بھاوج کے چہرے پر ایک بے یقینی کا سا عالم تھا۔ اماں جان خاموشی سے فروٹ چاٹ صاف کرنے میں مشغول تھیں اور پھر ہمیشہ کی طرح یہ معزز خواتین بھی سرد لہجوں، مسکراتے چہروں کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔ ان کے گیٹ سے نکلتے ہی امی کا ضبط بھی حدیں پھلانگ گیا۔

"کون تھیں یہ اور یہ تمہارے حوالے سے یہاں تک کیسے آئیں؟"

ان کی سوالیہ نظریں طوبیٰ پر جمی تھیں اور وہ جو بے نیازی کے سارے ریکارڈ توڑتی ہوئی نہایت انہماک سے نمکو کی پلیٹ میں سے مونگ پھلی کے دانے چن رہی تھی، کندھے اچکا کر بولی۔

"میں کیا جانوں، ویسے کیا کلاس کے نمونے تھے، واہ......"

اور چند ہی دن بعد خلاف توقع وہ بقول طوبیٰ، کلاس کے نمونے پھر ہمارے گھر موجود تھے طوبیٰ کے سوالی بن کر۔ اصرار اور عجلت ان کے رویے میں ضرور تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ گرمجوشی نہیں تھی۔

اثر جاودانی معروف شخصیت ہونے کے ناتے اور ٹھیک ٹھاک مستقل ملازمت کے باعث امی و ابو کو پسند تو آئے تھے لیکن وہ چھوٹی کے خواہستگار تھے۔ یہی نکتہ ان کی الجھن کا باعث بنا ہوا تھا۔ میری ذات ان کی قوت فیصلہ سلب کیے دے رہی تھی۔ احساس کے کانچ پہ کہیں خراش تو پڑی لیکن بے سدھ سوئی طوبیٰ کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ شادی زندگی کی بہت بڑی ضرورت سہی لیکن اتنی بھی نہیں کہ اس پگلی کی پہلے ہو جانے پر میں ہسٹیریا کی مریضہ بن جاؤں اور پھر ہم جیسے سفید پوش گھرانے میں لڑکیوں کے ایسے کون سے بے حساب رشتے آتے ہیں کہ جو پہلے بڑی کہہ کہہ کر ناشکری کی جائے۔

تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں نئے دور کی لڑکی ہونے کا ثبوت دوں؟ حقیقت پسند و باحوصلہ، زندگی کے کھردرے، کڑوے رویوں کو حقائق کی آنکھ سے دیکھنے، پرکھنے اور برتنے والی لڑکی اور صبح کچن میں آملیٹ کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے جب میں نے امی سے پوچھا کہ آج جاودانی صاحب کے گھر والے آئیں گے جواب لینے تو آپ کیا کہیں گی؟ تو چائے دانی میں پتی ڈالتے امی کے ہاتھ لحہ بھر ٹھٹک گئے۔ میں نے نگاہ نہیں اٹھائی مگر یقیناً ان کے چہرے پر حیرانی رقصاں تھی۔ وہ گڑبڑا گئی تھیں۔

"آ...... ہاں...... ہاں...... کیوں؟"

مجھے ہنسی آ گئی جسے میں پی گئی۔

"آپ طوبیٰ کے لیے ہاں کر دیجیے۔"

"لیکن......" امی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کہیں۔

"امی! اگر آپ سمجھتی ہیں کہ وہ لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں تو پھر کچھ نہ سوچیے۔" میں انڈا پھینٹتے ہوئے دادی اماں بنی بولے جا رہی تھی۔ "طوبیٰ اور مجھ میں کوئی بہت زیادہ چھوٹائی بڑائی تو ہے نہیں۔"

امی میری غیر متوقع بولڈنیس سے ہڑبڑا کر کچن سے باہر ڈائننگ چیئر پر جا بیٹھیں۔ انہیں یوں گم صم، پریشان دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ کیسی امائیں ہوتی ہیں ہمارے جیسے گھرانوں میں؟

لو بھئی، ہم نے اتنا بڑا معرکہ سر کر لیا اور وہ بوکھلا کر باہر جا بیٹھیں۔ اب یہی چویشن اگر کسی فلمی یا افسانوی سین میں ہوتی تو والدۂ محترمہ یہ موٹے موٹے آنسوؤں کی مالا پہن کر بیٹی کو سینے سے چمٹا لیتیں۔

"نہیں، میری بچی، نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

فرائی پین میں سے گرم تیل کی چھینٹ اڑ کر میرے ہاتھ پہ پڑی تو میں حواسوں میں آ گئی۔

............*......*

ولیمے کی صبح جب ہم سب اس سے ملنے گئے تو اس نئی طوبیٰ کو دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ صرف ایک رات میں شخصیتیں اس قدر تبدیل بھی ہو سکتی ہیں؟ پارہ صفت، چند منٹ ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے والی طوبیٰ نکاح کے وقت تک مجھے اس 'سازش' میں سب سے اہم کردار ادا کرنے والی ہستی سمجھ کر وہ برا بھلا کہتی رہی تھی۔ وہ مجھ سے سخت ناراض تھی اور اب...... صرف ایک رات بعد وہ کس قدر سکون و سلیقے سے بیٹھی دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی۔

"تم ادھر آ جاؤ۔" اس نے اپنے پہلو میں میرے لیے جگہ بنائی۔ طوبیٰ اپنے گھر خوش تھی، اس سے زیادہ مطمئن امی تھیں۔

وہ ایک بھرے پرے بہن بھائیوں کے شور و ہنگاموں سے چھلکتے گھر کی باسی تنہائیوں کے حصار میں جا پھنسی تھی۔ اثر بھائی نے دو ماہ بعد ہی الگ گھر لے لیا تھا مگر شاید ایسی تنہائی کی تمنا سب لڑکیاں کرتی ہوں، تب ہی تو امی نے اس سے ایک مرتبہ بھی تنہائی کا شکوہ نہیں سنا۔ وہ اب بہت گرہستن ہو گئی تھی اور اس کی سنجیدگی، اس پر اچانک وارد ہونے والا سلیقہ و دھیما پن دیکھ دیکھ کر میرا دم الجھنے لگتا۔

"طوبیٰ......! تو خوش تو ہے نا؟" جانے وہ کیا موہوم سا احساس تھا جو مجھے ان کے گھر جا کر، ان دونوں کو دیکھ کر آ گھیرتا تھا۔ اس دن بھی وہ میرے استفسار پر چپاتیاں کپڑے میں لپیٹ کر ہاٹ پاٹ میں رکھتے ہوئے ہنس دی۔

"کیوں بھئی، یہ خیال کیوں آیا؟"

"بس، دراصل تم اتنی سنجیدہ، اتنی ذمہ دار تو کبھی نہ تھیں؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" وہ بکھری چیزوں کو جلدی جلدی سمیٹ رہی تھی۔ "میں غیر ذمہ دار کبھی نہ تھی،

رہی بات سنجیدگی کی تو ایسا ہے کہ اُن کو بکھری چیزیں اگر بری لگتی ہیں تو شخصیتیں بھی ان کو بڑے رکھ رکھاؤ والی پسند ہیں۔"

"لیکن اثر بھائی نے جس طوبیٰ کو پسند کیا تھا' وہ تو کوئی اور ہی تھی' لاپرواہ' اپنے آپ سے......"

"ارے جاناں......" وہ پھیکی سی' جھینپی ہوئی سی ہنسی ہنس دی۔ "اب میں اس حلیے میں تو پہلے کی طرح دوڑنے' چھلانگیں مارنے سے رہی اور پھر......"

وہ باتیں کرتی کچن سے ڈائننگ ٹیبل' ڈائننگ ٹیبل سے کچن کے چکر لگا رہی تھی۔ میز پر پلیٹیں رکھتے ہوئے وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"اور پھر بدلنا بھی تو پڑتا ہے اپنے آپ کو' سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔"

"کیسے سمجھوتے؟ کیسا بدلنا؟" مجھ پر بحث کا بھوت سوار تھا۔

"تم تنہا ہو اپنے گھر میں جیسے مرضی چاہو' رہو' زہر لگ رہی ہو اس قدر سنجیدگی کی چادر لپیٹے ہوئے۔"

وہ کرسی پر بیٹھ کر گہری سی سانس لے کر بولی۔ "اس کو تم سنجیدگی نہیں' سمجھ داری کہو میری بہن! اچھا ہٹاؤ یہ باتیں' آؤ کھانا کھاتے ہیں۔" صاف لگ رہا تھا' وہ بات ٹال رہی ہے۔

"اور اثر بھائی......؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں' عموماً پانچ چھ بجے دفتر سے آجاتے ہیں اور اگر کہیں ادبی نشست' مشاعرہ یا ایسی ہی کوئی تقریب ہو تو پھر کافی دیر بھی ہو جاتی ہے۔ اب میں غیر معینہ مدت تک بھوکی تو رہ نہیں سکتی۔" مسکراہٹ کی مٹھاس میں لہجے کی کھردراہٹ خاصی واضح تھی۔

"چلو کوئی بات نہیں' رات کو ہی ان سے گپ شپ رہے گی۔"

"رات کو؟" منہ کی طرف جاتا ہوا اس کا ہاتھ کچھ ٹھٹک گیا۔

"ہاں' میں آج رات رہوں گی۔ تو' تو اتنی بے مروت نکلی طوبیٰ! کہ کبھی کہا ہی نہیں کہ ایک رات رہ جاؤ' تجھے کیا پتہ بدتمیز' کہ اب تیرے بغیر وہ کمرہ مجھے کیسا کاٹنے کو دوڑتا ہے۔" میں اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔ اچار کا چٹخارہ بھرتے ہوئے میری نگاہ اس کے چہرے پہ پڑی جو زرد ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا طوبیٰ؟" میں گھبرا گئی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے پانی کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرانا چاہا۔ "چکر سا آجاتا ہے کبھی کبھی۔"

"ڈاکٹر کو بتایا؟" میں نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

"ہاں' جاتی ہوں چیک اپ کے لیے' کل بھی جانا ہے۔"

"تو چلو' کل میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔"

اور میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے طویل قیام کے پروگرام کا سن کر خوش نہیں ہوئی لیکن ایسے میں اس کو تنہا' بیمار چھوڑ کر تو اگر مجھے وہ دھکے بھی دیتی' تب بھی میں نہ جاتی۔

کھانے کے بعد اس کو لٹا کر میں نے برتن دھوئے' کچن ہی کیا' پورا گھر طوبیٰ کی محنت' سلیقے' صفائی پسندی کا منہ بولتی تصویر تھا۔ میرے کرنے کو کوئی کام نہ تھا' میں واپس کمرے میں آئی تو وہ بے خبر سو رہی تھی۔ بستر پہ لیٹتے ہی گہری نیند سو جانا ہمیشہ سے طوبیٰ کی عادت تھی۔ میں نے دو قدم آگے بڑھ کر اسے دیکھا' اس کا چہرہ مرجھا سا گیا تھا' رنگت بھی زرد سی ہو رہی تھی لیکن سرخ لپ اسٹک' پھیلے پھیلے کاجل نے چہرے کو بڑی سوگوار سی دلکشی بخش دی تھی۔ میں پنکھا تیز کر کے آہستگی سے دروازہ بند کر کے لاؤنج میں بچھے تخت پہ جا لیٹی اور قریب میز پر سلیقے سے رکھے ان رسالوں کو دیکھنے لگی جن میں اثر بھائی کی غزلیں' افسانے' مضامین شائع ہوئے تھے۔ ان کے ہر شعر' ہر افسانے کی اوٹ سے اعلیٰ معاشرتی اقدار کا علمبردار انسان جھانکتا تھا لیکن وہ طوبیٰ کا زرد چہرہ' پھیلا کاجل' بھاری پردوں کے باعث لاؤنج میں خنک اندھیرا سا تھا' پنکھے کی موہوم آواز' آناج کا آرام دہ نشست' میری پلکیں بھاری ہونے لگیں۔ آنکھ کھلی تو دیکھا' طوبیٰ مدہم آواز میں ٹی وی آن کیے گیت کے بولوں کے ساتھ ہونٹ ہلا رہی تھی' ایک پاؤں بھی ہل رہا تھا' کھلے ہوئے نم بال' آنکھوں میں کاجل کی دلربا تحریر' ہونٹوں پہ سرخی مائل گلابی لپ اسٹک۔ "اللہ......! یہ طوبیٰ کس قدر حسین ہو گئی ہے' صدف سے نکلے موتی کی مانند آبدار۔" میں نے دل ہی دل میں اسے سراہا۔

"چلو' جلدی سے نہا کر آؤ' چائے تیار ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

باتیں کرتے' ٹی وی دیکھتے' نئی پرانی تصویریں دیکھتے وقت کا اندازہ ہی نہ ہوا' گھڑی پر نگاہ گئی' ساڑھے آٹھ ہو گئے۔

"اثر بھائی نہیں آئے طوبیٰ؟" مجھے پریشانی ہونے لگی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا' پریشانی کا نہ انتظار کا' میں ٹی وی کے سامنے الجھے ہوئے منتشر ذہن کے ساتھ بیٹھی تھی اور طوبیٰ گنگناتے ہوئے روٹیاں ڈال رہی تھی۔

"یا اللہ! گورنمنٹ آفسوں میں اتنی دیر تک کون کام کرتا ہے؟" وحشت ناک خیالوں کے بگولے ذہن میں چکراتے پھر رہے تھے اور میز پہ کھانا لگاتی طوبیٰ کا اطمینان مجھے دیوانہ بنائے دے رہا تھا۔

"اقصیٰ......! آؤ کھانا کھالو۔"

وہ پلیٹ اپنے سامنے رکھے میری منتظر تھی۔ خبرنامہ شروع ہو چکا تھا' میں ٹی وی کی آواز کم کر کے اٹھ گئی۔ جی چاہ رہا تھا' طوبیٰ کو جھنجھوڑ کر رکھ دوں' تھپڑ لگاؤں اس کو' یہ کن عذابوں کو سہہ رہی ہے' بتاتی کیوں نہیں؟ یہ کیسا مصلحتوں کا جنگل دو بہنوں کے بیچ اگ آیا ہے کہ وہ بتاتی نہیں؟ میں پوچھتی نہیں' الفاظ اس جنگل میں اپنا راستہ کھو جاتے ہیں' وہ بڑی ہشاش بشاش' بے پرواہ' مطمئن نظر آنے کی کوشش میں زور زور سے ہنس رہی تھی' زور زور سے بول رہی تھی' میرے منع کرنے کے باوجود بار بار میری پلیٹ بھرے جا رہی تھی۔ کھانے کے بعد چائے پیتے' اس کی شادی کی بے شمار بار دیکھی ہوئی موری دیکھتے ہنستے' باتیں کرتے پونے بارہ ہو گئے۔

"طوبیٰ......! اثر بھائی......"

"اب تم ایسا کرو کہ سو جاؤ۔" طوبیٰ نے میری بات یوں کاٹی گویا سنی ہی نہ ہو۔

"میں کم از کم فجر اور عشاء کی نماز ضرور پڑھنا چاہتی ہوں۔ تم جاگتی رہو گی تو میں نماز نہ پڑھ سکوں گی۔"

"کیوں' میں شیطان ہوں کیا؟" میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے بہت پیار سے میرا رخسار چھوا۔

میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں سونے چلی گئی جو اثر بھائی کے لکھنے پڑھنے کے لیے مخصوص تھا۔ رائٹنگ ٹیبل' چند کتابوں سے بھرے شیلف' دو کرسیوں کے علاوہ اس میں ایک سنگل بیڈ بھی پڑا تھا۔ میں نے شیلف میں سے ایک کتاب منتخب کی اور بستر پر لیٹ گئی۔

عجیب سے شور سے میری آنکھ کھل گئی' میں شاید پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔ طوبیٰ نے ہی غالباً مرکزی

لائٹ بند کر کے زیرو پاور کا بلب جلا دیا تھا اور ہلکی چادر میرے اوپر ڈال دی تھی لیکن آوازیں...... میں چادر پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پلیز اثر' آہستہ۔ پلیز۔'' یہ طوبیٰ ہی تو تھی مگر وہ یوں گڑگڑانے' التجا کرنے والوں میں سے کبھی نہ تھی پھر میں نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی۔

''کیوں' کیوں آہستہ بولوں؟'' لڑکھڑاتی زبان' ڈولتے قدم بے قابو' آگے پیچھے جھولتے ہاتھ' چڑھی ہوئی سرخ انگارہ آنکھیں تو یہ ہے اثر جاودانی؟ میری روح جیسے دھیرے دھیرے سلب ہو رہی تھی جہاں کی تہاں تکتی رہی۔ وہ چلا رہا تھا۔

''تو ہوتی کون ہے مجھے چپ کرانے والی؟ یہ میرا گھر ہے' میرا' میری مرضی' چیخوں یا چلاؤں۔''

''اقصیٰ آئی ہوئی ہے' سو رہی ہے۔'' طوبیٰ سراپا التجا تھی۔

''اوہ...... اوہ......'' وہ ڈولتا' ڈگمگاتا' ایک جھٹکے سے طوبیٰ کو سامنے سے ہٹاتا' (شاید اپنے تئیں روندتا)' اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ ''اچھا تو یوں کہو' آدھی گھر والی آئی ہے۔'' بڑی خوفناک ہنسی تھی اس کی یا مجھے محسوس ہوئی۔ میرے حواس گم ہو رہے تھے اور وہ میری بہن لاؤنج میں تنہا کھڑی بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ والدین سایہ دار درخت اس لیے تو نہیں لگاتے کہ لڑکیاں سوکھے پتوں کے ڈھیر میں دب جائیں؟ طوبیٰ آنسو پونچھ کر میرے کمرے کی طرف بڑھی' شاید وہ اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ میں سو رہی ہوں اور مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ اس وقت اس کا سامنا کر سکوں' میں بستر کی طرف لپکی اور پل بھر میں سوتی بن گئی۔

بند آنکھوں کی جھری سے میں نے روشنی کی دودھیا لکیر کمرے میں داخل ہوتے دیکھی اور پھر طوبیٰ...... وہ میرے قریب آئی' جھک کر دیکھا' سیدھی ہوئی اور گہری سانس لے کر باہر نکل گئی۔

ڈگمگاتے قدم' ڈولتا وجود' سرخ آنکھیں میں نے پڑھی ضرور تھیں' دیکھیں پہلی مرتبہ...... بڑا خوفناک امیج ہوتا ہے شرابی کا ہم جیسے لوگوں کے نزدیک۔ اچانک ہی غیر محفوظ ہونے کا احساس شدت سے جاگا اور میں نے اٹھ کر دروازے کی کنڈی چڑھا دی' کھڑکیوں کی کنڈیاں چیک کیں' گھڑی دیکھی' پونے دو ہو رہے تھے۔ میں سراپا غم و غصے' افسوس و بے چارگی کے الاؤ میں سلگ رہی تھی۔

میں کمرے سے ملحق سڑک کے رخ بنی بالکونی میں ننگے پیر آ کھڑی ہوئی' نظر دور راؤنڈ اباؤٹ میں بنی فوجی چوکی پر گئی' تازی تازی سفیدی چمک رہی تھی۔ میرے ذہن میں انگارے چٹک رہے تھے۔

'کیا یہ ساری تدابیر شرفاء کے لیے ہوتی ہیں؟ اثر جیسے لوگوں کے پاس سلیمانی ٹوپی کہاں سے آ جاتی ہے؟' وہ اپنی خباثتوں کی چادر میں لپٹا بے خبر سو رہا ہوگا اور طوبیٰ...... یقیناً اس کا تکیہ مسلسل بھیگ رہا ہوگا' آنسوؤں کے سارے ستارے وہ شب کی سیاہ چادر میں ٹانک دے گی اور صبح اس کی آنکھوں میں کاجل ہنس رہا ہوگا' رخسار کا غازہ اور ہونٹوں کی لالی مسکرائے گی اور وہ...... ''میں بہت خوش ہوں۔'' کی تفسیر بنی معمول کے کاموں میں مصروف ہوگی۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے جھرنے کی خاموش آواز نے مجھے بقیہ رات پلک نہ جھپکنے دی اور صبح ہوتے میری پلکیں من من بھر کی ہو گئیں۔

صبح طوبیٰ کے پکارنے اور دستک دینے کی آوازوں سے میں بیدار ہوئی۔ دروازہ کھولنے پر تر و تازہ طوبیٰ میرے سامنے تھی' آنکھوں میں کاجل کی حسین تحریر' ہونٹوں پر گلابوں کی سرخی' بال سلیقے سے سنورے ہوئے خوش رنگ و خوش لباس ٹیلکم پوڈر [illegible] ملی جلی خوشبو میں نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا [illegible]

''ساڑھے نو ہو رہے ہیں میم صاحب۔'' اس [illegible] بھری سرزنش کی۔ ''اثر کب سے بیٹھے ناشتے [illegible] انتظار کر رہے ہیں۔''

''اثر......؟'' میں گم صم ہو گئی۔

''اقصیٰ......! سو رہی ہو کیا؟'' وہ چادر تہہ کرتے [illegible] مجھے ساکت کھڑے دیکھ کر بولی۔ میں جلدی [illegible] باتھ روم میں گھس گئی۔

ناشتے کے لوازمات سے بھری میز کے سامنے وہ [illegible] اخبار کے مطالعے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر [illegible] شائستگی سے مسکرایا' کھڑے ہو کر میرا سواگت کیا' [illegible] تو وہ قطعاً نہ تھا' سلیقے کے لباس میں' نک سک [illegible] درست' مسکراتا' مہذب انسان' یہ وہ رات والا [illegible] تو نہ تھا۔ میرے اللہ! یہ دونوں میاں بیوی کس [illegible] ڈرامہ باز ہیں۔

''مجھے پتہ ہوتا کہ آپ آئی ہوئی ہیں تو میں کل جلدی آنے کی کوشش کرتا۔'' وہ نہایت عاجزی سے معذرت کر رہا تھا' اپنے دیر سے آنے کے جواز [illegible] کر رہا تھا' نئے ڈائریکٹر' دفتر کے از سر نو تنظیم' [illegible] کام کی زیادتی کا ذکر کر رہا تھا۔ دل چاہا' اس کی بے [illegible] اس کا کالر پکڑ کر پوچھوں' ہر پل نیا چہرہ سجا [illegible] اور اس خوبی سے سجا لینے کا فن کہاں سے سیکھا؟ [illegible] اس نے ہنس کر۔ ''ارے' کوئی بات نہیں۔'' [illegible] میں اپنے آپ کو کس قدر احمق بلکہ [illegible]

''[illegible] بھی میرا جانا ضروری ہے۔'' وہ میری [illegible] آملیٹ ڈالتے ہوئے اطلاع دے رہا [illegible] اتنا میرے اختیار میں ہے کہ آپ کے [illegible] دو گھنٹے لیٹ جاؤں گا۔'' وہ طوبیٰ سے [illegible] تھا' مجھ سے میرے گیارہ ماہ بڑے ہونے کا پورا احترام برتتے ہوئے شائستگی سے مذاق کر رہا تھا' میری دلچسپی کی باتیں کر رہا تھا' اس نے اپنی دو نئی غزلیں بھی سنائیں۔ طوبیٰ کو چائے پینے سے منع کرتے ہوئے خود اٹھ کر کچن سے گرم دودھ کے مگ میں اوولٹین ڈال کر لایا۔ طوبیٰ کے غمزے' اثر کی دلداریاں دیکھ دیکھ کر میری عقل خبط ہوئی جا رہی تھی۔ 'کیا میں نے رات کو کوئی ڈراونا خواب دیکھا تھا؟' طوبیٰ برتن سمیٹ کر اب کچن میں کھٹر پٹر کر رہی تھی اور اثر مجھے جدید افسانے' جدید ادبی رجحانات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ گفتگو کے دوران حسب معمول انہوں نے سگریٹ سلگانے کی اجازت چاہی' دھوئیں کے مرغولوں' عینک کے عدسوں سے جھانکتی سوچتی گہری آنکھیں۔

''اف خدایا! ان میں تو رات والی وحشت ناک آنکھوں کی شبیہ تک نہ تھی؟''

ساڑھے گیارہ بجے وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک دو دن اور رک جانے کا اصرار کرتے ہوئے میں نے معذرت کی تو کہنے لگے۔

''اچھا' میں پوری کوشش کروں گا جلدی آنے کی۔'' وہ بیڈروم میں گیا تو طوبیٰ بھی پیچھے پیچھے لپکی۔ مجھے پتہ تھا' یہ غیر اخلاقی حرکت ہے لیکن میرا وجود کان بن گیا اور میں کرسیاں ٹھیک کرنے کے بہانے کھڑکی کے قریب چلی گئی' کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں' بھاری پردے گرے ہوئے تھے۔

''میں اسپتال جاؤں گی آج چیک اپ کے لیے۔'' طوبیٰ کی دھیمی سی منمناتی آواز تھی۔

''اچھا پھر؟'' وہ شاید بریف کیس چیک کر رہا تھا۔

''پیسے چاہئیں کچھ؟'' کیسا بھکاریوں جیسا لہجہ تھا طوبیٰ کا۔

''یہ تو صرف پچاس ہیں؟'' دوبارہ سنائی دینے والی یہ فریادی لے طوبیٰ ہی کی تھی۔

''تو پھر؟'' (اف اتنی رعونت؟)

''ابو بھی آئیں گے آج۔ اقصیٰ بھی بہت دن بعد آئی ہے۔''

(میری بہن! کیا تو واقعی اتنی بے بس ہے؟)

''تو؟ ابو ہی آئیں گے' کوئی گورنر تو نہیں آئیں گے جن کے لیے دیگیں چڑھیں گی؟'' میں چکراتا' کھولتا دماغ لیے صوفے پر آ بیٹھی۔

ماں باپ لڑکی کی پیدائش پر شاید افسردہ نہیں ہوتے' اس کی قسمت پر اس کے ان دکھوں پر روتے ہیں جو اسے آیندہ ملنے ہوتے ہیں۔ میں اخبار میں منہ دیئے نارمل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اچھا اقصیٰ جی......! اللہ حافظ!'' وہ بریف کیس تھامے مسکراتا ہوا کمرے سے برآمد ہوا۔

''اللہ ہی حافظ!'' میں زیرلب بڑبڑائی اور مسکراتی ہوئی اٹھ کر دروازے تک آئی یہ سوچتے ہوئے کہ اگر ہم خواہ مخواہ کی مصلحت آمیز منافقتیں چھوڑ دیں اور کھرے سچ کو اپنا لیں تو کیا ہمارے دکھوں کا دورانیہ سمٹ نہیں جائے گا؟

''کیا پکاؤں اقصیٰ؟'' میں نے پلٹ کر دیکھا' طوبیٰ میرے پیچھے ہی کھڑی تھی' ہنستا کاجل' دمکتی سرخی' میرے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔

''طوبیٰ......!'' میں نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھے اور اسے ایک جنون کے عالم میں جھنجھوڑ ڈالا۔ ''تو کب تک اذیتوں کے جنگل میں تنہا بھٹکتی پھرے گی؟ کسی کو تو شریکِ غم کر لے میری بہن......!''

وہ چند ثانیے ایک ٹک میرا چہرہ تکتی رہی اور پھر وہ مجھ سے لپٹ کر بے طرح بلک اٹھی۔

تنہائیوں میں تکیے جب بھیگتے ہیں تو لاشعور کی کسی تہہ میں احساسِ بے چارگی کا لاوا دھیرے دھیرے کھولتا رہتا ہے' انسان کی شخصیت بے آہنگی سے ریزہ ریزہ ہوتی رہتی ہے لیکن جب کسی کا کاندھا میسر آ جائے تو تنہائی کے ہر نوک خار پہ نرم پتیوں کے پھول کھل اٹھتے ہیں' ہر پھول ایک خوشبو بکھیرتا ہے۔ 'میں تنہا نہیں' میں تنہا نہیں۔' اور احساس کس قدر جاں فزا ہوتا ہے کہ میں تنہا نہیں لیکن ایسا کیوں ہوا؟ جب وہ ذرا پرسکون ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''ایسا اچانک ان آٹھ ماہ میں تو نہیں ہو گیا؟'' اس کی آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔ وہ ایسا ہی تھا' بگڑے بیٹوں کی مائیں جانے نوخیز دلہنوں سے یہ توقع کیوں کر لیتی ہیں کہ وہ آتے ہی جادو کی چھڑی گھمائیں گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا جبکہ ٹھیک کچھ بھی نہیں ہوتا' پہلے ایک فرد ایک تنہا فرد تباہ ہو رہا ہوتا ہے لیکن پھر ایک پورے خاندان' پورے معاشرے کی بربادی شروع ہو جاتی ہے اور اقصیٰ......!'' وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ''میرا بچہ......! میں اسے کیسے بچاؤں گی؟'' چند گھنٹے بعد ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مار کر از سرِ نو سنگھار کر کے وہ پھر وہی طوبیٰ بن گئی۔ ابو آئے تو وہ بہت ہشاش بشاش تھی۔ وقتِ رخصت ابو آ کے چلے گئے تو اس نے میرا ہاتھ تھام کر التجا کی۔

''امی کو کچھ نہ بتانا' کچھ نہ کہنا ان سے' تجھے میری قسم!''

وہ مجھے اتنی بڑی قسم نہ دیتی' تب بھی مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ میں امی سے پوچھتی کہ پتے زرد کیوں ہو جاتے ہیں؟ درخت اپنے پتوں کا کفن کے پہنا دیتے ہیں؟

•......•......•......•

وقت کا پرندہ اڑان بھرتا رہا' میں اپنے گھر کی

...طوبیٰ اس دکھ والی فضا میں بیوی سے ماں بن ... اولاد کے دکھ سکھ بن کہے جان لیتی ... صرف ایک ہی بیٹا ہے' آ جا میرے گھر ... کے دروازے تیرے لیے وا ہیں۔ میں ... کروں گی کہ یہ زیادتی جو مجھ سے ہوئی' اس کا ... کر سکوں۔

امی کے بارہا کیے اصرار کے جواب میں طوبیٰ ... یہ ہی کہا کہ یہ زیادتی آپ کی نہیں' تقدیر کی ... اور امی جی! بچے کے لیے ماں باپ دونوں ہی اہم ہیں۔ باپ کے ہوتے ہوئے میں اسے ... باپ کا کیسے کر دوں؟ بڑا حوصلہ' بڑا عزم تھا اس ... لہجے میں اور حوصلوں کا کیا ہے' کبھی دکھوں و مصائب کے پہاڑ بھی ان کو نہیں زیر کر سکتے اور کبھی ایک ننھی سی بات آتش فشاں بن جاتی ہے۔

چار سال بھی تو پورے نہ ہوئے تھے کہ وہ ... آ موجود ہوئی۔

اور پھر مجھے سسرال میں اطلاع ملی تب اسے آئے ہوئے دو دن گزر چکے تھے۔ میں بھاگم بھاگ امی کے گھر پہنچی تو وہ سر سے پیر تک چادر تانے سو رہی تھی۔

''طوبیٰ......!'' میں نے بے صبری سے اس کے چہرے سے چادر کھینچی۔

''ہائے' تو......'' وہ اچھل کر مجھ سے لپٹ گئی اور پھر دو قدم پیچھے ہٹ کر مجھے ناقدانہ نظروں میں تول رہی۔ ''موٹو...... یہ کیا ہو گیا تجھے؟''

''میرے مٹاپے کو ڈالو چولہے میں......'' میں چڑ گئی۔ ''تم بتاؤ' تم کیا کارنامہ کر آئی ہو؟''

''کیا' کیا کر آئی ہوں؟'' وہ اطمینان سے صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

''بچے' بچے کیوں چھوڑ آئی اس کے پاس؟'' میرا صبر جواب دے گیا تھا' میں چیخ پڑی۔ تین سالہ حسن' سوا سالہ ننھی کرن کی معصوم صورتیں میری آنکھوں میں ٹھہر گئی تھیں۔

''تو بھی سمجھتی ہے' میں خوشی سے ایسا کر آئی ہوں؟'' اچانک اس کی آنکھوں کے کٹورے لبریز ہو گئے۔ ''محبت کی تنگی' سچ جانو' برداشت کر لی جاتی ہے لیکن روپے کی تنگی جب بچوں کا ساتھ ہو اور بچوں کے باپ کی جیب بھری ہو' تب یہ تنگی برداشت نہیں ہوتی۔ اعزاء و احباب کے سامنے' مہمانوں کے سامنے میں ذلت برداشت کر رہی تھی' اپنی خواہشوں کی بساط ضرورتوں کی چادر میں نے سمیٹ لی تھی لیکن اپنے بچوں کی ضرورتیں' ان کی معصوم خواہشوں کا گلا میں اس لیے نہیں گھونٹ سکی کہ ان کے باپ کی جیب آوارہ عورتوں اور نشے کی آگ ٹھنڈا کرنے کو ہر لمحہ بھری رہتی تھی۔ میں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا' ضرورتوں کو امکان کی آخری حدوں تک سمیٹ لیا مگر کتنا؟ کب تک؟ بہت مجبور ہو کر ایک آس کا جھلملاتا دامن تھام کر میں لیاقت بھائی کے پاس پہنچی' لیاقت بھائی' اشر کے بہت ہی قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے کہا کہ صرف ایک صورت ہے' آدمی کی غیرت پر ضرب پڑتی ہے تو اس کی شعور کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

اس روز دونوں بچوں کو میں نے برابر والے فلیٹ میں نیک دل خاتون کے پاس چھوڑا' شوخ رنگ کا لباس پہنا' ہاتھوں میں گجرے' کانچ کی چوڑیاں' نگینوں والی انگوٹھیاں سجائیں' میک اپ کیا' تیز خوشبو میں اپنا آپ بسایا اور لیاقت بھائی کا لایا ہوا برقع پہن لیا۔ خدا معلوم' بقیہ سلسلے لیاقت بھائی نے کیسے' کیونکر ترتیب دیئے۔ ممکن ہے' وہ بھی اشر کی سرگرمیوں میں شریک رہتے ہوں۔ بہرحال سب کچھ بڑے سہل انداز میں ہوتا گیا۔ اس

راؤنڈ اباؤٹ سے ذرا ہٹ کر میں نقاب ڈالے کھڑی تھی کہ اثر کی سفید سوزوکی سوئفٹ میرے قریب آ کر رکی' اگلا دروازہ کھلا' وہ میرا شوہر ہی تھا' میرا محرم' آج میرا خریدار بن کر تپاک سے میرے لیے دروازہ کھولے 'اسٹیئرنگ پہ جھکا پُراشتیاق نظروں سے میرے بیٹھنے کا منتظر تھا۔ بیٹھ کر میں نے دروازہ بند کرلیا۔ میرے وجود سے اٹھتی تیز خوشبو نے اسے شاید سرشار کردیا تھا۔

"پہلے کہیں بیٹھ کر کچھ کھاتے ہیں' کیا خیال ہے؟" وہ مجھ پر جھکا جا رہا تھا۔ اس کی وارفتگی دیکھ دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار مار کر رو دوں۔

"نہیں۔" میں نے خود پر قابو پا کر بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "پہلے ہم ساحل سمندر چلیں گے' مجھے سمندر بہت پسند ہے۔"

"جو حکم حضور کا۔" اس نے مسکرا کر سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور گاڑی کی رفتار تیز کردی لیکن اس کی نظریں میرے پیروں سے ہوتی ہوئی میرے سراپا کو ٹٹولتی میری نقاب سے آ لپٹیں۔ میں نے اڑتی نقاب کو مضبوطی سے تھام لیا تھا اور پھر اس نے حسب توقع نقاب اٹھانے کی فرمائش کردی۔

"نہیں' ساحل کے کسی سنسان گوشے میں اور پھر اس کمرے میں۔" میں نے نہایت ہی دلربائی سے کہا۔

کالج کے زمانے کی اداکاری یہاں کام آ رہی تھی۔ میں اس کی آتشِ شوق کو بھڑکا کر طوفان بنا دینا چاہتی تھی' میرا خیال تھا کہ وہ جس قدر بے تاب ہوگا' اسی قدر شرمندہ ہوگا لیکن جب ڈوبتے سورج کی نارنجی روشنی میں' میں نے نقاب الٹی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ چند لمحے تو مجھے گمان گزرا کہ اس پر سکتہ ہوگیا ہے' ایک بپھری ہوئی موج ہمیں گھٹنوں گھٹنوں تک بھگو گئی تو اسے ہوش آیا۔

"کمینی...... ذلیل...... بے غیرت......"

وہ سمندر کی مانند بپھر اٹھا' میرا ہاتھ تھام کر
ہوا گاڑی تک لایا اور مجھے گاڑی میں دھکیل کر
نے ہونٹ بھینچ کر جو طوفانی ڈرائیونگ کی تو فلیٹ
کمپاؤنڈ میں ہی آ کر رکا' اوپر فلیٹ میں پہنچ کر
نے وہ ایک لفظ تین مرتبہ اس حقارت سے دہرا
گویا ان چار برسوں میں کی گئی بدکاری کی
سیاہی میرے منہ پر انڈیلے دے رہا ہو......

"اپنے بچے اٹھاؤ اور دفعان ہوجاؤ یہ
سے......"

اب تک میں یوں پانسا پلٹنے پر دم بخود تھی
اس ایک حکم نے دفعتاً میرے تن بدن کو سلگا کر
دیا۔

"اثر جاودانی صاحب......" میں چلائی۔
بچے میں جہیز میں نہیں لائی تھی' یہ تحفہ تو تم نے مجھے
تھا' آج یہ تحفہ میں تم کو لوٹاتی ہوں' تمہیں مبارک
ہوں یہ تمغے' سینے پر سجاؤ ان تمغوں کو اور زمانے
داد وصول کرو اپنی مردانگی کی لیکن اقصیٰ......!"
مجھ سے لپٹی بلک رہی تھی۔ "عورت کو اللہ میاں
ایسا کیوں بنایا ہے؟ بے درد بے گھر' بھرے دا
ہاتھ تہی' باپ کا گھر' بھائی کا گھر' شوہر کا گھر' بیٹے
گھر' سب گھر اس کے لیے موم کے ہی کیوں ثابت
ہوتے ہیں؟ پچھتاوے کسی حال میں اس کا ساتھ
کیوں نہیں چھوڑتے؟ ضدی بچے کی طرح زندگی بھی
اس کے پیچھے پیچھے ہی گھومتے ہیں' کیوں؟ آخر
کیوں؟"

وہ پہلی مرتبہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور میرے پاس تسلی کے دو بول بھی نہ تھے جو میں اس کی خالی جھولی میں ڈال دیتی۔ کیا آپ کے پاس ایسے کچھ بول ہیں جو طوبیٰ کے لیے تسلی اور ڈھارس کا باعث بن سکیں؟؟؟

محمد عزیز

وہ نقشِ پا...... میں خاکِ پا

محسن بھٹی کا خیال

رنگوں کا میرے دل میں ہے میلہ لگا ہوا
یادوں سے تیری کیسے کنارا کریں گے ہم

ایک معروف ساز کار کی اپنے عظیم مرحوم استاد سے جڑی یادداشتیں





میں علی الصبح جب ڈیفنس کے بنگلوں میں ڈبل روٹی بانٹنے جاتا تھا تو گھر گھر ڈبل روٹی دے کر فارغ ہو کر صبح آٹھ بجے واپس بیکری آ جاتا پھر وہاں سے کچھ ڈبل روٹی، انڈے لے کر ریڈیو پاکستان، حیدرآباد میں کینٹین کی طرف چلا جاتا۔ اسٹیشن پر اندر فنکاروں کی مخصوص بیٹھک ہوتی تھی۔ میرے استادِ محترم بلاول بلیجم وہیں سوئے پڑے رہتے تھے۔ میں ان کو نیند سے بیدار کرتا۔ جب ان کو گہری نیند سے جگاتا تو میری دو چار آوازیں سننے کے بعد چڑ کر کہتے۔ ''ہاں بابا، کیا ہے؟''

میں کہتا۔ ''بابا، اٹھو، ناشتا کرو۔ ڈبل روٹی والا آ گیا ہے۔'' پیار میں وہ مجھے اسی نام سے پکارتے تھے اور وہ کہیں بھی ہوں، جیسے ہی دور سے نظر پڑتی، فوراً کہتے۔ ''ڈبل روٹی والا آ گیا۔ آ گیا میرا ڈبل روٹی والا۔''

نیند سے جیسے ہی بیدار ہوتے، میں انہیں واش روم لے جاتا، نہلاتا دھلاتا پھر بڑے تولیے میں لپیٹ کر انہیں چارپائی پر بٹھاتا، چونکہ میری شاگردی کے اس زمانے میں ان کے دمے کا عارضہ زور پکڑ چکا تھا جس کی وجہ سے ذرا سا بھی وہ ہلتے جلتے تھے تو ان کا دم اکھڑنے لگ جاتا تھا۔ انہیں چارپائی پر بٹھانے کے بعد میں ان کو خوب پاؤڈر شاؤڈر لگاتا تو معطر معطر ہوتے ہی مجھے بڑی دُعائیں دینے لگتے۔ ان کو تیار کرنے کے بعد پھر میں کینٹین چلا جاتا، وہاں سے ڈبل روٹی سینک کر اور انڈا آملیٹ وغیرہ بنا کر ان کے سامنے لا کر رکھ دیتا۔ چائے پی لیتے تو میں ان سے کہتا۔

''استاد! اب آپ کی بھی چھٹی اور میری بھی، آپ اندر ریڈیو میں کام دام پر جائیں اور میں بھی ڈیوٹی پر جاتا ہوں۔ اس طرح کبھی تو وہ اندر اسٹوڈیوز کی طرف چلے جاتے یا گول بلڈنگ کے پاس استاد خیر محمد کی بیٹھک پر جا کے بیٹھتے۔

خیر، دن میں استاد کی اور میری کہانی اسی طرح چل رہی تھی۔ رات گیارہ بجے میں پھر ان کے لیے کچھ نہ کچھ لے جاتا، کبھی کبھی کہتے۔ ''میں شام کو بھی نہاؤں گا۔''

تو میں کہتا۔ ''نہاؤ استاد! بالکل نہاؤ۔''

اس طرح گرمیوں کے دنوں میں وہ دو دو بار بھی نہاتے اور میں اسی طرح ان کو نہلاتا اور پاؤڈر شاؤڈر لگاتا۔

میں یہاں ان کے لاہور جانے اور وفات سے پانچ چھ سال پہلے کی کہانی آپ کو بتا رہا ہوں۔ میری اس تیمارداری اور خدمت کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھے دعائیں دیتے ہوئے کہتے تھے۔

''اڑے، ڈبل روٹی والے ماسٹر...... تو مجھے کہاں سے مل گیا ہے یار؟ کچھ سال پہلے کیوں نہیں ملا؟'' پھر دعائیں دیتے ہوئے کہتے۔ ''دیکھنا عزیز، میری دعاؤں کے طفیل تو اچھے اچھے پلیٹ فارموں سے گزرے گا، اچھے اچھے اسٹیج کرے گا جو لوگوں کو نصیب نہیں ہوتے اور تو لوگوں کے دلوں میں جگہ پائے گا، تیرا بڑا نام ہوگا۔''

ان کی ایسی باتوں پر میں ہنس کر کہتا۔ ''میری کیا اوقات استاد! آپ کیوں میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟'' جواباً کہتے۔ ''تو مان یا نہ مان عزیز، میری دعاؤں کا اثر ایک دن ہو کے رہے گا۔''

استاد کی ان دعاؤں نے واقعی رنگ دکھایا اور مجھے واقعی بڑے بڑے اسٹیج پرفارمنس کے لیے نصیب ہوئے مثال کے طور پر شاہ لطیف سائیں، حضرت قلندر لال شہباز، آرٹس کونسل، کراچی، حیدرآباد اور وطنِ عزیز کے دیگر بڑے بڑے اسٹیجوں پر میں اب تک سولو پرفارمنس دے چکا ہوں اور یہ بھی میرے استاد بلاول بلیجم ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ مجھے سال 2007ء، وادیٔ مہران کا سب سے بڑا اعلیٰ ایوارڈ ''شاہ لطیف ایوارڈ'' اور ابھی گزشتہ دنوں حضرت لال شہباز قلندر کے عرس کے موقع پر ''شہباز ایوارڈ'' عطا کیا گیا ہے۔ استاد نے جو مجھے دعائیں دیں یا میری جو تربیت کی، میں اُن کے احسانات کا بدلہ چکا ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ استاد کے انتقال کو اکتیس، بتیس سال ہو رہے ہیں مگر میں اب تک ان کو نہیں بھولا اور ہر دن کے چوبیس گھنٹوں میں وہ مجھے کسی نہ کسی بہانے ضرور یاد آتے ہیں اور میں ان کے نام کی مالا جپنے لگ جاتا ہوں، ویسے بھی میں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ اپنی زندگی میں اپنے دو محسنوں سیٹھ کمار تھادانی اور استادِ محترم بلاول بلیجم کو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولوں گا۔

مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا تھا تو گول بلڈنگ کے آس پاس کے دوستوں سے میں نے استاد بلاول بلیجم اور ان کے بینجو بجانے کی تعریف سنی تھی، یہاں ان کو دیکھنے اور سننے کی جستجو شروع ہو گئی۔ حیدرآباد میں قیامِ پاکستان کے بعد ہماری رہائش [illegible] روڈ پر تھی، یہیں ہمارے بابا محمد نذیر نے اپنی بیکری قائم کی۔ جے پور، بھارت میں بھی یہی ذریعۂ معاش تھا۔ وہاں بڑے بڑے راجوں، مہاراجاؤں کے یہاں ہماری بیکری کی ڈبل روٹی جاتی تھی۔

حیدرآباد کے معروف بزرگ شاہ سائیں کا مزار ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔ پتہ چلا، استاد بلاول ان کے میلے میں پرفارم کرنے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ اس زمانے میں حاجی شاہ سائیں کے میلے میں بڑے بڑے گویے بھی آتے تھے اور ہم ان کو میلوں میں دیکھنے اور سننے بھی جاتے تھے۔ استاد بلاول بلیجم کو بھی بالآخر میں نے اسی میلے میں جا کر دیکھا۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں ہی استاد فدا حسین خان، استاد نیاز حسین موسیقار، فقیر عبدالغفور، استاد محمد ابراہیم، استاد محمد جمن، محمد یوسف، یہ سب جانے پہچانے اور یہاں کے ہر دل عزیز فنکار سمجھے جاتے تھے۔ استاد بلاول بلیجم کو بھی میں نے اسی میلے میں ان سب کے ساتھ دیکھا۔ جب بینجو بجانے بیٹھے تو محسوس ہوا، یہ تو محفل پر جادو کر رہے ہیں۔ میں بڑی حیرت سے کبھی ان کی انگلیوں کی حرکت اور کبھی لکڑی کے اس ٹکڑے کی طرف دیکھ رہا تھا جس میں سے کمال کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ یقین کریں، اس دن یہ ساز مجھے بڑا ہی اچھا لگا۔ ان کو یوں بجاتا ہوا دیکھتے میں بھی حسرت کرنے لگا۔ اے کاش، کبھی میں بھی اس طرح یہ ساز بجاؤں۔ اب میں کیسے اس بینجو بجانے والے مہان آدمی سے ملوں اور اپنی خواہش کا اظہار کروں؟ تو اس کام کے لیے میں نے استاد خیر محمد خان کو پکڑا، ان کے ساتھ ہماری پرانی جان پہچان تھی اور وہ ہمارے پڑوس میں ہی رہتے تھے اور استاد کے شاگرد بھی تھے۔

میری گزارش پر استاد خیر محمد بالآخر مجھے ان سے ملوانے کے لیے لے گئے۔ ان سے کہا۔ ''یہ ڈبل روٹی والا ہے اور آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہے۔''

استاد اس زمانے میں کراچی میں رہتے تھے اور ریڈیو کراچی میں ملازم تھے اور صرف کبھی کبھی ہی حیدرآباد آتے تھے۔ کہنے لگے۔

''میں تو کراچی میں رہتا ہوں، تمہیں کیسے اپنا شاگرد بناؤں؟ دُعا کرو، میری یہاں بدلی ہو تو پھر تمہیں شاگرد بناؤں گا۔''

تب میں نے دل لگی کرتے ہوئے کہا۔ ''استاد! خدا کرے، آپ کی نوکری چھوٹے اور آپ یہاں آ جائیں۔''

ہنس کر کہنے لگے۔ ”اڑے، یہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ تو مجھے بددعا دے رہا ہے یا دعا کر رہا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”دعا دے رہا ہوں کہ آپ حیدرآباد آ جائیں اور میرے شوق کا کچھ نہ کچھ ہو۔“

خیر، کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ واقعی تبادلہ کروا کر حیدرآباد ریڈیو پر آ گئے۔

میں ان سے ملنے گیا تو کہنے لگے۔ ”ڈبل روٹی والے! تیری دعا میں بڑا اثر تھا۔ قبول ہو گئی ہے اور میں ریڈیو حیدرآباد پر آ گیا ہوں۔“

اب استاد بلاول، کھوکھر محلہ میں سیٹھ لکن کے جھولے لعل ہوٹل میں رہنے لگے تھے۔ اسی ہوٹل میں اوپر والے کمروں میں موسیقار اقبال حسین اور بینجو نواز رحمت اللہ بھی کرائے پر رہتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا۔ ”کیا پروگرام ہے استاد؟“

بولے۔ ”جاؤ دھاگا...... مٹھائی لاؤ۔ بسم اللہ کرو اور شاگرد بن جاؤ۔ وہ سستا وقت تھا، کہیں سے چالیس روپے لایا اور ان پیسوں سے کچھ رومال خریدے، اگربتی لی، مٹھائی خریدی اور یہ سب اٹھا کر ان کے قدموں میں آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت موسیقار نیاز حسین صاحب، استاد خیرہ خان، ڈھولک نواز احمد نواز، مٹکے والا احمد ملاح، سارنگی والے بابا نیازو خان وغیرہ موجود تھے۔ سب کی خدمت میں رومال اور حسبِ حال نذرانہ پیش کیا پھر اگربتی جلی تو استاد نے دعا کی اور میری کلائی میں دھاگہ باندھ دیا اور لیجیے، ہم ان کے باقاعدہ شاگرد بن گئے۔

پھر دوسرے سال حاجی شاہؒ کے میلے کی بات سنیے۔ اس دفعہ جب بڑے بڑے بینجو نواز بجا چکے تو استاد نے مجھے کہا۔

”عزیز......! بجاؤ۔“

میں جھجک رہا تھا، اتنے ماہر اور نامور بجانے والوں کے درمیان میں، میں کیا اوٹ پٹانگ بجاؤں مگر استاد حکم پر حکم کر رہے تھے۔ میری اناؤنسمنٹ بھی کروا دی۔ ”بیکری والا بینجو بجائے گا۔“ اب استاد نے یہ کیا کہ میری جھجک ختم کرنے کے لیے خود آ کر میرے پیچھے بینجو لے کر بیٹھ گئے پھر اسماعیل کو اپنے ساتھ بٹھایا اور اب ان کے اصرار پر میں نے جو دھن چھیڑی تو سب میرے پیچھے پیچھے بجانا شروع ہو گئے۔ اس وقت مجھے لگا، میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں جو اپنے ستاد اور ان کے سب بہترین شاگرد مجھ ناچیز کے پیچھے بیٹھ کر وہی کچھ بجا رہے ہیں جو میں بجا رہا تھا۔ یہ مجھے استاد بلاول کا دیا ہوا سب سے بڑا اعزاز تھا، یوں دنیا میں شاید ہی کسی استاد نے شاگرد کے پیچھے بیٹھ کر بھی اس کی حوصلہ افزائی کی ہوگی۔ مجھے یاد ہے، اس تقریب میں بڑے بڑے گانے بجانے والے موجود تھے اور حیران ہو رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ”واہ رے، ڈبل روٹی والے، تیرے نصیب۔“

اس تقریب کے کچھ دن بعد میں نے دیکھا، وہ راحت سنیما کے پیچھے مہر شاہ سائیںؒ کی درگاہ میں بینجو پر کسی بلوچی دھن کے بعد کوئی زبردست عربی دھن بجا رہے تھے، تب اسی وقت بھاگتا میں اپنے محلّہ میں رہنے والے منا ماموں سے ایک روپیہ ادھار لے آیا اور بہت شرما شرما کر جیسے دوسرے دے رہے تھے، میں نے بھی یہ ایک روپیہ بطور نذرانہ ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ مجھے یاد ہے میں نے جب یہ عمل کیا، وہ بجاتے وقت مجھے مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔

استاد بلاول سے پہلے استاد کے شاگرد فیض محمد فیضو، رحمت اللہ، اسماعیل بلوچ اور بھی بہت سارے بینجو بجانے والوں نے اپنا فن پیش کیا تھا اور جب

میں یہ روپیہ لے کر وہاں پہنچا، اس وقت استاد عربی دھن بجا رہے تھے، تب بجاتے بجاتے استاد نے ایک دم بینجو بجانا بند کیا اور ڈانٹا۔

”اڑے...... تم اب اتنی دیر کے بعد آیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”استاد، کیا کروں، ڈیوٹی سے اترا ہی اب ہوں۔“

تو انہوں نے کہا۔ ”اچھا، اب بتا، تیرا کیا موڈ ہے؟“

میں نے کہا۔ ”سب بجا چکے اور آپ آخری بجا رہے ہیں، اب کیا ہو سکتا ہے؟ بات ختم۔“

”نہیں، تم میرے اوپر بجاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”استاد، میرے سب استاد بھائی ناراض ہو جائیں گے۔“

چڑ کر کہا۔ ”نہیں، بجاؤ۔ میں جو اجازت دے رہا ہوں۔“

میری مزید خوش نصیبی دیکھیے، محفل میں، میں نے استاد ہی کے ساز کو بجایا اور چونکہ عربی دھن میں ان سے سیکھ چکا تھا، اس لیے اسی دھن کو بجانے کی کوشش کرتا رہا پھر میں نے استاد ہی کی طرح سرمنڈل کو بھی چھیڑا تو ہنس کے کہنے لگے۔

”ڈبل روٹی ماسٹر، یہ کیا کر رہا ہے؟“

مجھے یاد ہے، اس موقع پر میں نے تو ادھار مانگ کر صرف ایک روپیہ ان کے قدموں میں رکھا تھا مگر استاد بلاول نے چار پانچ روپے مجھے دے دیئے، تب میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ کہنے لگے۔

”آج ہم تمہاری عزت کریں گے تو کل دوسرے بھی تمہاری عزت کریں گے۔“

عربی دھن اور دھمال بجا کے اترا تو سب شاگرد بھائی مجھ کو ٹوکنے بیٹھ گئے۔ ان کے اس ٹوکنے کی وجہ سے میری آنکھیں بھر آئیں، مجھے روتا ہوا دیکھا تو میری گردن پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے استاد نے کہا۔

”اب کیا ہوا، کیوں رو رہا ہے؟ بجا کے تو آیا؟“

میں نے کہا۔ ”سب دوست کہہ رہے ہیں، تم نے استاد کے اوپر کیوں بجایا؟“

استاد نے یہ سنا تو سب کو بلا کر ڈانٹا۔ ”عزیز نے میری ہی اجازت سے تو بجایا ہے۔ ڈراتے کیوں ہو تم اس کو؟ میں نے اس کی ہمت افزائی کی ہے۔“ پھر کہنے لگے۔ ”عزیز......! تم میں اور دوسرے شاگردوں میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ تمہیں میں نے شاگرد ہی نہیں، اپنا بیٹا بھی بنایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس دن والا استاد کا دیا ہوا حوصلہ ہے کہ آج تک ٹوٹا پھوٹا ہی سہی یا جیسا بھی مجھ سے ہو رہا ہے، میں اس فیلڈ میں کام کر رہا ہوں اور آپ کے سامنے ہوں۔“

یہاں مجھے استاد کی ایک اور بات یاد آئی۔ یہ 1973ء کی بات ہے جب بھٹو صاحب نے آئین بنایا تھا اور اس کی خوشی میں ملک بھر میں تقریبات ہو رہی تھیں۔ اس سلسلے میں رکشا یونین نے بھی گول بلڈنگ کے سامنے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ایک محفل کی تھی، میں بھی اس محفل میں بجانے کے لیے پہنچ گیا۔ اس تقریب میں کچھ آئٹمز بجانے کے بعد میں نے فلمی گیت ’دلدار صدقے، لکھ وار صدقے‘ کی دھن بجانا شروع کر دی، تب میں نے اچانک آنکھ اٹھا کے دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ استاد بلاول میرے سامنے کھڑے ہیں اور گھور گھور کر مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں ڈر گیا اور بینجو سے ہاتھ ہٹا کر بھاگنے لگا۔ میں نے سمجھا، شاید میں غلط بجا رہا ہوں اور اب بس استاد مجھے ڈانٹنے ہی والے ہیں تو استاد نے کہا۔

''اڑے' یہ کیا کر رہا ہے' میں نے تو دور سے ہوٹل پر بیٹھے تیری بینجو کی آواز سنی اور آ گیا۔ میں تم کو ناراض ہو کر نہیں' خوش ہو کر دیکھ رہا تھا اور تم ہو کہ ڈر کے مارے اٹھ کر بھاگ رہے ہو۔''

یہاں پر حاجی شاہ سائیںؒ کے میلے کا ایک اور واقعہ سنیے۔ بیکری میں ڈیوٹی کرنے کے بعد میلے میں پہنچا تو دیکھا' ایک سے ایک فنکار موجود مگر استاد بلاول کہیں نظر نہیں آئے۔ بھاگ کر جھولے لال ہوٹل پہنچا۔ پوچھا۔

''استاد' کیا پروگرام ہے؟ چلنا ہے یا نہیں چلنا؟''

کہنے لگے۔ ''موڈ ہی نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''موڈ کیوں نہیں ہے' موڈ بناؤ اور چلو۔''

کہنے لگے۔ ''ارے یار' آج چھوڑ' دو چار روز سے 'دوا' ہی نہیں ملی ہے۔''

میں سمجھ گیا' اس لیے میں نے کہا۔ ''آج چلو تو سہی' میں بندوبست کر کے آتا ہوں۔

اب استاد کو میلے میں چھوڑ کے 'دوا' کے چکر میں نکل گیا' اِدھر اُدھر سے پیسے ادھار لیے اور چھوٹی بوتل لا کر استاد کی خدمت میں پیش کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کہنے لگے۔

''ڈبل روٹی والے جادوگر' کہاں سے یہ لے کر آ گیا؟''

اور پھر کہیں کونے میں بیٹھ کر شروع ہو گئے۔ سائیں اختر حسین لاہور والے بھی اس محفل میں موجود تھے۔ جب استاد پرباش ہو چکے تو سائیں اختر حسین نے کہا۔

''بلاول بابا' ٹرنگ ٹرانگ کرنی ہے تو آ جا۔''

محفل کا کمپیئر مزاحیہ اداکار سلیم رنگیلا تھا' اس نے پہلے سائیں اختر پھر استاد محمد یوسف اور آخر میں استاد بلاول بیلجم کے بولنے کے انداز کی نقل کی پھر استاد غلام فرید صابری قوال کی نقل اتاری اور یوں محفل زعفران زار بن گئی۔ اب استاد بلاول میدان میں اترے' خوب بجایا اور چھا گئے۔ بہت موڈ میں تھے' پہلے بلوچ رنگ بجایا پھر کوہیاری پھر دھمال اور بجاتے جاتے تھے اور خوش ہو کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہتے بھی جاتے تھے۔

''اڑے' خوش رہو ڈبل روٹی والے......''

یہاں استاد کی ایک اور بات یاد آ گئی' حیدر آباد میں پنجرہ پول کے قریب سائیں گل شاہ بخاریؒ کا میلہ ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں یہ میلہ بھی سائیں حاجی شاہؒ کے میلے کی طرح بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ ان دنوں میری ایک استاد بھائی سے ناراضگی چل رہی تھی۔ مجھے جہاں دیکھتا' غصے سے دیکھتا تھا۔ لگتا تھا کہ ان سے ایک دن جھگڑا ہو کے ہی رہے گا۔ خیر' وہ شخص بھی سائیں گل شاہؒ کے میلے میں تھا اور جب میں وہاں پہنچا' اس وقت استاد بلاول بجا رہے تھے۔ یہ میلہ تین دن کا ہوتا تھا' دوسرے دن مجھے بجانے کے لیے کہا گیا تو استاد سے میں نے پوچھا۔

''کیا کروں' بجاؤں یا نہیں؟ اِدھر ایک آدمی سے میری ناراضگی چل رہی ہے۔''

استاد جھٹ سے بولے۔ ''اڑے' فنکار کوئی لڑتا ہے' وہ تو نرم دل کا ہوتا ہے۔ کل جاؤ اور بجا کے آؤ۔ لڑنا قطعی نہیں اور ایک بات میری نوٹ کر لو اور وہ یہ کہ جب اسٹیج پر آرٹسٹ بیٹھتا ہے تو اس کی دو آنکھیں ہوتی ہیں جبکہ دیکھنے والوں کی کتنی ہی آنکھیں ہوتی ہیں' کوئی بھی کہیں نہ کہیں سے وار کر سکتا ہے اس لیے سب سے جھک کر ملو' نیازمندی سے بات کرو' جو لڑنے کو آئے' اس سے بھی معافی مانگ لو۔ کہو بابا' فقیر لوگ ہیں' فنکار ہیں' ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معاف کر دو۔''

استاد کی اس نصیحت پر میں نے عمل کیا اور دوسرے دن بجانے سے پہلے جا کے استاد بھائی کو گلے لگایا اور صلح کر لی۔

اچھا یہاں ایک اور بات مجھے یاد آ گئی اور وہ یہ کہ ایک بار استاد نے مجھے اچھا خاصا ڈانٹا بھی تھا اور اس ڈانٹ کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ گول بلڈنگ کے پیچھے استاد بلاول اپنی بیٹھک میں پاؤں پر پاؤں رکھ کر آرام کر رہے تھے اور میں ان کے پیروں کی طرف بیٹھا بینجو پر سرگم کی ریاض کر رہا تھا۔ استاد اس وقت سو رہے تھے اور ان کے خراٹوں کی آواز بھی بڑی زور سے آ رہی تھی۔ اتفاق سے وہیں ایک ڈھولک والا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

''استاد سو رہا ہے' تھوڑا سا ساتھ دو' میں ایک گانا بجانا چاہتا ہوں۔''

اور ابھی میں نے گانے کی دھن بجانا شروع ہی کی تھی کہ استاد نے اٹھا کے زور سے اپنی لات مجھے ماری' بولے۔

''اڑے...... میں سو رہا ہوں تو کیا' میرا دماغ تو جاگ رہا ہے' تو پہلے سرگم پر ہاتھ پکا کر پھر گانے وانے کے چکر میں پڑنا۔'' پھر کہنے لگے۔ ''میں سوتے میں بھی جاگ رہا ہوتا ہوں بیٹا' اور کوئی سریلا بجائے یا بے سرا' مجھے سب پتہ چلتا رہتا ہے۔ فی الحال دھن وِن کو چھوڑ' سیدھا سیدھا سرگم کا ریاض کرتا رہ۔''

مجھے یاد ہے' ان کی عادت تھی' ساز پر اپنی محفل کو ہیاری چھیڑنے سے شروع کرتے اور اسی راگنی سے ایسا ماحول بناتے تھے کہ کمال ہو جاتا تھا' گویا ماحول کو اپنی 'تار' میں سمیٹ لیتے تھے پھر عربی' بلوچی' ماہیا اور آخر میں کلاسیکل بجاتے اور ہر محفل میں کوئی فرمائش کرے یا نہ کرے' وہ کلاسیکل راگ ہر حالت میں بجاتے تھے اور راگ سے کھیلتے ہوئے ردہم والوں سے بڑے چونچلے کرتے تھے۔ بہت خوش مزاج تو تھے ہی' ایک بار میں صبح صبح ڈبل روٹی لے کر ان کے پاس گیا تو پتہ چلا' گول بلڈنگ کے پاس نائی کی دکان پر شیو بنوانے کے لیے گئے ہیں' فوراً وہاں پہنچا' دیکھا' آئینے کے سامنے ایک کرسی پر استاد محمد یوسف اور دوسری طرف استاد بلاول بیلجم شیو بنوا رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی استاد بلاول نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔

''اڑے...... ڈبل روٹی والا آ گیا......''

استاد یوسف نے کہا۔ ''کون کون سی ڈبل روٹی لائے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ایک وائٹ اور دوسری 'براؤن'۔''

تو ہنس کر کہنے لگے۔ ''تو یوں بولو نہ ایک میرے رنگ والی' میری لیے اور کالی والی اپنے استاد بلاول کے لیے لائے ہو۔''

اب یہاں شروع کے دنوں کی یہ بات سنیے۔ میرے والد صاحب محمد نذیر ایک دین دار آدمی تھے۔ ہم آپس میں تین بھائی ہیں اور ہماری ایک بہن ہے۔ دونوں بھائی اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ میں سب سے چھوٹا تھا اور بابا کی قائم کردہ بیکری میں کام کرتا تھا۔ بابا دین دار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت غصے والے بھی تھے۔ مجھے یاد ہے' میں نے چھوٹا بینجو خریدا تھا اور دکان سے دور سبزی منڈی میں بیٹھا ریاض کر رہا تھا تو میں نے دیکھا' وہ سامنے سے ہاتھ میں ڈبل روٹی کاٹنے والی چھری لے کر غصے میں میری طرف آ رہے ہیں۔ جانے کس نے ان سے کہہ دیا تھا کہ تمہارا بیٹا میراثی بن رہا ہے۔ خیر' آتے ہی پہلے تو مجھے بابا نے خوب پیٹا پھر میرا بینجو اٹھایا اور لا کر بیکری کی بھٹی میں جھونک دیا۔ خدا جانے' کہاں

کہاں سے پیسے جمع کر کے ساٹھ روپے کا بینجو میں نے خریدا تھا جو ایک لمحے میں جل کر خاک ہو گیا پھر تو بیکری پر جو بھی ملنے والا آتا' اسے کہتے۔

"میرے بیٹے کو بلاول مکرانی نے خراب کر دیا ہے۔"

اس واقعہ کے بعد اسی روز میں رات کو استاد بلاول کے پاس پہنچ گیا' کہا۔ "بابا بہت غصے میں ہیں' آپ کسی طور پر چل کر ان کو سمجھائیں۔"

بلاول بلیجم اپنے دور کے بہت بڑے فنکار اور انسان تھے' بابا ان کو جانتے تھے' کہنے لگے۔

"میں ضرور تمہارے ساتھ چلوں گا۔ مجھے یقین ہے' تمہارا باپ کتنا بھی غصے میں ہوگا' مجھے دیکھے گا تو نرم پڑ جائے گا۔"

کچھ روز کے بعد وہ واقعی بابا سے ملنے بیکری پر آ گئے۔ بابا اس وقت کیک تیار کر رہے تھے اور اس دن بھی بہت غصے میں تھے۔ استاد بلاول جیسے ہی بیکری میں داخل ہوئے تو بہت زور سے بولے۔

"السلام علیکم!"

بابا نے پلٹ کر پہلے تو ان کو غصے سے دیکھا پھر نہ جانے استاد بلاول نے کیسی شکل بنائی تو وہ ہنسنے لگے۔ کہا۔

"آؤ استاد' بیٹھو۔"

اس دوران میں' میں تو چھپ گیا اور چھپ کے یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ بابا نے کسی کو آواز دی۔

"کوئی ہے' چائے وائے لاؤ' انہیں بسکٹ کھلاؤ۔ انہوں نے میرے بیٹے کو خراب کیا ہے۔"

اس پر بلاول نے بابا سے کہا۔ "ارے بابا' تمہارے بیٹے کو ہم نے خراب نہیں کیا ہے' کچھ سالوں میں دیکھنا کہ یہ بڑا فنکار ہو جائے گا اور تم اس پر فخر کرو گے۔"

عجب اتفاق' اس دن کے بعد بابا کا غصہ خود بخود کم ہوتا چلا گیا اور پھر بابا نے مجھے یہ ساز بجانے سے منع نہیں کیا۔

اسی زمانے میں ٹی وی سے سید صالح محمد شاہ کا پروگرام آتا تھا "کچہری"' اعجاز علیم عقیلی صاحب اس کے پروڈیوسر ہوا کرتے تھے۔ ایک دن کہا کہ اس پروگرام میں آ کر بجاؤ۔ بجانے پہنچا تو دورانِ پروگرام سید صالح محمد شاہ نے پوچھا۔

"کس کے شاگرد ہو؟"

میں نے بتایا۔ "استاد بلاول بلیجم کا۔"

کہنے لگے۔ "اڑے بابا...... اس کا تو نام لینا ہی بڑی بات ہے' کمال کا بجانے والا ہے وہ تو' بس بات ختم' اب بتاؤ' کیا بجاؤ گے؟"

میں نے دو عدد آئٹم پیش کیے اور گھر چلا آیا۔

یہ پروگرام ایک مہینے کے بعد ٹیلی کاسٹ ہونا تھا۔ اس زمانے میں ٹی وی ہمارے پاس نہیں تھا۔ پروگرام آنے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا کہ میں نے بابا کو ساری بات بتائی۔ یہ سننا تھا کہ وہ بہت خوش ہوئے اور ساڑھے چار ہزار روپے میں ٹی وی دلا دیا۔ ٹی وی گھر میں آ گیا تو خوش ہو کر کہنے لگے۔

"ہمارے عزیز صاحب ٹی وی پر بینجو بجا کر آئے ہیں۔ دیکھیں گے کہ صاحب زادے نے کیسا بجایا ہے؟"

پھر یہ پروگرام جب ٹیلی کاسٹ ہوا تو خود دیکھا' خاندان کی خواتین اور برادری والوں کو بلا بلا کر دکھایا اور جی جان سے بہت خوش ہوئے' یوں استاد بلاول کے حوصلہ بڑھانے کے بعد بابا کا بھی ڈر نکل گیا اور اس حوصلہ بڑھانے کے بعد اس میدان میں ہم دوڑنے بھاگنے لگ گئے۔

اچھا' بینجو بجانا میں نے کب سے سیکھا' اب آپ کو ادارا یہ بات بھی بتاتا چلوں۔ اصل میں واقعہ کچھ یوں ہوا کہ حیدرآباد میں جب ہوٹل اورینٹل اور پھر بھٹو صاحب کے ہاتھوں اس کا افتتاح ہوا تو اس ہوٹل میں آج کے فنکار سلیم نوشاد کے والد غلامو خان ستار بجاتے تھے۔ ان سے پہلے میں استاد بلاول کو بھی اسی طرح دلچسپی کے ساتھ دیکھتا اور سنتا تھا مگر کیا تھا کہ وہ کراچی میں رہتے تھے' لامحالہ میں اب استاد غلامو ستار نواز کو دھیان سے دیکھتا اور سنتا تھا۔ اسی زمانے میں' میں نے اِدھر اُدھر سے 16 روپے جمع کر کے شاہی بازار' حیدرآباد سے ایک بینجو خریدا' چار روپے کی برفی خریدی اور ستار نواز استاد غلامو کا جا کر شاگرد بن گیا۔ استاد غلامو کو اللہ تعالیٰ زندہ رکھے' میرے پہلے استاد' اب بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اور لیاقت کالونی میں رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد استاد بلاول بھی حیدرآباد آ گئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا پھر جو کچھ سیکھا' انہی سے ہی سیکھا۔ اگرچہ اب وہ دمہ کے مریض بن چکے تھے مگر اس حالت میں نجانے کیوں وہ تبادلہ کروا کر ریڈیو لاہور چلے گئے۔ ان کے بعد میں یہاں ریاض کرتا رہا اور جہاں جہاں بجانے جاتا' گزارش کرتا کہ اناؤنسمنٹ میں ضرور بتایا جائے کہ میرا استاد' استاد بلاول بلیجم ہے۔ اصل میں بجانا تو ہمیں کچھ آتا نہیں' ان ہی کے نام سے یوں کہلوا کر اپنا بھرم رکھواتے تھے اور چل رہے ہیں کہ ان ہی کا ہی تو نام ہے جو ہماری پہچان ہے۔

1977ء میں میرے استاد بلاول کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا بڑا صدمہ تھا۔ ان کا انتقال جب ہوا تھا تو میں ایک سال کا ناسمجھ بچہ تھا اس لیے ان کی مجھے کچھ یاد نہیں پھر مجھے دوسرا بڑا صدمہ 11 جون 2010ء کو اس وقت پہنچا جب میرے [illegible] فنکار حمادانی صاحب کا انتقال ہو گیا۔

دسمبر آتے ہی......

دسمبر آتے ہی

دل میں چھپے درد

آنکھوں میں آن بستے ہیں

سردیوں کی طویل راتوں میں

رت جگے وجود پاتے ہیں

سرد ہوا کے جھونکے

تیرے ہجر کی آگ کو

اور زیادہ بھڑکاتے ہیں

تری قسمیں' ترے وعدے' تری یادیں اور

ترے ساتھ گزرے لمحے

خوں رنگ پوشاک پہنے

خیال کے دریچوں میں آن بستے ہیں

میری تنہائی پر' میری رسوائی پر ہنستے ہیں

دسمبر آتے ہی......

شاہد فراز

استاد بلاول کا 1977ء میں جب انتقال ہوا تو میں لیاری کراچی میں ان کے گھر پہنچا پھر ان کی تربت پر گیا۔ تدفین ہو چکی تھی اس لیے دیر تک ان کے سرہانے بیٹھا روتا رہا۔ بعد میں میں نے ہر سال ان کی برسی منانے کا تہیہ کیا۔ ان کی پہلی برسی میں نے کنٹونمنٹ ہائی اسکول میں کی پھر بمبئی بیکری کے سامنے کنٹونمنٹ بورڈ کالونی میں جو کلب قائم کیا تھا تو یہاں بھی کچھ برسوں تک پروگرام کیے۔ کئی سال پریس کلب حیدر آباد میں بھی ان کے نام کی تقریبات کروائیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور سال بہ سال ۱۰ رمضان المبارک پر ان کی یاد میں قرآن خوانی و نذر نیاز اتنے برسوں سے کرواتا آ رہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے بتایا 24 گھنٹوں میں ان کا نام میری باتوں میں ضرور آتا ہے اور سچی بات ہے کہ ان کا نام لیے بغیر سکون بھی نہیں آتا اور اصل حقیقت تو یہ بھی ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں نہ ان جیسا کسی کو بجاتے سنا نہ دیکھا اور اب جو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے چلے گئے ہیں تو لگتا ہے استاد بلاول بیلجیم کے ساتھ بینجو کا عروج ہی چلا گیا۔

میرے استاد بڑے خوش اخلاق و خوش مزاج بھی تھے ہر وقت خوش رہتے تھے۔ کھانے پینے کا بھی ہر روز ہی انتظام کرتے اور بغیر اس کے ان کا کام چلتا ہی نہیں تھا۔ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور میرا جہاں کہیں بجانے کا پروگرام ہوتا میرا کہنا مانتے اور سائیکل پر میرے ساتھ آگے بیٹھ کر ضرور خوشی خوشی وہاں چلے چلتے یوں میں نے سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر ان کو کئی بار حیدر آباد شہر کی خوب خوب سیر بھی کروائی تھی۔ ایک بار میں اچانک ان کے پاس آیا۔ وہ گول بلڈنگ کے پاس کھڑے چائے پی رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"چلو استاد......"

بولے۔ "کہاں؟"

میں نے کہا۔ "بمبئی بیکری کے سامنے میں نے کلب بنایا ہے چل کر اس کا افتتاح کرو۔"

تیار ہو گئے۔ میں نے فوراً ان کو سائیکل پر بٹھایا اور کلب لے آیا کلب دیکھ کر بہت خوش ہوئے پھر بولے۔

"واپس گول بلڈنگ چھوڑ کے آؤ۔"

اور یوں وہ پھر میری سائیکل پر آگے ڈنڈے پر بیٹھے اور خوشی خوشی واپس آ گئے۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں جتنا وقت میں ان کے ساتھ رہتا یا وہ میرے ساتھ رہتے بہت خوش و خرم رہتے اور بات بات پر مجھے دعائیں دیتے ہوئے کہتے۔

"اڑے...... ڈبل روٹی والا...... اللہ تیرا بڑا نام کرے گا۔"

زندگی کے آخری ایام میں استاد خیر محمد خان پشوری نے بھی ان کی بڑی خدمت کی۔ ان ہی کے بہانے مجھے یہ سعادت حاصل رہی کہ ان کا شاگرد بنا قریب گیا اور انہی کا ہو گیا۔ استاد نے اپنی زندگی میں خوب کمایا مگر جو کمایا خرچ کر دیا پیچھے چھوڑا کچھ بھی نہیں۔ لیاری میں ان کا گھر تھا جو اب بھی ہے جس میں ان کی بڑی بیٹی آمنہ بہن اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔

بلاول بابا کی پختہ تربت مورڑو قبرستان کراچی میں واقع ہے۔ وہ بھی آمنہ بہن اور ان کے شوہر چاشوق نے بنوائی تھی۔

آسمانِ موسیقی کے عظیم ستارے استاد بلاول سے جڑی میں اپنی یہ آپ بیتی اس شعر پر ختم کرتا ہوں اور ان کے متعلق یہی میرے دلی جذبات بھی تھے۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
تیرا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

محمد رضوان قیوم

کیا بُرا تھا مرنا

حزیں صدیقی کا خیال

پردۂ شب اٹھا گئی ہے دھوپ
چہرہ چہرہ دکھا گئی ہے دھوپ

وہ غیروں سے بچ گئی تھی مگر اپنوں نے......! ایک حرماں نصیب کا دردناک ماجرا

اس دلچسپ کہانی کے راوی ایک ریٹائرڈ فوجی سپاہی ہیں۔ وہ تقسیم ہند سے قبل 13 بلوچ رجمنٹ میں بحیثیت فوجی سپاہی (ڈرائیور) بمقام پانی پت کینٹ اپنی ڈیوٹی سرانجام دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی کا آغاز کچھ یوں کیا تھا کہ......

"یہ بات ہر ذی شعور شخص کو معلوم ہے کہ 30 جون 1947ء کو جب گوروں نے تقسیمِ ہندوستان کا فیصلہ کیا تو اسی وقت سے پورے برصغیر میں ہندو سکھ اور مسلمانوں کے مابین خون خرابہ لوٹ مار عورتوں کی عزتوں کی پامالی کے علاوہ جلاؤ گھیراؤ



املاک کی بربادی کا سلسلہ شروع ہوا جو وقت کے ساتھ شدت اختیار کر گیا تھا۔ یہ خونی فسادات زیادہ تر اُن علاقوں میں ہوئے جن کے راستے پاکستان یا بھارت کی طرف جاتے تھے یعنی دہلی کے بعد سے لے کر لاہور تک بہت ہی زیادہ خون خرابہ ہو رہا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مورخہ 04 جولائی 1947ء کو ہماری یونٹ کے انچارج میجر پانڈے نے ہمیں یہ کہہ کر ٹانڈا سنگھ گاؤں جانے کا حکم دیا تھا کہ ''ہماری اطلاع کے مطابق اُس گاؤں میں گزشتہ رات کو سکھوں، ہندوؤں کے ایک جتھے نے مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر نہ صرف لوٹ مار کی بلکہ وہاں کے مکینوں کو زندہ جلانے کے بعد اُن کی جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔'' میجر نے مزید بتلایا تھا کہ اُن جلے ہوئے مسلمانوں کی لاشیں سڑ کر اُس علاقے میں ناقابلِ برداشت بدبو پیدا کر رہی ہیں، اُن کو دفنا کر صفائی کا انتظام کرو۔

میرے ٹرک میں موجود قافلے کا انچارج ایک ہندو نائب صوبے دار رام داس تھا جسے بیس خاکروب اور بارہ مسلمان اور ہندو فوجی سپاہی دیئے گئے تھے جن کے پاس پرانی طرز کی بندوقیں تھیں۔ اس کے علاوہ جرمن نسل کے دو کتے بھی دیئے گئے تھے جن کی ذمے داری نبھانے کے لیے ایک سکھ فوجی رنجیت سنگھ مخصوص تھا۔ یہ جرمن کتے دہرا کام کرتے تھے، ایک تو یہ مطلوبہ دشمن پر خطرناک حملہ کرتے تھے جبکہ ان کی دوسری خدمت یہ تھی کہ یہ کسی بھی زندہ انسان کی بو ملبے کے ڈھیر میں سے بھی بخوبی سونگھ لیتے تھے۔

•......•......•

میرا ٹرک میجر کے حکم کے مطابق، ٹانڈا سنگھ گاؤں کی جانب گامزن تھا۔ میں نے رنجیت سنگھ کو فرنٹ سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں منہ بند جرمن کتے پیچھے ٹرک میں ایک مخصوص کنڈے کے ساتھ باندھ دیئے تھے۔ رنجیت سنگھ اس بلوچ یونٹ نمبر 13 میں میرا اکلوتی گپ شپ مارنے والا یار دوست تھا حالانکہ وہ سوئپر تھا اور میں ڈرائیور، وہ سکھ اور میں مسلمان، لیکن ہم نے اِن تضادات کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ میری اس دوستی پر میری یونٹ کے دیگر مسلمان سپاہی مجھے اکثر لعن طعن کرتے تھے، لیکن میں اُن لوگوں کی باتیں سنی اَن سنی کر دیا کرتا تھا، ویسے سچی بات یہ ہے کہ اس سے میری دوستی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میں اس کے ہاتھوں کی بنی ہوئی دیسی شراب بڑے شوق سے پیا کرتا تا، میرے اس چسکے کسی کو خبر نہ تھی۔ خیر، قصہ مختصر، رنجیت سنگھ چلتے ٹرک میں میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا مجھ سے یہ بات بڑی مایوسی سے کہہ رہا تھا۔

''یار اَب تو پاکستان بننے کے بعد لازمی بات ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان باڑھ لگ جائے گی اور پرمٹ وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اگر تو پاکستان چلا گیا تو پھر تجھ سے کس طرح مل پاؤں گا؟ یار، تجھ سے تو میرا دل بہت لگا ہوا ہے۔''

اس کی یہ بات سن کر میں نے اسے جواباً کہا تھا۔ ''ہاں یار، سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی تجھ سے دل سے محبت کرتا ہوں لیکن تو فکر نہ کر، ہم کبھی نہ کبھی ضرور ملیں گے، بس تو مجھ سے ہمیشہ رابطے میں رہنا۔'' اور پھر اس گفتگو کے دوران میں ہی میں نے باتوں باتوں میں اسے باور کرایا تھا۔ ''یار، یہ تمہارے سکھوں اور ہندوؤں کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو بالکل وحشی بن کر ہمارے مسلمانوں کو سرِ عام قتل و غارت کر رہے ہیں۔ یہ پاکستان کا قیام تو تاریخ کا صحیح فیصلہ ہے اور......''

میری اس بات کو وہ بہت طیش کے عالم میں کاٹ کر بولا تھا۔ ''نہیں...... یہ تمہارے قائداعظم کی زیادتی ہے کہ اس خطے کے ٹکڑے کروا دیئے ہیں۔''

''اور یہ یار، بات ہمارے مسلمانوں کے تشخص اور ان کے جائز حقوق کی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے میرا لہجہ بھی تلخ ہو گیا تھا۔

اور پھر اس کے اور میرے درمیان زبانی جھڑپ، ہماری آواز ٹرک کے پیچھے بیٹھے فوجی سوئپروں تک بھی پہنچ گئی۔ ہم نے محسوس کیا کہ وہ بھی تقسیم کے مسئلے پر اپنی اپنی ذہنی استطاعت، نظریات کے مطابق اظہار رائے کر رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ اور پچھلے حصے کے درمیان جو شیشے کی دیوار ہوتی ہے، وہ اتفاق سے ٹوٹی ہوئی تھی لہٰذا ہماری آوازا نہیں اور ان کی آوازیں ہمیں صاف آ رہی تھیں اور یہ سلسلہ خاصی دیر تک جاری رہا تھا۔

•......•......•

اس سفر کے راستے میں ہم نے دیکھا کہ جگہ جگہ قتل و غارت کے ساتھ لوٹ مار کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے جنہیں دیکھ کر دل ہول رہا تھا۔ اس ماحول نے میرے اور رنجیت سنگھ کے درمیان ہونے والی تقسیم کی جلتی بحث کے کڑھاؤ کو مزید بھڑکا دیا تھا اور میں نے ایک بار پھر سکھوں اور ہندوؤں کی جانب سے کی جانے والی بربریت کی مذمت کی تھی۔

''معاف کرنا، تم مسلمانوں میں ہم سکھوں، ہندوؤں کے خلاف مذہبی تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔'' رنجیت سنگھ نے برا سا منہ بنا کر کہا تھا۔

''میرا دل جل رہا ہے، یہ تیرے لیڈر قائداعظم اور تم مسلمانوں نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' رنجیت میری جانب سے منہ موڑتے ہوئے بولا تھا۔

''اچھا یہی بات ہے، تجھے پاکستان کے بننے کا اتنا دکھ ہے تو جا، پیچھے ٹرک میں دیگر سوئپروں اور اپنے کتوں کے ساتھ جا کر بیٹھ، یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''اچھا روک، ٹرک...... میں تجھ سے اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ آج سے تیری میری دوستی ختم......''

میں نے اس بدمزگی کے باوجود ٹرک کو نہیں روکا تھا، اپنی جیب سے بیڑی نکالی تھی اور اسے سلگا کر اس کے ہونٹوں میں پیوست کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''ایسا کر، پہلے آدھی تو پی اور پھر آدھی مجھے دے۔''

رنجیت سنگھ نے میری دی ہوئی بیڑی کو بڑی خفگی میں اپنے ہاتھوں سے مسل دیا تھا۔

''اب بتا، تعصبی میں ہوں یا تو؟'' میرے اس سوال پر اس نے سرخ نگاہوں سے جس طرح مجھے دیکھا تھا، میں اسی لمحے سمجھ گیا تھا کہ یہ اب مجھے بحیثیت مسلمان، ایک سکھ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور اس کے دل میں میرے لیے دوستی کی کوئی گرمی نہیں رہی، سو میں نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی تھی اور وہ بھی مجھ سے مزید کچھ نہ بولا تھا۔

•......•......•

چڑیا

ایک نازک سی چڑیا
بارش کے ڈر سے
دیوار پر
اِس کنارے سے اُس کنارے تک
آ رہی ہے
جا رہی ہے
بے چاری گھونسلے سے محروم
نازک سی اک چڑیا......!

من شاہ

ہم اپنی مطلوبہ منزل ٹانڈا سنگھ گاؤں کی حدود میں پہنچے تو وہاں اب بھی جگہ جگہ مسلمانوں کے جلتے گھروں سے دھواں سا اٹھ رہا تھا' راکھ میں دبی چنگاریاں سلگ رہی تھیں' جگہ جگہ پھیلے انسانی خون کے درمیان اعضاء کٹی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ الغرض اس اجاڑ اور برباد گاؤں میں آخری حد تک وحشت چھائی ہوئی تھی۔ میں نے بجھے دل کے ساتھ ٹرک کو اس متاثرہ گاؤں کے ایک حصے پر روکا تھا۔

ہمارے انچارج ہندو نائب صوبے دار رام داس نے ٹرک پر چڑھے تمام فوجیوں اور خاکروبوں کو سیٹی مار کر نیچے اتر کر ایک جگہ اکٹھے ہونے کو کہا تھا اور پھر اس نے بندوق بردار فوجیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ امدادی کام والے علاقے کو حصار میں لے لیں اور اگر وہ محسوس کریں کہ کہیں سے کوئی گڑبڑ ہے تو وہ فوراً فائر کھول دیں' اس کے ساتھ اس نے خاکروبوں کی ڈیوٹیاں لگادی تھیں کہ وہ پہلے باہر موجود جلی کٹی لاشیں اٹھائیں اور پھر مسلمانوں کے جلے' لٹے گھروں کے اندر جاکر وہاں موجود لاشیں بھی اٹھا کر ٹرک پر لوڈ کریں اور سب سے آخر میں کتوں کی مدد سے اگر کوئی زندہ بچ گیا ہو تو اسے تلاش کریں۔

نائب صوبے دار رام داس کی نگرانی میں تمام لوگ مصروفِ عمل تھے جبکہ میں اور رنجیت سنگھ خاموشی سے ایک طرف کھڑے ہوگئے تھے۔ اس کے دونوں کتے بدستور ٹرک میں بندھے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں قریبی گاؤں کے مقامی ہر عمر کے سکھ' ہندو بھی وہاں آگئے تھے اور غصے بھری نگاہوں سے اس تمام کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہو' وہ تقسیم کے حوالے سے مسلمانوں کے خلاف باتیں کرتے ہوئے جملے کس رہے تھے' گالیاں دے رہے تھے اور ہم خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہے تھے کیونکہ رجمنٹ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ کسی بھی فسادزدہ علاقے میں جاکر تمام فوجیوں اور امدادی کارکنوں نے ہر صورت خاموشی اختیار کرنی ہے۔

"ایک بھی مُسلے کو پاکستان زندہ جانے نہیں دینا۔" قریبی گاؤں سے آئے ایک سکھ نوجوان نے آگ برساتے لہجے میں کہا تھا۔

"یہ تمہاری بھول ہے۔ ہم انشاء اللہ' تمہاری زمین سے گزر کر اپنے پاک وطن جائیں گے۔" یہ آواز ہمارے درمیان موجود ایک جذباتی مسلمان سپاہی کی تھی۔

نائب صوبے دار رام داس انتہائی غصے میں اُس مسلمان سپاہی کے قریب آیا تھا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' چھوٹتے ہی ایک زوردار مکہ اس سپاہی کے منہ پر مارتے ہوئے کہا تھا۔

"زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں...... ہم جس کام کے لیے آئے ہیں' وہ کرو۔ ہماری حیثیت یہاں اس طرح ہے جیسے ہم مٹی کے تیل پر کھڑے ہوں' یہاں ذرا سی بات جلتی پہ تیل کا کام کرے گی جس میں ہم سب جل جائیں گے۔ چلو' کتوں کے کھانچے کھولو تاکہ یہ ملبے میں سے کوئی زندہ انسان تلاش کریں۔"

"سب پاکستان پہنچنے سے پہلے کتے کی موت مر چکے ہیں......" تماشہ دیکھنے والے ایک بوڑھے سکھ نے نفرت کے زہر میں بجھا تیر پھینکا تھا لیکن مسلمان فوجیوں کے پاس خاموشی اور برداشت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

رنجیت سنگھ نے جرمن کتوں کے کھانچے کھول دیئے تھے۔ وہ آزاد ہوتے ہی ملبے کے گرد دیوانہ وار گھوم کر وہاں کی ہر چیز سونگھنے لگے تھے۔

"دیکھو' کتنی لاشیں جمع ہوئی ہیں' انہیں گنو۔" صوبے دار نے مجھے حکم دیا تھا۔

میں نے ٹرک میں موجود مسلمانوں کی سوختہ لاشیں گنیں تو وہ چونتیس تھیں جن میں زیادہ تر اتنی جلی ہوئی تھیں کہ اُن کو پہچاننا مشکل تھا۔

"یہ سارے مسلمان تھے یا اِن میں کوئی ہندو' سکھ بھی تھا؟" نائب صوبے دار رام داس نے وہاں موجود قریبی گاؤں کے لوگوں سے پوچھا تھا۔

"یہ سارے تھے تو پاکستان جانے کے شوقین مسلمان لیکن ہم نے اِن سب کی یہاں چتا جلا دی ہے...... اب یہاں کوئی زندہ مسلم جی نہیں ہے۔"

"ان سب لاشوں کو اس گاؤں سے باہر کسی خالی زمین میں گڑھا کھود کر دبا دو' ان سے بڑی بھیانک بدبو آرہی ہے۔" نائب صوبے دار رام داس نے خاکروبوں کے انچارج بڈھی رام کو حکم دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے سیٹی مار کر تمام فوجیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ بیک پوزیشن میں آجائیں۔ اسی دوران ہوا یہ تھا کہ وہ جرمن کتنے بیک وقت ایک جلتے مکان کی چھت پر چڑھ کر بری طرح بف' بف' کر کے اپنی مخصوص آوازیں نکالنے لگے تھے۔

"کیا ہوا؟ جلدی سے چند سپاہی ان کتوں کی طرف جاؤ' یقیناً وہاں کوئی خاص بات ہے۔" رام داس چلایا تھا۔ اب میں وہاں عالمِ تجسس میں کھڑا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ نیز وہاں کھڑے مقامی ہندو' سکھوں کے درمیان بھی ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی اور پھر میں وہاں کھڑے رہنے کی بجائے بھاگتا ہوا اس جلے ہوئے مکان کی چھت پر چڑھ گیا تھا۔

ہمیں وہاں پرانے جلے ہوئے سامان کے قریب ایک نیم بے ہوش بلکہ قریب المرگ حالت میں پندرہ' سولہ سال کی لڑکی ملی تھی۔

"یہ زندہ ہے۔" تارا نامی ایک خاکروب چلایا تھا۔ رنجیت سنگھ نے بھی لڑکی کی نبض پر ہاتھ رکھ کر تارا کی تائید کردی تھی۔

"اسے جلدی سے پانی پت میڈیکل سینٹر لے جایا جائے۔" نائب صوبے دار رام داس نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔

جب ہم اس لڑکی کو مکان کی چھت سے نیچے لے کر آئے تھے تو خلافِ توقع قریبی گاؤں کے بہت سے ہندو' سکھ فسادی اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے' کلہاڑے لے کر بڑی دلیری سے ہمارے آگے کھڑے ہوگئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک ایسی انتقامی آگ تھی کہ انہوں نے یہ پروا بھی نہ کی تھی کہ ان کے سامنے نہ صرف فوجی بمع اسلحہ بلکہ دو خطرناک خونخوار جرمن کتے بھی کھڑے ہیں۔ رام داس نے ان فسادیوں کو کہا تھا کہ وہ اُس لڑکی کو ہسپتال لے جانے دیں۔

"صوبے دار' ہم سب مقامی ہندو' سکھ بھائیوں نے شپت اٹھائی تھی (قسم کھائی تھی۔) کہ اس گاؤں سے ایک بھی مسلمان زندہ بچ کر پاکستان نہیں جائے گا۔ یہ لڑکی نہ جانے کیسے بچ گئی؟ یہ بچ گئی تو ہماری شپت ادھوری رہ جائے گی۔" فسادیوں کے سکھ سرغنہ نے چلا کر کہا تھا۔

"دیکھو میرا کہا مانو اور راستہ چھوڑ دو ورنہ میں اگر اپنے فوجیوں کو حکم دوں تو یہ فوراً ہی فائر کھول دیں گے۔"

"تو خوش ہے پاکستان بننے سے؟" ایک گنجے ہندو بدمعاش نے چلاتے ہوئے صوبے دار سے سوال کیا تھا۔

"ظاہر بات ہے' جناح اور مسلمانوں نے مل کر ہمارے ہندوستان کے دو ٹکڑے کردیئے ہیں۔ اس بھیانک فیصلے سے بھلا کون ہندو' سکھ خوش ہوگا لیکن یہ حکومت کا فیصلہ ہے اور میں حکومت کا ملازم ہوں' میں تمہیں اس بچی کو مارنے کی اجازت نہیں دے

سکتا۔“

نائب صوبے دار رام داس کی لمبی تمہید سن کے فسادیوں کا سرغنہ بولا تھا۔ ”اچھا تو ہم سے ضد لگائے گا تو سمجھ لے جہاں آٹھ دس ہم گریں گے تو تیری یہ ساری بھنگیوں کی فوج اور یہ سارے سپاہی ان دونوں جرمن کتوں کے ساتھ کتے کی موت مریں گے......“ یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھ موجود ساتھیوں کو دیکھ کر چلایا تھا۔ ”مارو ان کو......“ اور اب نجانے کہاں سے کچھ بندوق والے فسادی بھی آ کر ان میں شامل ہو گئے تھے۔

”خبردار......“ صوبے دار نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پستول کا فائر ہوا میں کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”یاد رکھو‘ میں نے اپنی پانی پت کینٹ کی بلوچ رجمنٹ کی یونٹ میں یہ نوٹس لکھوا دیا تھا کہ اگر ہم مخصوص وقت تک واپس نہ آئیں تو ہمارے پیچھے جدید اسلحہ سے لیس فوجیوں کا پورا ٹرک بھیج دینا۔ ہمارے اُس مخصوص وقت پر نہ آنے کی صورت میں سمجھ لینا کہ ٹانڈا سنگھ گاؤں میں ہمارے ساتھ کچھ برا ہوا ہے۔ سوچ لو‘ میں یہ تمہارے فائدے کے لیے وارننگ دے رہا ہوں۔“ رام داس‘ نائب صوبے دار کی یہ بات سن کر وہاں موجود تمام فسادی آپس میں کچھ صلح و مشورہ کرنے لگے تھے لیکن انہوں نے ہمارے گرد سے گھیرا ختم نہیں کیا تھا۔ رام داس بہت ذہین اور ہوشیار انسان تھا‘ اس نے اسی دوران بڑے طریقے سے ٹرک پر آ کر پانی پت کینٹ پر اطلاع دے دی تھی کہ یہاں حالات بہت خراب ہیں‘ فوری طور پر تیس پینتیس اسلحہ بردار فوجی بھیجو اور پھر اس نے فسادیوں کو نت نئے طریقے سے باتوں میں اس غرض سے الجھائے رکھا تھا کہ پانی پت کینٹ سے فوجیوں کی تازہ کمک آ جائے اور شکر ہے کہ کینٹ سے واقعی فوجی جوان ہماری مدد کے لیے آ گئے تھے۔

ان فوجی جوانوں کی آمد کے بعد بلوائیوں نے بجائے پسپا ہونے کے اپنے اور ساتھیوں کو بلا کر مختلف جگہ آڑ لے کر ہم پر حملہ کر دیا تھا جبکہ ہم کھلے علاقے میں تھے۔ مختصر یہ کہ ہم بڑی مشکل سے ٹانڈا گاؤں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس لڑائی میں دو طرفہ فائرنگ کے تبادلے کے دوران ہماری طرف کے چار خاکروب‘ ایک فوجی اور ایک جرمن کتا مارے گئے تھے جبکہ بلوائیوں کے جانی نقصان کا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔

رنجیت سنگھ نے ہماری جانب سے فسادیوں کے خلاف بہت اچھا مقابلہ کیا تھا بلکہ اس نے بے ہوش مسلمان لڑکی کے اوپر لیٹ کر گولیاں بھی کھائی تھیں اور بری طرح زخمی ہوا تھا جبکہ میرے کندھے پر بھی ہلکے زخم آئے تھے۔ میں نے زخمی حالت میں ٹرک کو بجلی کی مانند اس خون آشوب علاقے سے نکال لیا تھا۔ شدید زخمی رنجیت سنگھ اور اُس نیم مردہ بچی کو نائب صوبے دار رام داس نے ملٹری ہاسپٹل میں خصوصی طور پر علاج معالجہ کے لیے داخل کروا دیا تھا۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد میں اور چند دوسرے مسلمان فوجی اس ہندو نائب صوبے دار رام داس کا خصوصی شکریہ ادا کرنے اس کے پاس گئے تھے۔ اس نے وہاں ہم سپاہیوں کے سامنے بہت سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

”میں اگرچہ پاکستان کے قیام سے دلی طور پر خوش نہیں ہوں لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ میں برٹش حکومت کا وفادار سپاہی ہوں۔“

•......•......•......•

رنجیت سنگھ اور وہ لڑکی فوجی ہسپتال کے بہترین علاج کی وجہ سے بہت جلد صحت یاب ہو گئے تھے۔

اس لڑکی نے بعد میں اپنا نام صفیہ بتاتے ہوئے یہ کہانی سنائی تھی کہ ”جب بلوائیوں نے اُن کے گھر پر حملہ کیا تو وہ اتفاق سے اوپر چھت والے کمرے میں تھی اور ڈر کے مارے وہیں دبک کر چھپ گئی تھی اور پھر آگ لگنے کے سبب اُس کے اٹھتے دھوئیں سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔“

صفیہ کو جب ملٹری ہسپتال والوں نے ڈسچارج کر دیا تھا تو میں نے اور رنجیت سنگھ نے اپنے تعلقات کی بنا پر اسے پانی پت ملٹری ہاسپٹل کے نرسنگ ٹریننگ سینٹر میں ایک بوڑھی نرس جو کہ پارسی تھی‘ اس کے پاس عارضی طور پر رہائش اختیار کروا دی تھی تاکہ وہ وہاں محفوظ رہے۔ ہم نے اس پارسی نرس سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ہفتہ‘ دس دن میں صفیہ کو مہاجر کیمپ میں کسی مسلم فیملی کے حوالے کر دیں گے لیکن ہمارے اس عمل کے دو روز بعد ہی ہوا کچھ یوں کہ رنجیت سنگھ اچانک سخت بیمار ہو گیا اور اسے چھٹی لے کر جانا پڑا۔ دوسری طرف میں اپنی ڈیوٹی اور زندگی کے ہنگاموں میں کچھ ایسا مشغول ہوا کہ مڑ کر اس پارسی نرس کے پاس جا کر صفیہ کی خبر تک نہ لی تھی۔

•......•......•......•

اب یہ بات ہے 16 جولائی 1947ء کی جب میں اپنا ٹرک ٹھیک کروانے کے لیے پانی پت کینٹ سے کچھ دور فوجی ورکشاپ جا رہا تھا کہ مجھے ایک جاننے والے نے رنجیت سنگھ کا یہ پیغام دیا تھا کہ وہ مجھے فوری طور پر اپنے گھر بلا رہا ہے۔

میں نے ٹرک ورکشاپ میں چھوڑا اور دو تین جگہ تانگے تبدیل کر کے سیدھا رنجیت سنگھ کے گاؤں پہنچا‘ وہاں وہ بستر سے لگا انتہائی کمزور نظر آ رہا تھا۔ میں اسے اس حال میں دیکھ کر حیران پریشان ہوا اور اس سے پوچھا تھا۔ ”یار‘ یہ تجھے کیا ہوا ہے؟“

”اس نے بتایا تھا۔ ”یار......اُس بچی صفیہ کو بچاتے ہوئے جو گولیاں مجھے لگی تھیں‘ ان کے زخم باہر سے تو ٹھیک ہو گئے تھے لیکن اندر سے وہ ٹھیک نہ ہو سکے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ ان زخموں کی وجہ سے میری اندرونی ہڈیوں میں پیلا پانی (پیپ) پڑ گیا ہے۔“ پھر اس نے درد کی شدت سے آہ بھری تھی اور ذرا دیر کی خاموشی کے بعد بولا تھا۔

”یار محمد......! اُس بچی صفیہ کا کیا بنا؟ میں تو اپنی بیماری کی وجہ سے وہاں نہ جا سکا۔ تُو گیا کہ نہیں؟“

”نہیں رنجیت‘ میں تو نہیں گیا۔“ میں نے کچھ شرمندگی کے ساتھ دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

”او یار‘ مار گئے‘ گرو کی سوگند‘ میں تو سوچ رہا تھا کہ تو وہاں ڈیوٹی پر ہے‘ تُو گیا ہو گا مگر یہ تو بہت برا ہوا۔“

”یار رنجیت سنگھ‘ تجھے تو معلوم ہے کہ آج کل میری ڈیوٹی کتنی سخت اور کٹھن ہو گئی ہے‘ میں مہاجرین کی منتقلی کے عمل میں دیگر فوجیوں کے ساتھ سارا دن اتنا مصروف رہتا ہوں کہ اپنا بھی ہوش نہیں رہتا ہے۔“

”اچھا‘ تیرا کیا خیال ہے‘ اس پارسی نرس نے صفیہ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا؟ ہم تو اس سے یہ کہہ کر آئے تھے کہ اِس بچی کو ہفتہ‘ دس دن بعد لے جائیں گے؟“ رنجیت کے اس سوال پر میں خاموش رہا تھا۔ ”چل‘ ابھی میرے ساتھ پانی پت چل۔“ رنجیت سنگھ نے اپنی کمر بستر سے گھوڑے کی مانند علیحدہ کی تھی اور کھڑے ہو کر اپنا ململی کرتا پہنا تھا۔

”رنجیت...... یہ تو کیا کر رہا ہے؟ تُو‘ تو پہلے ہی بہت بیمار کمزور ہے‘ ان حالات میں اُس نرس کے پاس جانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔“ میں نے اسے سمجھا کر روکنے کی کوشش کی تھی۔

”اوئے یار...... چھوڑ اس بات کو...... وہاں

پہنچیں گے کس طرح؟ کسی بھی صورت میں ہمارا اس وقت وہاں جانا ضروری ہے۔ ارے او پاگلہ...... دیکھ صفیہ کو ہم کس مصیبت سے ٹانڈا گاؤں کے بلوائیوں سے چھڑا کر لائے تھے' ہمارے کئی جوان اور میرا محبوب کتا مارا گیا' کیا اِس دن کے لیے ہم نے اُس صفیہ کو ان غنڈوں کے چنگل سے چھڑایا تھا؟ چل جلدی کر۔'' اس نے میرا کاندھا تھپتھپا کر کہا تھا۔

رنجیت سنگھ اور میں جس مشکل سے اس نرسنگ سینٹر پہنچے' اس کا میں یہاں ذکر نہیں کر رہا لیکن وہ سفر کسی عذابِ عظیم سے کم نہ تھا۔ بہرحال جب ہم شام کو اس نرسنگ سینٹر پہنچے تو اس بوڑھی پارسی نرس نے ہم دونوں کی شکل دیکھتے ہی شدید برہمی کے عالم میں لعن طعن کی تھی...... جب اس کا غصہ کچھ کم ہوا تھا تو رنجیت سنگھ نے پوچھا تھا۔

''صفیہ کہاں ہے؟''

جواباً اُس بوڑھی نرس نے ہمیں قریب بلا کر بہت رازداری سے کہا تھا۔ ''اس لڑکی کو یہاں ہندو ظاہر کر کے رکھا ہوا ہے' اسے فوراً یہاں سے لے جاؤ۔ اگر کسی کو یہاں ذرا بھی یہ بھنک پڑ گئی کہ یہ لڑکی مسلمان ہے تو اُس کے ساتھ میری بھی گردن کٹے گی۔''

تھوڑی دیر بعد صفیہ ہمارے سامنے ہندوانہ لباس میں ماتھے پر تلک لگائے موجود تھی۔ اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ وہ نہائی دھوئی' صاف ستھری تو اچھی لگی لیکن مجھے اس کا ہندوانہ روپ اچھا نہ لگا تھا۔

جب ہم نرسنگ سینٹر سے صفیہ کو لے کر باہر آئے تھے تو رنجیت سنگھ نے مجھے کہا تھا۔ ''یار محمد......! تو اَب اِس بچی کو یا تو بحفاظت پاکستان پہنچانے کا بندوبست کر یا پھر ہو سکے تو اِس سے نکاح کر لے۔ مجھے نہ جانے کیوں اس پر بہت ترس آ رہا ہے۔''

''نہیں یار' میں اِس سے نکاح کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔'' میں نے اپنی محبت' اپنی منگیتر کو یاد کر کے فوراً ہی انکار کر دیا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ ہم اس مسئلے پر مزید بات کرتے' اچانک ہی رنجیت سنگھ کی طبیعت بگڑنے لگی تھی' اس نے اپنی کمر پکڑ لی۔ یہ میرے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ میں اسے دوبارہ ملٹری ہاسپٹل لے کر گیا تھا' وہاں اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں اس لمحے سمجھ گیا تھا کہ اس نے اپنے گاؤں سے لے کر پانی پت تک کا طویل اور کٹھن سفر کیا ہے جس کی وجہ سے اس کی کچھ سنبھلی طبیعت میں بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ صفیہ میرے ساتھ ساتھ ہندوانہ لباس پہنے پھر رہی تھی' اُسے بھی میں کسی کے آسرے پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے رنجیت سنگھ کو ملٹری ہاسپٹل میں داخل کروا دیا تھا' وہاں اس نے مجھ سے بڑی دلخراش باتیں کی تھیں۔

''یار میرے...... میرا اب بچنا مشکل ہے' لگتا ہے' یہ میری تیری آخری ملاقات ہے اور ہاں' میں نے کبھی تیرا بحیثیت دوست دل دکھایا ہو تو مجھے معاف کر دینا اور ہاں تو اب میری فکر چھوڑ اور فوری طور پہ صفیہ کو اپنے دل کی تسلی کے مطابق کسی اچھی' باعزت مسلمان فیملی کے حوالے کرنے والا کام کر۔''

میں اُسی وقت صفیہ کو لے کر ایک ایسے مقام پر پہنچا تھا جہاں سے مسلمانوں کے کچھ قافلے پاکستان روانہ ہو رہے تھے کہ اچانک ایک باریش شخص جس نے اپنے ہاتھوں میں تسبیح بھی پکڑی ہوئی تھی جس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی' ایک کالا لنگڑا لڑکا اور ایک عورت برقع پہنے کھڑی تھی' اس باریش شخص نے مجھے انتہائی رندھی ہوئی پریشان کن آواز میں پکارا تھا۔

''[illegible] بیٹا......! آپ نے فلاں ناک نقشے اور [illegible] والی کوئی لاوارث لڑکی یہاں اریب قریب میں [illegible] دیکھی ہے؟''

''نہیں بزرگو......! میں نے جیسا آپ نے حلیہ بتلایا ہے' ویسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی' میں تو خود اس لاوارث لڑکی کو کسی شریف' پڑھی لکھی فیملی کے حوالے کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔''

''یہ کون ہے بیٹا؟'' اُس نے صفیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا تو میں نے مختصراً اُسے صفیہ کی ساری رام کہانی سنا دی تھی...... اور پھر یہ ہوا تھا کہ اس آدمی کے ساتھ کھڑی برقع پوش عورت نے صفیہ کی کہانی سن کر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا تھا اور اپنے ساتھ کھڑی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی تھی۔

''سیما......! دیکھا...... یہ صفیہ ہماری بیٹی نائلہ کی ہم عمر اور بالکل اُسی کی طرح ہے۔ ہائے...... نہ جانے کہاں گئی میری بیٹی؟'' اِس کے ساتھ ہی اُس عورت نے واویلا شروع کرتے ہوئے اپنے خاوند کا گریبان پکڑ کے کہا تھا۔ ''سنو' آج اگر مجھے میری [illegible] ملی تو یاد رکھو' میں اِدھر ہی اپنے سینے میں چھرا گھونپ کر جان دے دوں گی......''

''مجھے بڑھاپے میں صدمہ پہ صدمہ نہ دو [illegible]...... میں پہلے ہی مسلسل صدموں کے تھپیڑے کھا کھا کر زندگی اور صحت کے لحاظ سے آدھا ہو چلا ہوں اور اب میری طرح تم بھی اس بات پہ یقین کر لو کہ ہماری بیٹی نائلہ کو ظالم ہندو یا سکھ اٹھا کر لے گئے [illegible]......''

''بزرگو......! آپ کی بیگم اگر اِس لڑکی صفیہ کو [illegible] کی طرح کہہ رہی ہیں تو خدا کے لیے' اِسے [illegible] کر پاکستان لے جائیں' یوں سمجھ لیں کہ [illegible] آپ کی نائلہ بیٹی ہے۔''

''نا بیٹا......! ایسی بات نہ کرو' میری بیٹی تو نائلہ تھی' یہ بچی اُس کی جگہ کیسے لے سکتی ہے؟''

''میرا مطلب ہے' آپ اِسے اپنی منہ بولی بیٹی بنا لیں۔'' جواباً انہوں نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ صفیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا تھا۔ ''اَب تم میری بیٹی کی طرح ہو' ہمیشہ میری بیٹی ہی بن کر رہنا۔''

اُن صاحب کا نام کرم دین تھا' وہ میرٹھ شہر کے ایک اسکول میں ٹیچر تھے اور اَب اُن کی پہلی منزل لاہور کا کوئی مہاجر کیمپ تھا۔ اگلی منزل کا انہوں نے کچھ نہ بتلایا تھا۔ ظاہر ہے' بتلاتے تو تب جب انہیں اس بارے میں خود کچھ معلوم ہوتا۔

صفیہ اُن کے ساتھ بیل گاڑی میں بیٹھنے لگی تھی تو وہ میرے سینے سے لگ کر بہت روئی تھی۔ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد مجھ سے بولی تھی کہ آپ پاکستان آ کر مجھ سے ضرور ملنا۔ میں نے اسے نشانی کے طور پر اپنی وردی میں سے بلوچ رجمنٹ آرمی کا نشان دیا تھا جبکہ اس نے مجھے اپنا دوپٹہ دیا تھا اور پھر بیل گاڑی کرم دین صاحب کی فیملی اور صفیہ کو لیے' میری بے شمار دُعاؤں کے ساتھ پاکستان کی جانب گامزن ہو گئی تھی۔ میں صفیہ کو اور وہ مجھے بہت دور تک دیکھتی رہی تھی اور پھر بالآخر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ جب وہ بیل گاڑی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں سے رہا نہ گیا تھا' وہ بھی رو دی تھیں۔ میں نے صفیہ کی جانب سے دی گئی دوپٹے کی نشانی سے اپنے آنسوؤں کو پونچھا تھا اور اس بات کی اطلاع دینے رنجیت سنگھ کے پاس گیا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ وہ زندگی سے رشتہ توڑ چکا ہے۔ میں ایک بار پھر اب اپنے دوست کی جدائی پر رو پڑا تھا۔

•......•......•......•

تقسیمِ ہند میں جہاں اور چیزیں جدا جدا ہوئیں' وہاں فوج کا بھی بٹوارہ ہوا تھا۔ اسی کے نتیجے میں مجھے ایک ''ریلیز لیٹر'' ملا تھا کہ ''اب تم پاکستان جاکر بلوچ رجمنٹ کی مسلم یونٹ 27 جوائن کرو۔''

اس جوائننگ کے لیے ہمیں دس روز کا وقت دیا گیا تھا۔ اس وقفے کے درمیان ہم فوجیوں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ پاکستان ہجرت کی تیاری کرنی تھی۔ اس مقصد کے لیے جب میں اپنے گاؤں پہنچا تو وہاں کا وہی ٹانڈا سنگھ گاؤں والا نقشہ تھا' یہاں بھی ہندو' سکھ بلوائیوں نے مل کر ہمارے سارے مسلمان خاندانوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بناڈالا تھا۔ میرے خاندان کا بھی کوئی فرد زندہ نہ بچا تھا۔ میری محبت' میری منگیتر بھی ماری گئی تھی۔ میں اپنے گاؤں کی لٹی پٹی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر نیم پاگل سا ہوگیا تھا اور پھر جب دو روز بعد کچھ حواس بحال ہوئے تھے تو میں نے سوچا تھا کہ مجھے اگر پتا ہوتا کہ میرے ساتھ یہ سب ہوگا تو میں رنجیت سنگھ کے کہنے پر صفیہ ہی سے نکاح کرلیتا۔ اَب میں نے دلی طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ میں جلد از جلد پاکستان پہنچ کر ماسٹر کرم دین کو ڈھونڈ کر صفیہ سے شادی کرلوں گا۔

•......•......•

قصہ مختصر یہ کہ میں بخیریت پاکستان پہنچ گیا تھا' یہاں پہنچ کر میں نے ماسٹر کرم دین کو عارضی' مستقل مہاجر کیمپوں' خصوصاً میرٹھ سے ہجرت کرنے والے لوگوں' اسکول ٹیچروں سے' مرکزی صوبائی ایجوکیشنل دفاتر' سب سے ماسٹر کرم دین کا حلیہ بتلا کر بہت پتا کیا' ڈھونڈا لیکن وہ نہیں ملے تھے۔ اس کے بعد بھی میں نے صفیہ اور ماسٹر کرم دین کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک نہ چھانی تھی۔ میں ہر وقت صفیہ کی دی ہوئی نشانی دوپٹے کو حسرت سے دیکھتا اور اسے اپنے ہی ہاتھوں کھونے پر پچھتاتا تھا۔

میں نے صفیہ کی آس' انتظار میں کسی لڑکی سے شادی نہیں کی تھی۔ میں فوجی بیرک میں اکیلا چھڑا چھانٹ رہا کرتا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے میں نے ماسٹر کرم دین اور اُن کے ساتھ دیکھے ہوئے کالے لنگڑے کا حلیہ بیان کرتے ہوئے بے شمار لوگوں کے سامنے اپنا دکھڑا رویا تھا۔ انہی میں ایک فوجی سپاہی سرور بھی تھا جو شرابی ہونے کے علاوہ بازارِ حسن جانے کا بھی شوقین تھا۔

ایک روز سرور میرے پاس آیا اور مجھے بڑی عجیب ناقابلِ یقین خبر سنائی کہ ''جس ماسٹر کرم دین اور لنگڑے لڑکے کا ذکر تو کررہا ہے' میرا شک ہے کہ وہ قریبی شہر کے جسم فروشی والے اڈے کا ماسٹر نامی دلال ہے اور اس کے ساتھ وہ لنگڑا لڑکا بھی اس کام میں اس کا مددگار ہوتا ہے۔''

میرا ذہن سرور کی اس بات کو تسلیم نہیں کررہا تھا لیکن دل مجھے اکسا رہا تھا کہ چلو' چل کے دیکھتے ہیں' ہوسکتا ہے کہ سرور سچ ہی بول رہا ہو۔ میں نے اپنے بیرک کے چند فوجی ساتھیوں سے سوال کیا تھا کہ سرور سپاہی جو بات کررہا ہے' آیا وہ ڈرامہ کررہا ہے یا اس میں کچھ سچ بھی ممکن ہے؟''

میرے ساتھیوں نے بتایا تھا کہ ''سرور سپاہی بہت سی برائیوں کے باوجود دل کا اچھا اور صاف گو ہے' اس کی بات میں کچھ وزن ضرور ہوسکتا ہے۔

دوسرے دن میں اپنا حلیہ خاصا تبدیل کرکے سپاہی سرور کے ساتھ قریبی شہر کے اس فحاشی والے اڈے پر گیا تھا' وہاں واقعی میرے پاؤں سے یہ منظر دیکھ کر زمین نکل گئی کہ ماسٹر کرم دین ایک نئے روپ میں بالکل ایک منجھے ہوئے دلال کی طرح اپنے کندھے پر رومال ڈالے گاہک کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ اب دل کہے کہ یہ وہ ماسٹر کرم دین نہیں ہوسکتا لیکن میری آنکھیں اور شعور دھوکہ نہیں کھا سکتا تھا' وہ واقعی ماسٹر کرم دین تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔

''ہاں بھئی' یہی ہے جسے تو تلاش کررہا تھا؟''

سرور کے اس سوال پر میں ''ہاں۔'' کہتا ہوا اپنا دھڑکتا ہوا دل پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ ''میرا دل کرتا ہے' اس دھوکے باز ماسٹر کرم دین کا میں گلا گھونٹ دوں' اس نے نہ جانے صفیہ کا کیا حال کیا ہوگا؟'' میں بہت جذباتی ہورہا تھا۔

''ایسا پاگل پن والا جذباتی فیصلہ نہ کر جس سے تو صفیہ سے کبھی نہ مل سکے تو ان لوگوں کا بال بھی ٹیڑھا نہیں کرسکتا۔'' سرور نے مجھے سمجھانا چاہا تھا۔ ''ویسے بھی اگر تو نے اس موقع پر اس بدمعاش دلال کو پکڑا تو یہ لامحالہ تیری صفیہ کو آگے پیچھے کردے گا اور دوسرے تو اس کا یہاں کر بھی کیا لے گا' یہ جدی پشتی گورنمنٹ کے پرمٹ شدہ جسم فروشی اڈے والے ہیں' ان کا بڑا اثر رسوخ اور واقفیت ہوتی ہے۔''

''اچھا' یہ بتلا کہ تیرا کیا خیال ہے' یہ خبیث دلال مجھے پہچان لے گا؟'' میں نے سرور سپاہی سے پوچھا تھا۔

''یار' میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ اس وقت تو پہلے کے مقابلے میں بس تیری داڑھی منڈھی ہوئی ہے' اس کے ذہن میں تیری پچھلے چار سال والی تصویر آسکتی ہے جہاں تو نے اتنا صبر کیا ہے تو اب تھوڑا اور کرلے' مہینہ بھر اسی شہر میں رہ کر اپنے یہ فوجی کٹ بال اور شیو بڑھا تاکہ جب ہم صفیہ کی کھوج میں اوپر جائیں تو یہ تجھے پہچان نہ لے اور ہاں' یہ بھی یاد رکھ کہ ہمیں اوپر کے کوٹھے میں جانے کے لیے اسی ماسٹر کرم دین دلال سے رابطہ کرنا ہوگا' یوں سمجھ کہ ہر قدم بڑی احتیاط سے اٹھانا ہوگا۔''

میں نے سرور کے مشورے یا پلان پر عمل کرنے کے لیے اپنا بیماری کا میڈیکل اپنی یونٹ میں بھیج دیا تھا تاکہ مجھے وہاں سے چھٹیاں مل جائیں اور پھر میں نے اسی علاقے کے قریب ایک ہوٹل میں عارضی کمرہ رہائش کے لیے لے لیا تھا۔ اس دوران میں سرور سپاہی ہر دوسرے تیسرے روز میرے پاس ہوٹل میں چکر لگالیتا تھا۔ میں اسے ماسٹر کے کوٹھے میں جانے کے لیے اپنی جیب سے پیسے دیتا تھا کہ وہ وہاں جاکر کھوج لگائے کہ وہاں صفیہ یا نائلہ نام کی کوئی طوائف ہوتی ہے کہ نہیں؟

اور پھر سرور نے مجھے یہ خبر سنائی تھی کہ ''تو نے مجھے صفیہ یا نائلہ نامی لڑکی کا حلیہ بتایا ہے' ویسی ایک لڑکی موجود تو ہے لیکن اس کا نام گلبہار ہے اور اس کے دو چھوٹے بچے ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق ماسٹر دلال کے کوٹھے میں نائلہ یا صفیہ نام کی کوئی لڑکی موجود نہیں ہے۔''

میں نے دوبارہ تصدیق کے لیے سرور سے گلبہار کا ناک نقشہ' گفتگو' لہجہ پوچھا تھا اور سرور نے جیسا انداز' گفتگو' لہجہ گلبہار کا بتلایا' وہ ہو بہو صفیہ والا تھا۔ مجھے اب سو فیصد یقین ہو چلا تھا کہ ہو نہ ہو' وہ ضرور صفیہ ہی ہے۔

دو روز بعد میں نے ہوٹل کے ایک بیرے کو پیسے دے کر اپنے ساتھ لیا تھا اور اسے کہا تھا کہ مجھے کسی طریقے سے ماسٹر دلال کے کوٹھے میں گلبہار کے پاس لے جائے۔

بیرے نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ آپ چہرے پر چادر لپیٹ لیں اور آپ کو میرے پیچھے رہنا ہوگا' میں خود ماسٹر سے یہ بات کروں گا کہ میں نے آپ کو جسمانی عیاشی کے لیے گھیرا ہے۔

میں چادر اوڑھے' کانپتی ٹانگوں کے ساتھ ماسٹر کرم دین سے دور کھڑا تھا۔ بیرے سے ذرا دیر کی گفتگو کے بعد وہ میرے قریب آیا تھا اور اس نے

دلالوں والے مخصوص لہجے میں کہا تھا۔ ''جناب عالی' چہرہ نہ چھپاؤ' میں بھی تو ذرا دیکھوں کہ ہمارے دروازے پر آج کون سا نیا گاہک سکون لینے آیا ہے؟''

میں نے اپنے چہرے سے ذرا سی چادر سرکائی تھی تو وہ مجھے اس طرح غور سے دیکھنے لگا تھا جیسے کہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

''مجھے یاد پڑتا ہے' میں نے یہ چہرہ کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟'' وہ اپنے دماغ پر زور دینے لگا تھا۔

''ماسٹر جی' اسے اوپر جانے کا راستہ دیں' یہ اپنا ہی بندہ ہے۔''

ہوٹل کے ویٹر کے کہنے پر اگرچہ ماسٹر نے مجھے کوٹھے پر چڑھنے کو کہا تھا لیکن میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف محسوس کیا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے اور مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں جب کوٹھے میں داخل ہوا تو میری نظروں کے سامنے بالکل درمیان میں ایک تخت پر وہی عورت بیٹھی تھی جس کو ماسٹر کرم دین نے سرحد پار اپنی بیگم بتایا تھا۔ اس کوٹھے کا ماحول بڑا گندہ اور کراہیت انگیز تھا۔ میں ذاتی طور پر اس ماحول سے نفرت کرتا تھا لیکن میری مجبوری مجھے کہاں لے آئی تھی؟ اسی وقت اس لنگڑے کی آمد ہوئی تھی اور اس نے مجھ سے کچھ روپے بخشش لے کر کہا تھا۔ ''تمہارا گلبہار کے پاس عیاشی کا وقت صرف پندرہ منٹ ہے' پندرہ منٹ کے بعد ایک سیکنڈ بھی زیادہ ہو گیا تو اور پیسے دینے پڑیں گے۔ اندر گھڑی لگی ہوئی ہے۔''

میری ٹانگیں ہر قدم اٹھاتے ہوئے لڑکھڑا رہی تھیں۔ مجھے اس لمحے یہ خیال بھی ناگ کی طرح ڈس رہا تھا کہ اندر صفیہ ہی ہے یا پھر کوئی اور؟ بہر حال میں نے جیسے ہی وہ دروازہ کھولا تھا تو اندر واقعی چار سال پہلے والی ٹانڈا سنگھ گاؤں کی صفیہ کھڑی تھی۔ اس کا سارا حسن وقت کے گرم تھپیڑوں' کوٹھے کے کراہیت انگیز ماحول نے برباد کر دیا تھا۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی صفیہ نے بری طرح سے چونک کر مجھے اس طرح دیکھا تھا جیسے اس نے مجھے پہچان لیا ہو اور پھر وہ چیخ مار کر میرے سینے سے لپٹ کے رونے لگی تھی۔

''آپ نے میری جان تو بچائی تھی لیکن جان بچانے کے بعد مجھے کس دوزخ میں دھکیل دیا ہے؟''

اس نے روتے روتے بتایا تھا کہ بظاہر شریف نظر آنے والا یہ ماسٹر کرم دین ایک اچھے مسلمان کا روپ دھار کر ملنے والا اصل میں شیطان ہے۔

میں نے صفیہ کو اپنی روداد بھی سنائی تھی اور اسے باور کروایا کہ میں نے اسے کہاں کہاں نہیں تلاش کیا؟ وہ مجھ سے لپٹ کر مسلسل روئے جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ ''کاش' تم لوگوں نے مجھے ٹانڈا گاؤں کے سکھوں' ہندوؤں سے زندہ نہ بچایا ہوتا' وہاں میں ایک بار مرتی' یہاں میں اپنوں کے ہاتھوں روز مرتی ہوں......'' اس نے مجھے بتایا تھا کہ ''بہروپیے ماسٹر کرم دین کا اصل کام بچوں کو علم دینا نہیں' انہیں جسم فروشی کے دھندے میں لا کر برباد کرنا ہے اور اس کے ساتھ جو عورت ہے' وہ ماضی کی نامی گرامی طوائف رہ چکی ہے اور مجھ جیسی بے آسرا لڑکیوں کو پھانسنا' ورغلا کر اس دھندے میں لانا اس کا کام ہے۔''

یہ تمام روداد سن کر میں نے بہت سچائی اور یقین کے ساتھ کہا تھا۔ ''صفیہ' میں تم سے اس حالت میں بھی نکاح کرنے پر تیار ہوں۔''

''میں یہاں چار سال سے اس جسم فروشی والے کام میں مصروف ہوں اور اسی کام کے نتیجے میں دو

ناجائز بچوں کی ماں بن چکی ہوں' میں اب تمہارے قابل نہیں رہی' میری تقدیر میں اپنوں کے ہاتھوں برباد ہونا لکھا تھا' سو ہو رہی ہوں......'' ابھی صفیہ نے بات ختم کی تھی کہ بند دروازے کے باہر سے آواز آئی تھی۔

''دروازہ کھول...... نیا گاہک آیا ہے...... اپنے عاشق کو باہر نکال......''

''اوہ' ماسٹر آ گیا ہے۔ تم جلدی سے یہاں سے جاؤ اور خدا کے لیے' یہاں آئندہ قدم نہ رکھنا۔'' صفیہ نے روتے ہوئے میرے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

میں صفیہ کے کمرے سے باہر نکلا تھا تو ماسٹر کرم دین میری نگاہوں کے سامنے بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔ اس نے بڑے ڈھیٹ انداز میں پان چباتے ہوئے کہا تھا۔

''فوجی......! میری یادداشت والے کیمرے میں تیری تصویر آ گئی ہے' مل لیا تو نے صفیہ سے؟''

''ذلیل انسان...... تو نے ایک معصوم' بے سہارا مسلمان لڑکی کی عزت' زندگی برباد کر دی ہے تو نے تو کہا تھا کہ یہ میری بیٹی کی طرح ہے؟'' میں اس وقت اتنے غصہ میں تھا کہ میں نے طیش میں آ کر اس کی جانب تھوک دیا تھا۔

''فوجی......! تو یہاں سے فوراً چلا جا' یہی تیرے لیے بہتر ہے' جہاں تک رہا تیرے اس سوال کا جواب کہ میں نے صفیہ کو بیٹی کی طرح کہا تھا تو ہاں' یہ میری بیٹی کی طرح تھی لیکن بیٹی تو نہیں ہے۔''

اس روز کے بعد میں اپنوں کے ہاتھوں لٹی مظلوم صفیہ کے پاس اس سے ملنے کبھی نہیں گیا تھا...... اور اس کی نشانی دوپٹہ بھی ایک قبرستان میں گہرا گڑھا کھود کر دفنا دیا تھا۔

سپنا ٹوٹ گیا

آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا
اور...... سوچ رہا تھا کہ
فراق یار نے کیا سے کیا بنا دیا ہے
مجھے اپنی خستہ حالی پر ترس آ رہا تھا
یکا یک آئینے میں دیکھا کہ
کاسنی چنری کی اوٹ' وہی ابھری چہرہ
ہوا دیتے ہوئے گیسو
اور ہمیشہ کی طرح اُن نشیلی آنکھوں میں
گہرا کجرا چمکاتی ہوئی
میرے آنگن میں اتر آئی ہے
پلک جھپکتے ہی میں پیچھے پلٹا
اس نہایت اضطرابیت اور بدحواسی میں
ہاتھ سے آئینہ چھوٹ گیا
اف...... سارا سپنا ٹوٹ گیا

عبدالرزاق گویا' بھاگناڑی

ملک صفدر عباس اعوان

کیبن نمبر 105

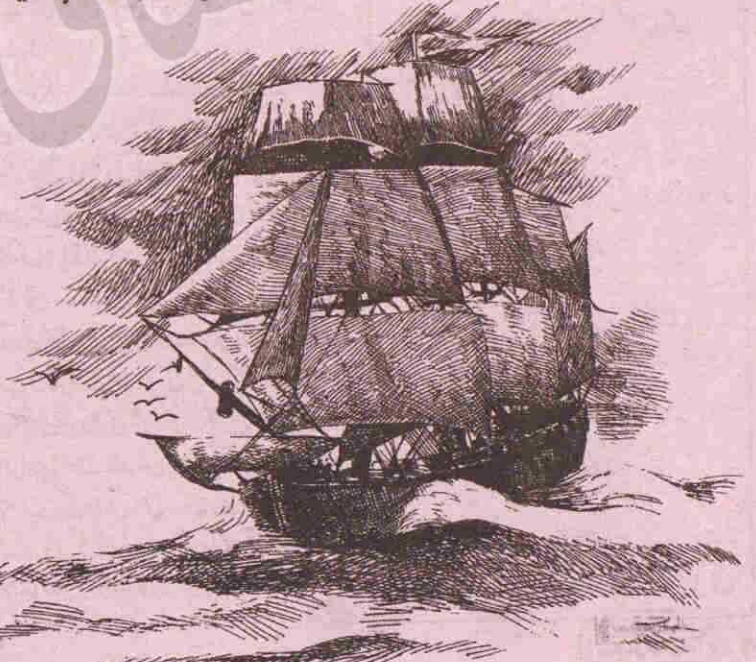
حامد علی سید کا خیال

میں اکیلا تو نہیں رات کے سناٹے میں
اک اجالا ہے مری ذات میں رہنے والا

ایک بحری جہاز میں سفر کرنے والی روح کی کہانی، مسافر کی زبانی

ایک دن میں اور میرے دوست اپنے ایک اور دوست ہارون کے ہاں پارٹی پر گئے۔ پارٹی نہایت شاندار تھی، یہ پارٹی اس نے بیرونِ ملک سے واپسی کے فوراً بعد کی تھی۔ وہ تھوڑے عرصے پہلے ہی امریکہ سے آیا تھا۔ اس کے باپ کا بیرونِ ممالک میں بہت بڑا بزنس تھا اس لیے وہ بھی اپنے باپ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتا تھا۔

ہم سب دوستوں نے پارٹی میں خوب ہلہ گلہ اور انجوائے کیا۔ پارٹی رات گئے تک جاری رہی تھی پھر آہستہ آہستہ پارٹی کا جوش ٹھنڈا پڑتا گیا اور ہم سب



بھی تھک کر اپنے اپنے گھروں کو جانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ ہارون کو بھی اس بات کا اندازہ ہو چلا تھا کہ اب ہم سب جانے کے لیے پر تول رہے ہیں، اس نے ہماری تھکن و بے زاری دیکھی تو اچانک گویا ہوا۔

"دوستو......! تم لوگوں نے کبھی بھوت، آسیب وغیرہ دیکھا ہے؟" بھوت، آسیب کے ذکر پر ہم حیران ہوئے اور مذاق اڑانے والے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ تم اچانک بھوتوں کے بارے میں کیوں سوچنے لگے؟ خیر تو ہے؟" میں بولا۔ "کیا رات کے اس پہر ہمیں ڈرانے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "بھوتوں پر تم سب کا یقین تو ہے نا؟"

"ہاں، وہ تو سب کا ہی ہے۔" میرے ساتھ سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "لیکن خیر تو ہے، آخر تمہیں اچانک کیا ہو گیا ہے؟"

"اس بات کو چھوڑو، میری بات کا جواب دو۔" وہ بضد تھا۔

"کس بات کا جواب؟" اکرم بولا۔

"یہی کہ تم میں سے کسی نے بھی جن، بھوت کو دیکھا ہے یا نہیں؟"

"اللہ نہ کرے، کبھی ایسا واقعہ پیش آئے۔" میں نے کہا۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ رات کے اس پہر ایسی باتیں کر کے ہارٹ فیل کرانا چاہتے ہو؟"

"میں سنجیدہ ہوں۔" اس نے واقعی سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں، ایک بھوت دیکھا تو ہے، اب بھی میں کیا ہم سب دیکھ رہے ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جو ہمارے ہی سامنے کھڑا اوٹ پٹانگ باتیں بنا رہا ہے۔" میری بات پر سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

"تم میں سے کوئی میری بات کا سیریس جواب بھی دے گا یا نہیں؟"

"تم بچوں والی باتیں کر رہے ہو تو جواب بھی اسی طرح ملے گا۔" میں نے برا سا منہ بنا کر ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"بچوں والی باتیں؟" وہ ہنسا۔ "ہاں، تمہارے لیے یہ بچوں والی باتیں ہی ہو سکتی ہیں، تم پر کچھ بیتا جو نہیں ہے۔ ایسی باتوں کو میں بھی تم لوگوں کی طرح مذاق سمجھتا تھا مگر اب نہیں، تم سب یہ سن کر خوف سے اچھل پڑو گے کہ میرا واسطہ ایک بھوت سے پڑ چکا ہے۔"

"کیا......؟" ہم سب واقعی تقریباً اچھل پڑے تھے۔ ہماری حالت دیکھ کر ہارون ہنس پڑا۔

"دیکھا، میں نے کہا تھا، تم صرف بھوت کا نام سن کر ہی خوف زدہ ہو کر اچھل پڑے ہو، اگر تم میں سے کسی نے اسے دیکھ لیا ہوتا تو وہ اب تک اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوتا۔"

"اب ایسی بھی بات نہیں۔" وقار بولا۔

"تم مذاق کر رہے ہو اور ہمیں خواہ مخواہ خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔" میں نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے، ہم سب کی طرح تمہیں بھی نیند کی شدت نے تنگ کیا ہوا ہے اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔"

"تم پہلے میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ تو سن لو، بعد میں جو مرضی، کہہ لینا۔"

ہارون کی بات پر سب خاموش ہو گئے اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے سب کی نیند اڑ چکی ہے۔

"یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب میں بحری جہاز سے امریکہ جا رہا تھا۔ میں ہمیشہ بحری جہاز سے ہی امریکہ جاتا تھا، میرے ابو کا وہاں بہت بڑا بزنس ہے۔ میں ہمیشہ اپنے ابو کے ساتھ ہی امریکہ جاتا تھا

لیکن اس مرتبہ مجھے اکیلے جانا پڑا۔ بحری جہاز سے سفر کرنا مجھے بہت پسند تھا لیکن......" اچانک کہتے کہتے وہ رک گیا جیسے کہیں کھو سا گیا ہو پھر دوبارہ گویا ہوا۔

"لیکن اب ساری زندگی بحری جہاز پر سفر نہیں کروں گا۔ اگر مجھے ساری دنیا کی دولت بھی دی جائے، تب بھی میں سمندری سفر نہیں کروں گا۔" اس نے ایک لمبی سانس لی۔ ہم سب بڑی بے چینی سے اس واقعے کو سننے کے منتظر تھے۔

"جب میں جہاز پر سوار ہوا تو میں نے اسٹیورڈ کو اپنے کیبن کا نمبر بتایا، وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ میں پہلے بھی اسی جہاز میں سفر کر چکا تھا۔ میں نے اسے اپنا سوٹ کیس، کوٹ اور چھتری دی۔ اس نے مجھ سے یہ چیزیں لے لیں مگر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ میرے کیبن کا نمبر سنتے ہی اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وہ بیمار ہے۔

میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔ "نہیں، سب ٹھیک ہے۔" پھر اس نے مجھے 105 نمبر کیبن تک پہنچا دیا اور میرا سامان برتھ پر رکھ دیا۔ اس کمرے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دو برتھیں، ایک اوپر اور ایک نیچے۔ ایک طرف واش بیسن لگا ہوا تھا۔ کیبن اچھا خاصا بڑا تھا۔ ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی البتہ پانی کی بوتلیں دیر تک بھری لگ رہی تھیں۔ اسٹیورڈ میرا سامان رکھتے ہی دروازے کی طرف مڑا اور اس سے پہلے کہ میں اسے ٹپ دیتا، وہ جا چکا تھا۔ اس کا یہ رویہ میری سمجھ میں نہ آیا۔

پہلے روز کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا، لوگ ایک دوسرے سے ملنے ملانے اور تعارف حاصل کرنے میں مصروف تھے، تقریباً سبھی کو کھانے پینے کی فکر تھی کہ کھانا کیسا ہے؟ جہاز کے انتظام کے بارے میں بھی مسافر خاصے فکر مند دکھائی دیئے۔ میں بھی بہت دیر تک عرشے پر ٹہلتا رہا۔ میں چونکہ خاصا تھکا ہوا تھا اس لیے جلدی اپنے کیبن میں چلا گیا۔ جیسے ہی میں کیبن میں پہنچا، مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کسی نے اوپر والی برتھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کا سامان ایک کونے میں پڑا ہوا تھا اور اس کی چھتری اوپر والی برتھ پر تھی۔ میں سوچنے لگا، نہ معلوم میرا ساتھی کیسا ہوگا؟ وہ آئے تو اس سے ملاقات ہو۔ خاصی دیر بعد وہ آیا، وہ ایک دبلا پتلا، یرقان زدہ چہرے کا آدمی تھا۔ اس نے ایک صاف ستھرا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ مجھے پہلی نظر میں پسند نہ آیا۔ میں نے سوچ لیا تھا، جہاں تک ممکن ہوگا، اس سے ملنے سے گریز کروں گا۔ اگر وہ جلدی سوئے گا تو میں دیر سے سوؤں گا۔ اگر وہ جلدی اٹھے گا تو میں دیر سے اٹھوں گا مگر میرا یہ سوچنا بے کار تھا اس لیے کہ اس کے بعد میں نے اس کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں غافل سو رہا تھا کہ ایک شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرے ساتھی نے اوپر والی برتھ سے نیچے چھلانگ لگائی، اس نے دروازہ کھولا اور تیزی سے راہداری میں بھاگا۔ اس نے دروازہ بند کرنے کی بھی زحمت گوارہ نہ کی۔ میں ڈرا کہ کہیں اتنی تیزی سے بھاگتے بھاگتے وہ گر نہ جائے۔ وہ یوں بھاگا تھا جیسے جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہو۔ جہاز چلنے سے کیبن کا دروازہ ہل رہا تھا، اس آواز سے مجھے بہت کوفت ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور اپنے بستر پر آ کر سو گیا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں کتنی دیر سویا مگر جب میری آنکھ کھلی تو اندھیرا تھا۔ کیبن سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ یہ سمندری پانی کی بو تھی جو مجھے صاف محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے سردی محسوس ہوئی تو میں نے جلدی سے کمبل اوڑھ لیا۔ مجھے لگا کہ میرا ساتھی اوپر برتھ پر واپس آ کر کروٹیں بدل رہا ہے، وہ کراہ بھی رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ بیمار ہے۔ میں صبح اس کی شکایت کروں گا پھر میں دوبارہ سو گیا۔

صبح جیسے ہی میری آنکھ کھلی تو مجھے سخت سردی کا احساس ہوا۔ جون کے مہینے میں ایسی سردی، عجیب سی بات تھی۔ میری نظر کیبن کی کھڑکی پر پڑی جو سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ وہ کھلی ہوئی تھی بلکہ کسی نے اسے پیچھے کی طرف باندھا ہوا تھا کہ دوبارہ بند نہ ہو جائے۔ مجھے سخت غصہ آیا، میں نے کھڑکی بند کی اور اوپر والی برتھ کو دیکھا، برتھ کے پردے کھنچے ہوئے تھے، شاید اسے بھی سردی لگ رہی تھی۔ اب نیند کہاں آتی، میں نے کپڑے بدلے اور باہر آ گیا، شاید صبح کے سات بجے کا وقت تھا، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا۔ موسم آج بھی ابر آلود تھا، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ڈیک میں اتنی صبح صرف میں ہی اکیلا مسافر تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جہاز کا ڈاکٹر بھی آ گیا، غالباً وہ بھی صبح کی تازہ ہوا کھانے کا عادی تھا۔ یہ ڈاکٹر آئرلینڈ کا رہنے والا تھا، نوجوان، خوش شکل تھا۔

"صبح بخیر!" وہ بولا۔

"صبح بخیر!" میں نے بھی جواب دیا۔

"اگرچہ یہ خوشگوار صبح نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں، واقعی کچھ زیادہ نہیں، میرے کیبن میں رات خاصی ٹھنڈ تھی۔ کسی نے کھڑکی کھول دی تھی، سارے کیبن میں سمندر کے پانی کی بو پھیلی ہوئی تھی، ہر چیز گیلی گیلی سی تھی۔" میں نے کہا۔

"آپ کس کیبن میں ہیں؟" ڈاکٹر نے فوراً پوچھا۔

"ایک سو پانچ۔" میرے کیبن کا نمبر سن کر ڈاکٹر حیرت زدہ سا ہو کر میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"آخر بات کیا ہے؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں...... نہیں...... کچھ خاص نہیں...... بس پچھلے تین پھیروں سے لوگ اس کیبن کے بارے میں شکایتیں کرتے رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں، مجھے بھی شکایت ہے، یہ کیبن ٹھنڈا ہے اور اس میں نمی بھی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے اور ہاں، خیر...... میرا کام یہ نہیں کہ میں مسافروں کو خوفزدہ کروں۔"

"میں خوف زدہ نہیں ہوں، نمی مجھے نہیں ڈراتی لیکن مجھے اس نمی سے نزلہ ہو گیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں آپ کے پاس آؤں۔"

"اس نمی کے علاوہ بھی آپ کے کمرے میں کوئی اور ہے؟" ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "کل رات عجیب و غریب آدمی اوپر والی برتھ پر سو رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھول کر بھاگ گیا۔" ڈاکٹر نے اس بار بھی مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ "البتہ وہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ میرے خیال میں کھڑکی اس

سنہری باتیں	
نازیہ ناصر خان۔ کراچی	☆ اپنی ہار پر مت روؤ کیونکہ تمہاری ہار کسی کی جیت کا سبب بنی ہے۔ ☆ زندگی کا مقصد پھولوں سے سیکھو جو کانٹوں کے درمیان رہ کر بھی مسکراتے ہیں۔ ☆ دنیا میں اچھا دوست قسمت سے ہی ملتا ہے اور اگر ایسا دوست کھو جائے تو اس کا غم تاعمر رہتا ہے۔ ☆ اپنی کامیابی کی امید رکھو کیونکہ ہر بڑا کام پہلے ناممکن ہی نظر آتا ہے۔

نے ہی کھولی ہوگی۔'' میں نے کہا۔
''نہیں' آپ کو علم نہیں مگر میں آپ کو اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔'' ڈاکٹر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''برائے کرم آپ اس کیبن کو چھوڑ کر میرے کمرے میں آجائیں۔ اگر میں بھی آپ کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔ ڈاکٹر لوگ عام طور پر بھوتوں پر یقین نہیں کرتے مگر اس رات کے واقعے کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں بھوتوں کا وجود ہے۔ میں آپ کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا مگر پھر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ آپ میرے کمرے میں آجائیں ورنہ آپ کو سمندر میں دھکا دے دیا جائے گا۔''
''خدا کی پناہ......! وہ کیوں؟'' میں حیران رہ گیا۔
''کیونکہ پچھلے تین چکروں سے ہر اس شخص کے ساتھ یہی ہو رہا ہے جو کمرہ 105 میں سوتا ہے۔'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ایک لمحہ کو میں نے سوچا کہ ڈاکٹر مدد کر رہا ہے' اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔
''آپ کی بڑی مہربانی۔'' میں نے کہا۔ ''میں 105 کمرے میں ہی سوؤں گا اور یقیناً سمندر میں نہیں گروں گا۔'' ڈاکٹر نے مجھے پریشانی سے دیکھا مگر بولا نہیں پھر ہم کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ ناشتے کے لیے اور بھی لوگ آ چکے تھے۔ ناشتے کے بعد میں اپنے کیبن میں آ گیا' اوپر والی برتھ کے پردے اب بھی گرے ہوئے تھے' غالباً وہ سو رہا تھا۔ اتنی دیر میں اسٹیورڈ نے آ کر کہا کہ کپتان مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھتا کہ کیوں' وہ چلا بھی گیا۔ کپتان اپنے کیبن میں میرا انتظار کر رہا تھا۔
''جناب' ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔
''فرمایئے؟'' میں بولا۔
''جو آدمی آپ کے کمرے میں سویا تھا' وہ غائب ہو گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ جلدی سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ کیا آپ نے کوئی غیر معمولی بات تو نہیں دیکھی؟''
کپتان کے سوال نے مجھے ڈاکٹر کی بات پر سوچنے پر مجبور کر دیا۔
''کیا آپ کا مطلب ہے' وہ سمندر میں گر گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہو سکتا ہے۔'' وہ بولا۔
''ویسے یہ عجیب سی بات ہے کہ......'' میں نے کہنا شروع کیا۔
''کہ......'' کپتان نے میری بات کاٹ دی۔
''وہ چوتھا مسافر ہے جو سمندر میں گرا ہے۔'' پھر میں نے ڈاکٹر سے جو کچھ سنا تھا' وہ کپتان کو بتا دیا۔ کپتان کو بڑا غصہ آیا' وہ مسلسل مجھ سے پوچھتا رہا کہ یہ بات مجھے کس نے بتائی ہے؟ مگر میں نے ڈاکٹر کا ذکر نہیں کیا پھر میں نے اسے میرے کمرے 105 میں جو کچھ رات ہوا تھا' سب کچھ بتا دیا۔
''یہ بالکل ویسے ہی ہوا ہے جیسے پہلے تین مسافروں کے ساتھ ہوا تھا۔'' کپتان نے فکرمندی سے کہا۔ ''وہ سارے اسی طرح اچانک برتھ سے کودے اور بھاگتے ہوئے سمندر میں جا گرے۔ ہم نے بڑی کوشش کی مگر ان کی لاشیں تک نہ ملیں۔ رات آپ کے کمرے کا مسافر بھی اسی طرح بھاگتا ہوا سمندر میں کود گیا۔ جہاز کے عملے نے اسے سارے جہاز پر تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ میں نہیں چاہتا کہ جہاز میں کوئی ہنگامہ ہو اس لیے آپ خاموشی سے ہمارے کمرے میں آجائیں۔'' اس نے کہا۔
''بہت بہت شکریہ لیکن میں اسی کمرے میں رہوں گا۔ آپ اسٹیورڈ سے کہیں کہ اس مسافر کا

...ان میرے کیبن سے اٹھوا دیں اور میں وعدہ کرتا ...وں' اس واقعہ کا ذکر کسی سے بھی نہیں کروں گا۔''
کپتان نے مجھے اس کمرے میں رہنے کے ...ادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر میں اپنی ...ت پر اڑا رہا۔ میں نے اسٹیورڈ کو کمرہ صاف کرنے ...کہا اور اس کھڑکی کو بھی مضبوطی سے بند کرنے کا حکم ...ا۔
اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''آپ نے ...ا ارادہ بدلا نہیں؟''
''نہیں۔'' میں بولا۔
''مجھے امید ہے' آپ جلد ہی ارادہ بدل لیں ...گے۔'' اس نے کہا۔
اس رات میں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ ...کافی دیر باہر ہی جاگتا رہا پھر اپنے کیبن میں آ گیا۔ ...ے ہی میں نے دروازہ کھولا' میرے ذہن میں اوپر ...والی برتھ کا مسافر آ گیا مگر میں خوفزدہ نہیں تھا پھر میں ...نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے دیکھا' کھڑکی پہلے ہی ...کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ مجھے سخت غصہ آیا' میں فوراً ...باہر جا کر اسٹیورڈ کو بلا لایا۔
''دیکھو' یہ کھڑکی تم نے کھلی چھوڑ دی؟ تم نہیں ...جانتے کہ اگر جہاز نے جھٹکے کھائے تو پانی اندر آ ...جائے گا پھر دس آدمی مل کر بھی اس کو بند نہیں کر سکیں ...گے۔ کیوں تم نے اس کو بند نہیں کیا؟'' میں نے اسے ...ڈانٹا۔ ''میں کپتان سے تمہاری شکایت کروں گا۔''
...اسٹیورڈ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر ...کھڑکی بند کرنے لگا۔
''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' میں ...اس پر چیخا۔
''اس جہاز میں کوئی ایسا شخص نہیں جو یہ کھڑکی ...بند کر سکے۔ اس جہاز میں کوئی عجیب بات ہے۔ میں ...اس چکر کے بعد اس جہاز کو چھوڑ دوں گا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔
''جناب' آپ بھی دیکھ لیں' میں نے کتنی مضبوطی کے ساتھ کھڑکی بند کی ہے۔'' میں نے بھی کھڑکی کو دیکھا' وہ کافی مضبوطی سے بند تھی۔
''آدھے گھنٹے کے بعد پھر یہ کھلی ہوگی اور اس کو رسی سے باندھا گیا ہوگا۔ ہے نا عجیب بات کہ یہ باہر سے بندھی ہوئی ہوگی۔'' وہ بولا۔
''اگر اب یہ کھلی تو تمہیں ایک پونڈ دوں گا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''نہیں جناب' آپ کا بہت شکریہ۔ خدا حافظ!'' وہ باہر نکل گیا۔
میں نے تو اس کی بات پر یقین نہیں کیا مگر وہ سچ کہہ رہا تھا۔ میں نے ایک بدترین رات گزاری۔ کپڑے بدل کر میں برتھ پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ کھڑکی خود بخود کیسے کھل جاتی ہے؟ یہ سوچ رہا تھا کہ غنودگی کے عالم میں مجھے ٹھنڈ سی محسوس ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دیکھا' کھڑکی اف خدایا......! ہاں' کھڑکی واقعی کھلی ہوئی تھی۔ اسٹیورڈ کی بات سچ ثابت ہو گئی تھی۔'' ہارون نے ہماری طرف دیکھا اور ہم سب حیرت زدہ سے اسی کو دیکھے جا رہے تھے۔ ہم میں سے کئی ایک کو اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ بے یقینی ان کے چہروں سے بھی عیاں تھی۔ ہارون نے بھی اس بات کو بھانپ لیا۔
''میں سچ کہہ رہا ہوں' یہ کوئی کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے' میں قسم کھاتا ہوں۔''
''اچھا' آگے سناؤ پھر کیا ہوا؟'' میں جلدی سے بولا۔
''پھر میں نے کھڑکی بند کر دی اور اتنی مضبوطی سے جتنی مجھ میں طاقت تھی' میں تقریباً آدھ گھنٹے تک کھڑکی کو ہی دیکھتا رہا کہ اچانک اوپر والی برتھ سے مجھے رونے کی آواز آئی۔ میں نے اوپر والی برتھ کے

پردے سرکائے تو میرا ہاتھ کسی شے سے ٹکرایا جیسے کوئی مردانہ ہاتھ تھا' گیلا اور سرد...... اس نے مجھے دھکا دیا اور دروازہ کھول کر بھاگ گیا۔ وہ ایک ہیولہ تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے راہداری میں دوڑا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں وہ صاف نظر نہیں آیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہوگیا۔ خوف سے میری پیشانی سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی' یہ ایک خواب ہے' شاید میں نے کھانا زیادہ کھالیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو کیبن میں جانے کے لیے آمادہ کیا۔ کیبن میں سمندری مچھلی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

کھڑکی کھلی ہوئی تھی' یہ دیکھ کر میں خوف زدہ سا بستر پر بیٹھ گیا پھر میں نے اٹھ کر کھڑکی بند کی اور تقریباً ساری رات بیٹھا کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ کھڑکی اسی طرح بند رہی۔ خدا خدا کرکے' صبح ہوئی۔ میں نے کپڑے بدلے اور باہر آ گیا۔ باہر کی ہوا میں اور کیبن کی ہوا میں نمایاں فرق تھا۔ ڈیک پر میری ملاقات پھر ڈاکٹر سے ہوئی۔

''صبح بخیر!'' اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر......!'' میں نے کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے' میرے کیبن میں واقعی کچھ ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں نے آج اپنی زندگی کی بدترین رات گزاری ہے۔'' میں نے رات کا پورا واقعہ ڈاکٹر کو سنا دیا۔ ''یہ بات ناقابلِ یقین ہے مگر خدا کی قسم' یہ بالکل سچ ہے۔''

''میں جانتا ہوں' تم میرے کیبن میں آ جاؤ۔'' ڈاکٹر نے پیشکش کی۔

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ آج رات تم میرے کیبن میں آ جاؤ؟ ہم دونوں مل کر یہ معمہ حل کریں؟ اگر تم اس کیبن میں رہے تو تم بھی سمندر میں ڈبو دیئے جاؤ گے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''کیا تم کو واقعی یقین ہے کہ یہ کسی بھوت ووت کی کارستانی ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں' اور نہیں تو کیا۔ آخر تم ہی بتاؤ' اگر یہ بھوت نہیں تو کیا ہے؟''

''مگر اس کی کوئی توجیہہ بھی تو ہو؟'' مجھے نجانے یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔

''ضرور ہوگی وجہ مگر کچھ باتیں عجیب ہوتی ہیں اور ان کی توجیہہ پیش نہیں کی جاسکتی۔''

''تم میرے ساتھ کیبن 105 میں رات نہیں گزار سکتے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں' نہ میں اور نہ کوئی اور یہ ہمت کرنے کو تیار ہے یا ہوگا۔''

میں تو خود بھی اکیلا اس کیبن میں رہنے سے ڈر رہا تھا مگر پھر بھی میں چاہتا تھا کہ میں یہ معمہ حل کروں۔ چنانچہ میں کپتان کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ آج رات بھر جاگے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی پاگل اس جہاز میں چھپا ہوا ہے اور وہ یہ حرکتیں کررہا ہے۔

کپتان نے میری بات کی تائید کی اور اپنے عملے کے دو آدمیوں کو حکم دیا کہ کیبن 105 کا بہت ہی اچھی طرح سے جائزہ لیں کہ اس میں کہیں کوئی چھپنے کی جگہ تو نہیں؟ پھر اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔

''جناب' کچھ بھی نہیں ملا' سب کچھ ٹھیک ہے۔''

''کھڑکی میں کوئی خرابی نہیں ہے؟'' میں بولا۔

''نہیں جناب......! ہماری مانیں تو اس کمرے میں رات نہ گزاریں' پہلے ہی چار جانیں جاچکی ہیں' کیا فائدہ خطرہ مول لینے کا؟''

''بس ایک رات اور......'' میں نے مسکرا کر کہا۔

رات کے دس بجے میں اور کپتان کمرہ 105 کی طرف چلے تو اسٹیورڈ ہمیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ جا تو رہے ہو مگر زندہ نہ نکلو گے۔

''سوٹ کیس دروازے کے آگے رکھ دیتے ہیں' ہم میں سے ایک اس پر بیٹھ جائے۔'' کپتان دروازے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تاکہ اگر کوئی کمرے میں ہو تو باہر نہ جاسکے۔ کھڑکی کو بھی دوبارہ چیک کرلیں۔'' میں نے نہایت احتیاط سے کھڑکی کا معائنہ کیا' یہ مضبوطی سے بند تھی۔ کپتان ہی سوٹ کیس پر بیٹھ گیا۔

''پہلی دفعہ مارچ میں واقعہ پیش آیا تھا' اوپر والی برتھ پر جو سو رہا تھا' وہ آدھی رات کو اٹھا اور سمندر میں کود گیا۔'' کپتان نے بتایا۔

''کیا 105 کے مسافر ہمیشہ سمندر میں کودتے رہے ہیں؟''

''نہیں' ہمارے جہاز میں تو یہ پہلی دفعہ ہوا تھا پھر تو ہر چکر میں ہی ہونے لگا۔ یہ چوتھا آدمی تھا جو سمندر میں کودا تھا۔'' وہ خاموش ہوکر میری طرف دیکھنے لگا مگر میرے اوسان جیسے خطا ہوگئے تھے۔

''آپ کیا دیکھ رہے ہو؟'' کپتان نے محبت سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دے بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ کھڑکی کا کنڈا آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ کپتان نے بھی کھڑکی کی طرف دیکھا۔

''کنڈا کھولا جارہا ہے۔'' وہ چیخا اور نفی میں سر ہلانے لگا جیسے خود ہی اپنی بات کا انکار کررہا ہو۔ میں اٹھا اور دیکھا' کنڈا تھوڑا سا نیچے آیا تھا۔

''تعجب ہے......'' کپتان بولا۔ ''دوسرا آدمی حادثے کا شکار ہوا تھا' اس کھڑکی سے کودا تھا۔ اس رات سمندر میں تلاطم تھا۔ اسٹیورڈ نے آ کر اطلاع دی کہ کمرہ نمبر 105 کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور پانی

چبھن

وہ معصوم لڑکی......!
اعتبار کے جال میں پھنس گئی
ملنے کے موسم کو ترس گئی
چپ چاپ سرکتے لمحوں میں
عذاب سی گزرتی یادوں میں
شکوہ سا کرتی آنکھوں سے
خود ہی آئینے میں
سوال کیا کرتی ہے
''اُس'' کے لفظوں پہ
یقین کرلیا کیسے؟
لفظ تو اُس کے بہت امید بھرے تھے
پر لہجے میں بڑی تپش تھی
جب لہجہ کی چبھن یاد آتی ہے'
تو!!
گہری تاریک رات
دل میں ٹھہر جاتی ہے

غزالہ شاہین عبدالقیوم

نے صرف کیبن کو نقصان پہنچایا تھا' اسی وجہ سے اس کمرے میں اکثر سمندر کے پانی کی بو آتی ہے اور یہ سیلن زدہ ہے۔ اس مسافر نے بھی اپنے آپ کو کھڑکی سے گرایا تھا مگر دیکھو کھڑکی کس قدر چھوٹی ہے۔" اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ کو کمرے میں سمندری پانی کی بو آئی؟" اچانک کپتان نے پوچھا۔

"ہاں' عجیب بات ہے' کمرے میں تیز بو آ رہی ہے۔"

اسی وقت بجلی چلی گئی۔ دروازے کے اوپر شیشے میں سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی اس لیے کمرے میں بالکل اندھیرا نہ تھا۔ اچانک کپتان اٹھا اور کھڑکی کی طرف لپکا۔ اس نے پوری طاقت لگادی کہ کھڑکی نہ کھلے مگر کھڑکی کھل گئی۔ میں بھی حیرت کا بت بنا ہوا اچانک اس کی طرف دوڑا مگر کھڑکی اتنی زور سے کھلی کہ میں جھٹکا کھا کر پیچھے گرا۔ جب میں اٹھا تو دیکھا کہ کپتان دروازے کے سہارے کھڑا تھا' اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

"اوپر کی برتھ پر کوئی ہے؟" وہ انتہائی خوف زدہ لہجے میں بولا۔ "تم دروازے پر نظر رکھو' میں اوپر دیکھتا ہوں۔ اب جو کوئی بھی ہے' اسے جانے نہیں دینا۔"

بجائے اس کے کہ میں دروازے کی طرف جاتا' میں برتھ کی طرف لپکا۔ اوپر والی برتھ پر واقعی کوئی تھا۔ میں نے چھوا' گیلا اور چکنا وجود...... خدایا......! کتنا خوف ناک احساس تھا جیسے کسی ڈوبے ہوئے شخص کی لاش کو چھو لیا ہو۔ میں نے اسے پوری طاقت سے کھینچنے کی کوشش کی۔ وہ اتنا بھاری تھا جیسے دس آدمیوں کا وزن ہو اس میں۔

اف خدایا......! اس کی مردہ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں' اس کے گیلے بال اس کے چہرے پر پڑے ہوئے تھے' اس میں سے سمندر کے پانی کی ناگوار بو آ رہی تھی' اس نے مجھے پیچھے کو دھکا دیا پھر اپنے ہا[تھ] میری گردن پر ڈالے' اس کے ہاتھ سانپ جیسے۔ پھر اس نے مجھے فرش پر گرا دیا اور مجھ پر کودا لیک[ن] کپتان کی طرف گرا۔ کپتان انتہائی خوف زدہ ہو[کر] پیچھے ہٹا پھر اس نے کپتان کو جھٹکے سے نیچے گرا[یا]۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہا۔ میں نے چیخنا چاہا [مگر] آواز میرے گلے میں پھنس گئی اور چشمِ زدن میں جو کوئی بھی تھا' بھوت یا آسیب' ہماری نظروں [سے] غائب تھا۔ وہ اس کھڑکی سے ہی غائب ہوا مگر کیسے؟ کھڑکی تو بہت چھوٹی تھی؟ خاصی دیر بعد میر[ے] اوسان بحال ہوئے۔ میرا بایاں ہاتھ بہت دکھ[رہا] تھا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میرے بائیں ہاتھ کی ہڈ[ی] ٹوٹ گئی تھی۔ میں بمشکل اٹھا' سیدھے ہاتھ [سے] کپتان کو سہارا دے کر اٹھایا' اس کی کوئی ہڈی تو نہ ٹو[ٹی] تھی مگر بے چارے کے سر میں اتنی زور سے چوٹ [لگی] تھی کہ خاصی دیر تک اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا [تھا] کہ کیا ہو رہا ہے؟ اب بتانے کو رہ ہی کیا گیا تھا؟

پھر بے شمار تختے لگا کر کیبن 105 کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اگر کوئی پوچھتا تو اسے کہتے' یہ کیبن خا[لی] نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے میرے ہاتھ پر پلاسٹر باندھا او[ر] کہا۔ "خدا کے لیے' آئندہ بھوتوں سے ملنے کی کوشش مت کرنا......"

بعد میں کپتان نے اُس جہاز کو چلانے سے معذرت کر لی اور میں نے بھی زندگی بھر بحری جہا[ز] کے سفر سے توبہ کر لی کیونکہ میں تا عمر اس واقعے کو نہیں بھول سکتا ہوں تو دوستو......! اب آپ کو یقین آ گیا کہ میں نے بھوت دیکھا ہے؟" ہارون نے اپنی کہانی ختم کر کے ہم سے پوچھا اور ہم سب اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے گنگ سے بیٹھے تھے جیسے بھوت اس نے نہیں بلکہ ہم سب نے دیکھا ہو......

جیجل میتلو

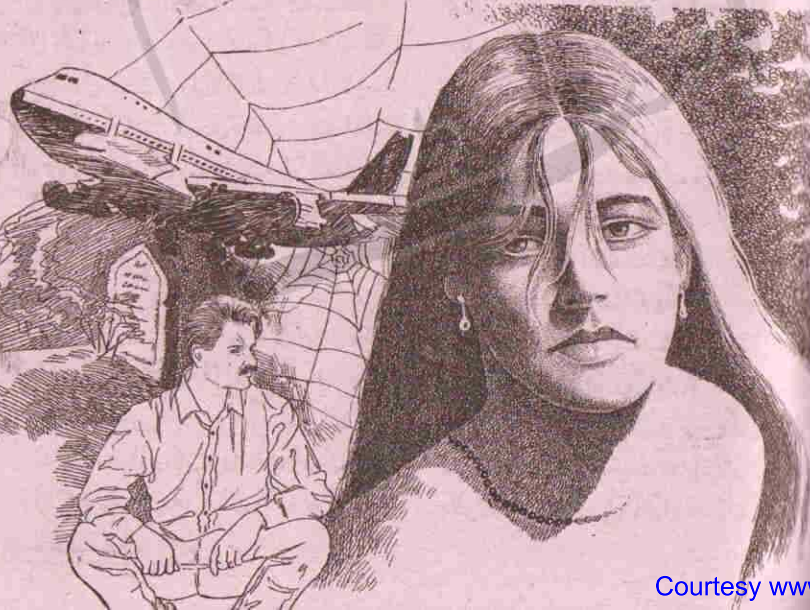
کیسا ستم ہے

رسا چغتائی کا خیال

کچھ عجب طور زندگانی کی
گھر سے نکلے نہ گھر کا پاس کیا

سیلانی فطرت شخص کا احوال، تقدیر نے اس پر عجب ستم کیا تھا

بچپن سے ہی میری طبیعت میں بے چینی اور [اضط]راب تھا جو مجھے ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ تعلیمی [زم]انے میں کئی اسکول اور کالج بدل بدل کر بی اے [...]ں کیا تھا پھر پاکستان کا ہر شہر گھوما۔ اس دوران [گز]ر اوقات کے لیے چھوٹی بڑی ہر قسم کی نوکریاں [ک]یں۔ میں چونکہ کسی بھی کام کو کرنے سے نہیں شرماتا تھا اس لیے کام جلدی مل جاتا تھا۔ فیملی میں اماں' بابا' ایک بڑی بہن اور پانچ بھائی تھے۔ بہن اور دو بھائی شادی شدہ تھے۔ بابا اور اماں نرم مزاج تھے۔ ہمارے زمین و باغات تھے جس کی وجہ سے خوشحالی تھی۔ میں آزاد پنچھی تھا۔ بے کل طبیعت کے باعث نگر نگر پھرتا رہتا تھا۔ ویسے بھی آج سے 20,25 سال پہلے



قدرے امن و امان تھا' چین ہی چین تھا۔ مہینوں بعد گھر لوٹتا تو سب کے لیے تحفے وغیرہ لے کر آتا تھا۔ گھر میں سب ہی مجھ سے محبت کرتے تھے۔

اماں اکثر فکرمندی سے کہتیں۔ ''بیٹا! یوں ملینے ملینے چلے جاتے ہو' ایسا نہ ہو کہ غلط کاموں میں پڑ جاؤ۔''

''نہیں ماں! آپ بس دُعا کیا کریں تو مولا کا کرم ہی کرم رہے گا۔'' میں ماں کے ہاتھ چوم کر کہتا اور جواب میں ماں کی دُعائیں ملتیں۔ میں جو کچھ کماتا' خود پر ہی خرچ کرتا۔ کہیں گھومنے جانا ہوتا تو پیسے جمع کرتا اور نوکری چھوڑ کر نکل جاتا پھر گھومنے کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی کام ضرور کرتا اور شاید ماں کی دُعا کی وجہ سے کام آسانی سے مل جاتا تھا۔ اگر کوئی ضرورت مند ہوتا تو اس کی بھی مدد ضرور کرتا۔ چاہے مجھے تنگی میں ہی کیوں نہ رہنا پڑے' دوست بھی ہر جگہ بن جاتے' سب ہی مجھ پر اعتماد کرتے اور میں نے بھی کبھی کسی کے بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ دھوکہ دہی یا مطلب پرستی میری عادت ہی نہ تھی' سچائی اور محبت میری کمزوریاں تھیں اس لیے بہت سے دوست تھے اور سب ہی اچھے تھے۔

ماں کہتی تھی۔ ''اچھے رہو گے تو تمہارے ساتھ بھی اچھا ہی ہوگا۔'' میری تمنا تھی کہ سب خوش رہیں۔ کوئی خدا کے سوا کسی کا محتاج نہ ہو' کوئی بھیک نہ مانگے' کہیں گولی نہ چلے' کسی کا خون نہ بہے' بھوک و افلاس نہ ہو۔ آج کل کے حالات دیکھ کر تو دل کڑھتا ہے۔ ہر شخص ڈپریشن کا شکار ہے' ہمارے حواسوں پر خوف مسلط ہے' تشدد کی ایک بھیانک لہر آئی ہوئی ہے۔ یہ سب دیکھ کر دل ملول ہوتا ہے تو دوست سمجھاتے ہیں کہ یار' یوں سوچ سوچ کر اداس نہ ہوا کر' زندگی کے روشن پہلو بھی دیکھا کر۔ ہمارے گرد خوشیاں بھی ہیں۔

خوشی......! ہاں پھر میری زندگی میں بھی خوشی در آئی۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ ان دنوں دوستوں کے مشورے سے ایم اے کی تیاری کر رہا تھا۔ ان ہی مہربانی سے دو کمروں کا ایک فلیٹ کرائے پر مل گیا اور ساتھ ہی پرائیویٹ کمپنی میں جاب بھی کر رہا یوں ہر وقت کتابوں میں مگن رہتا۔ فلیٹ میں تنہا تھا لہٰذا کھانا بھی خود بنانا پڑتا تھا' بس ایسے ہی ایک دن کھانا بناتے ہوئے میرے ہاتھ کی انگلی میں کٹ لگ گیا' کٹ کچھ گہرا لگ گیا تھا اسی لیے خون نہیں ہو رہا تھا چنانچہ میں بینڈج کے لیے کلینک نکل گیا' کلینک میرے اپارٹمنٹ کے سامنے ہی تھا ساڑھے چار بجے کا وقت تھا' کلینک پر ڈاکٹر تو نہیں تھا' کچھ مریض اور اسٹاف کے چند لوگ نظر آئے میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ایک نرس کمرے سے نکلتی دکھائی دی۔

''سسٹر......!'' میں نے خون بہتی انگلی اس کے آگے کر دی۔ نرس مسکرا کر مڑی اور کمرے میں چلی گئی۔ چند منٹ تک وہ باہر نہ آئی تو میں خود ہی کمرے کی جانب بڑھا۔ کمرے کے باہر بورڈ لگا تھا جس پر ''نرسز اسٹاف روم'' کے الفاظ لکھے تھے۔ میں نے اندر جھانکا' وہی نرس بیٹھی نظر آئی مگر اس بار جو میں نے اسے دیکھا تو مجھے لگا جیسے میرے چاروں طرف ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی جیسی روشنی پھیل گئی ہو۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پٹی کا سامان اٹھا کر میرے قریب آ گئی۔ اس کا چہرہ بہت دلکش تھا اور میں انتہائی محویت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ہاتھ دکھائیں مسٹر......!'' اس کی آواز پر میں نے چونک کر انگلی آگے کر دی۔ وہ دوائی لگا کر بہت انہماک سے پٹی کرنے میں لگ گئی اور میں اسے دیکھنے میں مگن ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ہماری نظروں کا ٹکراؤ ہوا اور ایک ثانیے کے لیے اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی' تاہم اگلے لمحے اس کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ اس نے سکون سے میری انگلی میں پٹی باندھی اور چلی گئی مگر میرا

[سکون] ساتھ لے گئی۔ اس رات میں جانے کب تک [اس] کے خیالوں میں گم رہا حالانکہ میں کوئی دل پھینک [عاش]ق مزاج شخص نہ تھا' یہ پہلی بار تھا کہ میں اس قسم [کے] احساس سے گزر رہا تھا۔ اس کے متعلق سوچتے [سو]چتے جانے کب نیند آ گئی۔ صبح اٹھا تو دل بے قرار [سا] تھا اور آنکھیں اسے دیکھنے کو بے چین ہو رہی [تھی]ں۔ تمام دن میں گھر میں پڑا ریڈیو سنتا رہا اور [اُس کی یاد او]ر موسیقی میں کھویا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے مدھر [گ]یت میرے دل کی ترجمانی کر رہا ہو حالانکہ مجھے [گ]یت سنگیت کا کچھ ایسا خاص شوق نہیں تھا' میں تو [ری]ڈیو پر صرف بی بی سی کی خبریں ہی سنتا تھا مگر آج [مجھے] سوائے محبت بھرے گیتوں کے کچھ اچھا نہیں لگ [ر]ہا تھا۔ دن اسی طرح ڈھل گیا اور شام ہو گئی۔ مجھے [کل]ینک کھلنے کا انتظار تھا جو شام میں کھلتا تھا۔ شام ہوئی تو میں نے تیاری شروع کر دی۔ اپنا سب سے اچھا [س]وٹ زیب تن کیا اور آئینے کے سامنے خود کو بنانے [س]نوارنے لگا۔ میرا رنگ روپ ٹھیک تھا' شکل بھی [بر]ی نہ تھی۔ میں اس طرح تیار ہو رہا تھا جیسے ڈاکٹر [کے] پاس نہیں بلکہ بردکھوے کے لیے جا رہا ہوں۔ [اپ]نے بننے سنورنے پر میں خود ہی خود دل میں ہنسنے [ل]گا۔ کلینک پہنچ کر باقی مریضوں سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں اس ماہ رخ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ سراپا حسن قدم قدم خوشبو سی بکھیرتی کمرے سے برآمد ہوتی نظر آئی اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی' اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندی اور لبوں پر ہلکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہیں سے ہمارے تعلق کی ابتدا ہوئی۔ میری انگلی کا زخم تو چند دن میں بھر گیا مگر دل زخمی ہو چکا تھا جس کا علاج اس ماہ رخ کی مسکراہٹ تھی۔ میں نے تو اس کا نام ماہ رخ چہرہ دیکھ کر سوچا تھا مگر حقیقتاً اس کا نام ماہ رخ تھا۔ ہم

عہد

بہاریں ہوں
یا
خزاں کے موسم
آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں
وقت تو وقت ہے
کسی کے لیے
رکا ہے نہ رکے گا
کیوں نہ پھر
آج ہم مل کر عہد کریں
وقت کے ساتھ چلنے کا
اس سفر میں
اور کبھی نہ بچھڑنے کا

نگہت اکرم

دونوں ایک دوسرے کو پا کر مسرور تھے۔ اکثر ہم ریسٹورنٹ پر بھی جانے لگے تھے البتہ ملاقات تو روز ہی ہوتی تھی۔ وہ میری زندگی میں کیا آئی کہ میری زندگی حسین ہو گئی۔ میں نے جو ایم اے کا امتحان دیا تھا' اس کا رزلٹ بھی آ گیا۔ میری سیکنڈ ڈویژن آئی' یہ خوشی کی خبر سب سے پہلے ماہ رخ کو سنانے کا سوچا اور مٹھائی لے کر سیدھا کلینک پہنچ گیا۔ آج میرا ارادہ اسے باہر کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں لے جانے کا تھا۔ کلینک پہنچ کر فوزیہ جو کہ ماہ رخ کی سہیلی تھی' اس کے ذریعے کہلوایا۔ اتنے میں ماہ رخ تیز تیز قدموں سے باہر آئی۔

''سوری فیروز' میں آج تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی' مجھے بہت ضروری کام ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بنار کے باہر نکلی اور ایک شخص کے ساتھ رکشا میں بیٹھ کر چلی اور میں دیکھتا رہ گیا۔

فوزیہ میرے قریب آئی اور میرے ہاتھ سے مٹھائی لیتے ہوئے بولی۔ ''آپ پریشان مت ہوں'

وہ کل آجائے گی نا۔“

”پریشان کیسے نہ ہوں‘ اس کا ایسا رویہ اور وہ شخص......“ میں نے کہا۔

”وہ ماہ رخ کا شوہر ہے۔“ فوزیہ نے جیسے میرے سر پہ بم پھوڑ دیا۔

”کیا......؟“ میں حیران تھا۔

”ہاں‘ وہ آپ کو بتا نہیں پا رہی تھی کہ وہ شادی شدہ عورت ہے۔ اس نے کئی بار سوچا کہ آپ کو بتا دے مگر بتا نہ سکی۔“ میں ہکا بکا سا فوزیہ کی باتیں سن رہا تھا۔

”دراصل ماہ رخ کے باپ کا بچپن میں انتقال ہو چکا تھا‘ ماں اسپتال میں مِڈوائف تھی اور ماہ رخ اپنے ماں باپ کی اکلوتی تھی۔ انٹر تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ بھی نرسنگ کا چار سالہ کورس کر رہی تھی کہ تیسرے سال میں اس کی امی بھی فوت ہو گئیں۔ بڑی ہمت و حوصلے کے ساتھ ماہ رخ نے وہ ٹریننگ مکمل کی اور ایک پرائیویٹ ادارے میں جاب کرنے لگی مگر اکیلی کنواری لڑکی کا اس معاشرے میں رہنا محال ہے‘ بس سب سے مشورے کے بعد اس نے نور محمد سے نکاح کر لیا۔ نور محمد بھی اس ادارے میں ڈسپنسر تھا۔ نور محمد‘ ماہ رخ کو بہت چاہتا ہے‘ اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔“ یہ سب سن کر تو میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے حالانکہ ہمارے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہوئے تھے پھر بھی مجھے یقین تھا کہ ماہ رخ میری ہے۔ اس دن فلیٹ پر آتے ہی میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا اور پھر اسی رات گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا تھا کیونکہ اب کراچی میں دل لگنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ گھر میں اچانک مجھے دیکھ کر ماں بابا‘ بھائی بھابیاں‘ بچے سب بہت خوش ہو رہے تھے مگر میرا من رو رہا تھا۔ میں ماں کی گود میں سر رکھ کر خوب رویا تھا اور ماں اپنے ہاتھوں سے میرے بال سہلاتی رہی لیکن ... بولی جیسے اسے سب معلوم ہو۔ ماں کی آغوش ... دل کا غبار نکلا تو خوب نیند آئی۔

شام کو کھانے کی میز پر میری سوچی سوچی آ... چہرہ دیکھ کر بابا نے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”ہاں بابا......! اب خیریت ہے‘ مجھے ... اچھی جاب ملی تھی‘ بے سبب نکالا گیا تو تھوڑا ڈپری... ہو گا نا۔“ میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔

”ارے بیٹا......! رزق خدا کی طرف سے ... ہوتا ہے۔ اس نوکری سے جتنا رزق ملنا تھا‘ ملا... باتوں میں پریشانی کی نہیں بلکہ ہمت کی ضرورت ... اور میرا بیٹا بہت ہمت والا ہے۔“ بابا نے میرا حو... بڑھایا اور میں خوش دلی سے مسکرا دیا۔ اپنوں ... درمیان کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ ماں کا اصرار تھا کہ ... شادی کر لوں تاکہ مجھ پر ذمے داری پڑے اور ... گاؤں میں ہی مستقل رہوں۔ ماں کی بات پر ... بس مسکرا کر رہ جاتا۔

گاؤں میں سارا دن اوطاق میں مہمانوں ... دوستوں کے ساتھ گزر جاتا مگر رات جیسے کانٹوں ... بسر ہوتی تھی۔ ہر شب خیالوں میں ماہ رخ آ... اور پھر تمام رات اس سے باتیں کرتے‘ گلے شکو... کرتے اور ہنستے روتے گزر جاتی۔ اسی بے خوابی ... باعث اکثر صبح میں بدن درد سے ٹوٹتا محسوس ہوتا تھا ... فجر کے وقت تمام گھر والے اٹھتے تھے اور میں پڑا ... تھا۔ ایک دن تو حد ہو گئی‘ میں دوپہر تک پڑا سوتا رہا ... ماں آئی۔ ”اٹھو بیٹا......! بارہ بج رہے ہیں ... آج طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ انہوں نے چادر ہٹا... ہوئے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور میں کسمساتا اٹھا ... ماں دعائیں دیتی ہوئی ناشتے کے لیے کہتی چلی گئی ... میں نے اٹھ کر آئینہ دیکھا‘ کچھ دن پہلے تک میرا چ... دمک رہا تھا اور اب بالکل پھیکا پھیکا اور بال پریشا...

...ے تھے‘ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی منہ دھویا‘ بال سنوارتے ہوئے ناشتے کی میز پر آ گیا۔ ابھی ناشتہ کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ بابا نے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

”فیروز بیٹا......! گاؤں میں پہلا ٹیوشن سینٹر کھلا ہے جس کے لیے اچھے‘ ذہین انگلش ٹیچر کی ضرورت ہے۔ اگر تم فی الحال رضاکارانہ طور پر وہاں پڑھا لو تو تمہارا کیا خیال ہے؟“ بابا نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جیسا آپ بہتر سمجھیں بابا......!“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”جیتے رہو بیٹا......! پھر کل سے ہی چلے جاؤ۔“

”جو آپ کا حکم۔“ میں نے فرمانبرداری سے کہا۔ بابا نے میری پیٹھ تھپتھپائی‘ یوں میں نے ٹیوشن سینٹر جوائن کر لیا۔ تین چار ماہ میں ہی سینٹر نے اچھی ترقی کر لی اور استاد و شاگرد دونوں میں اضافہ ہوا تو آمدنی بھی ہونے لگی۔ اس طرح میری سیلری بھی لگ گئی۔ مجھے جیسے ہی پہلی تنخواہ ملی‘ مٹھائی سمیت ماں کے قدموں میں جا کر رکھی۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ ماں نے بیڈ پر پیر رکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

”قرض اتار رہا ہوں۔“ میں مسکرایا۔

”قرض...... کیسا قرض؟“ ماں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

”وہ جو روزانہ میرے سرہانے کے نیچے سے 100 روپے ملتے تھے‘ وہ کون رکھتا تھا؟“ ماں مسکرانے لگی۔ اس کے چہرے پہ ممتا کا جذبہ بکھرا ہوا تھا۔

سینٹر میں پڑھاتے مجھے سال ہو گیا تھا۔ اس عرصے میں کوئی رات ایسی نہ تھی جو ماہ رخ کے خواب کے بغیر گزری ہو۔ اسے جتنا بھلانے کی کوشش کرتا‘ اس کی یادیں اتنا مجھے تنگ کرتیں۔ اب پھر گاؤں سے دل بھر گیا تھا۔ میری بے چینی مجھے یہاں سے نکلنے کو اکساتی رہی۔ ایک دن اخبار پڑھتے ہوئے ایک اشتہار پر نظر پڑی۔ دبئی میں کسی کمپنی میں کچھ ویکنسیاں خالی تھیں۔ میں نے اسی کو وجہ بنا کر بابا سے اجازت مانگی۔ بابا نے بھی منع نہیں کیا اور میں پھر کراچی آ گیا۔ دوسرے دن ہی تمام کاغذات سمیت جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ ہفتے بعد انٹرویو کا بلاوا آ گیا اور مجھے منتخب کر لیا گیا۔ تین سال کا معاہدہ ہوا تھا۔ اس طرف سے فارغ ہوا تو دل ماہ رخ کو ایک نظر دیکھنے کو بے چین ہو گیا۔ میرے قدم بے اختیار کلینک کی طرف بڑھنے لگے۔ کلینک پر فوزیہ سے ملاقات ہوئی‘ اس نے ماہ رخ کے فلیٹ کا ایڈریس دیا اور میں کوچۂ جاناں کی طرف چل پڑا۔

اس وقت موسم بھی مہربان ہونے لگا تھا‘ مون سون کی بارشیں شروع ہو چکی تھیں‘ اس وقت بھی ٹھنڈی ہوا میں ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے اس کا فلیٹ قریب آ رہا تھا‘ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ آخر منزل آ گئی۔ اس کے فلیٹ کی ڈور بیل دباتے ہوئے میرے اندر عجیب سے احساسات تھے۔ کچھ دیر میں دروازے کی اوٹ سے اس کا چہرہ کسی چاند کی طرح نمودار ہوا تھا۔ چند لمحوں کے لیے ہم دونوں جیسے پتھر کے ہو گئے اور ایک دوسرے میں گم ہو گئے‘ کئی گھڑیاں بیت گئیں پھر وہ سنبھلی۔

”آؤ...... آؤ...... فیروز......!“ میں کسی سحر کے زیر اثر اندر داخل ہو گیا۔

”نور محمد کہاں ہے؟“ میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”طلاق لے لی ہے میں نے اس سے......“ اس نے پرسکون انداز میں کہا۔

”کب......؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ایک سال ہو گیا۔ مجھے یقین تھا‘ تم ضرور آؤ

گے۔" وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی اور اسی وقت جانے مجھے کیا ہوا کہ میں بے قابو ہو گیا۔ باہر بادل گرجے' تیز بارش ہونے لگی اور اندر بھی ایک طوفان آ کر گزر گیا۔ جب طوفان تھما تو وہ کچھ ہو چکا تھا جو ہم نے سوچا نہ تھا' میں بھی شرمندہ تھا اور وہ بھی نظریں چرا رہی تھی۔

میں جانے کیلیے اٹھا تو اس نے کہا۔ "فیروز......! جب ہم نے ایک دوسرے کو قبول کر لیا ہے تو کیوں نہ ہم نکاح کر لیں؟" میں بھی اس کی بات سے متفق ہو گیا اور وہیں اس کے فلیٹ پر ٹھہر گیا۔ دوسرے دن ایک دوست کا فون آیا۔ میں نے فلیٹ پر ہی بلا لیا۔ وہ مجھے اور ماہ رخ کو جانتا تھا' وہ آتے ہی کہنے لگا۔

"ارے...... تم یہاں ہو' جانے کی تیاری کب کرو گے؟ صبح چھ بجے تمہاری فلائٹ ہے' چل' جلدی کر۔"

"نہیں...... مجھے اب نہیں جانا۔" میں نے کہا۔

وہ ماہ رخ کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "تم ہی اسے سمجھاؤ' ایسے موقع روز روز نہیں ملتے۔"

"تم جاؤ فیروز......!" ماہ رخ نے کہا۔

"لیکن میں تمہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔

"نہیں فیروز' ایسے موقع روز روز نہیں ملتے اور میری محبت اتنی خود غرض نہیں کہ تمہارے پیروں کی بیڑی بن جائے۔ جب تم واپس آؤ گے' تب ہم شادی کر لیں گے۔" اس کے چہرے پہ اداسی چھائی ہوئی تھی مگر آنکھوں میں حسین مستقبل کی امید اسے یہ سب کہنے پر اکسا رہی تھی۔ آخر دونوں کے سمجھانے پر میں جانے کے لیے تیار ہوا۔

دوسری صبح تیار ہوتے ہوتے میں نے پھر ماہ رخ سے کہا۔ "تین سال کم نہیں ہوتے' تم پھر سوچ لو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔" اس نے میرے سینے سے لگتے ہوئے کہا۔

وہ ایئر پورٹ تک مجھے چھوڑنے آئی تھی اور پھر میں نے بہت سی خوبصورت یادوں کے ساتھ کراچی کو خیر باد کہہ دیا۔ دبئی میں ٹریننگ کے بعد میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ پردیس میں کام محنت طلب اور سخت تھا مگر خطوط اور فون کے ذریعے ماہ رخ سے رابطہ رہا تھا۔ مجھے جیسے ہی فرصت ملتی' اسے خط لکھتا اور اس کا جواب بھی فوراً آ جاتا' تب موبائل وغیرہ تو تھے نہیں اس لیے خط ہی رابطے کا ذریعہ تھے۔ فون پر بھی اکثر ہماری بات ہوتی تھی۔

ایک دن اس نے فون پر کہا۔ "فیروز......! جب تم آؤ گے نا' تب ایک سرپرائز دوں گی۔" اس کا لہجہ خوشی سے بھرپور تھا۔ اس کی بات پر میں مسکرا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کے علاوہ کیا سرپرائز دے گی کہ میری دلہن بنے گی۔ ایک روز اس کا خط ملا' خط کیا تھا' گویا ایک دھماکہ تھا' اس نے لکھا تھا۔

"پیارے فیروز......!

ہمیشہ خوش رہو...... آج میں بھی بہت بہت خوش ہوں اور تمہیں یہ خوش خبری دیتے اور اس سرپرائز کا لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپنے لگے ہیں' ویسے میں نے سوچا تھا کہ جب تم آؤ گے' تب انتظار کروں گی مگر اب ضبط نہیں ہو رہا' بات یہ ہے کہ میں تمہارے دو جڑواں بیٹوں کی ماں بن گئی ہوں۔ تخلیق کے عمل سے گزرنے کی کمزوری تو ہے مگر خوشی بہت ہے کہ خدا نے مجھے اولاد جیسی نعمت دی ہے۔ نور محمد کے ساتھ گزرے زندگی کے سات سال میں کھجر بے ثمر رہی اور تمہارے ساتھ کی چند گھڑیوں نے مجھے تھر کی بنجر زمین سے ایک سرسبز باغ بنا دیا۔ گناہ یا ثواب کا مجھے کچھ پتہ نہیں' مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ یہ میرے اور تمہارے بیٹے ہیں۔ جیتے جاگتے وجود جو کہ میری گود میں مجھے میری ممتا کا احساس دلا رہے ہیں۔ اب اگر تم آ سکو تو جلدی آ جاؤ' باقی بعد میں۔ اب خدا حافظ!"

خط پڑھتے ہی میں بے قرار سا ہو گیا پھر میں نے بہت کوشش کی کہ کم از کم آٹھ روز کی ہی چھٹی مل جائے مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ ایک ماہ بعد ماہ رخ کا خط ملا تو ساتھ ہی صحت مند' گول مٹول بچوں کی فوٹو بھی تھی فوٹو دیکھتے ہوئے کتنی دیر تک میں گم صم رہا تھا پھر میں نے خود کو بہت زیادہ مصروف کر لیا۔ اوور ٹائم بھی زیادہ لگانے لگا تھا۔ روز و شب کی محنت کا مقصد یہ تھا کہ میں بہت کچھ لے کر جانا چاہتا تھا کہ اب ہمارے بچے بھی تھے۔ اس دوران ماہ رخ کے خط اور فون برابر آتے رہے۔ دونوں بچوں کے نام ماہ رخ نے ماہتاب اور آفتاب رکھے تھے جو کہ اب دن بدن بڑے ہو رہے تھے۔ دبئی میں میرے ساتھی بچوں کے فوٹو دیکھ کر کہتے تھے کہ ایک ماں پر گیا تھا اور ایک مجھ پر۔ ان کی بات پر میں فوٹو چوم کر مسکرا دیتا۔

پھر یوں ہوا کہ اچانک ماہ رخ کے خط آنا بند ہو گئے اور فون کا رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ میں بہت پریشان ہو گیا۔ میرا کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا مگر پردیس میں کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ شب و روز ایک بے چینی کے عالم میں گزر رہے تھے۔ خیر' جیسے تیسے کانٹریکٹ کا عرصہ پورا ہوا اور میں ڈھیر ساری امیدوں کے ساتھ وطن روانہ ہو گیا۔ ایئر پورٹ سے میں سیدھا فلیٹ پر آیا تو پتہ چلا کہ سال ہوا' ماہ رخ فلیٹ چھوڑ کر جا چکی تھی پھر کلینک گیا تا کہ فوزیہ سے اس کا اتہ پتہ حاصل کر سکوں مگر فوزیہ کسی آپریشن میں مصروف تھی' اس نے اندر سے پیغام بھجوایا کہ شام کو گھر آ ئیں۔ وہاں سے سو فکریں لے کر میں ایک دوست وحید کے گھر آیا۔ شام کو فریش ہو کر میں فوزیہ کے گھر گیا تو وہ میری ہی منتظر تھی۔ اس نے مجھے یہ الم ناک خبر سنائی کہ ماہ رخ مر چکی ہے...... یہ خبر سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی اور میں سُن ہو کر رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سچ ہے؟ میری امیدیں' خوشیاں' سب ختم ہو گئی تھیں۔

"نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا فوزیہ' کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے۔" میں نے جذباتی انداز میں فوزیہ کو جھنجوڑ ڈالا۔

"دیکھو فیروز......! ہمت سے کام لو' جانتے ہو' تمہارے جانے کے بعد اس پر کیا گزری؟" فوزیہ نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"کیا...... کیا ہوا تھا؟ کیا گزری؟" میں نے گلوگیر لہجے میں پوچھا۔

"تمہارے جاتے ہی اسے پتہ چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہونے لگی۔ ہر وقت ہنستی گنگناتی رہتی' لوریاں گاتی' مسکراتی۔ میں اسے سمجھاتی کہ فیروز کے ساتھ تمہارا نکاح نہیں ہے' ان بچوں کو کون پالے گا؟ معاشرے میں یہ قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔ تم انہیں یہیں......"

"نہیں...... نہیں...... آگے کچھ مت کہنا' یہ میرے بچے ہوں گے۔ میری محبت کی نشانی...... میں...... میں انہیں پالوں گی اور فیروز آئے گا' تب ہم نکاح کر لیں گے۔ خدا کے لیے' مجھے میرے حال پر چھوڑ دو فوزیہ......!" اس نے انتہائی جذباتی ہوتے ہوئے کہا تھا۔

جب آٹھ ماہ ہوئے' تب چیک اپ سے پتہ چلا کہ ٹوئن کی وجہ سے اس کا کیس سیریس ہے۔ ماں اور بچے دونوں کو خطرہ تھا۔ زچگی ہسپتال کے سوا نہیں ہو سکتی تھی۔ ماہ رخ پریشان رہنے لگی۔ تم تو آ نہیں سکتے تھے' ہم دونوں ہی فکر مند تھیں۔ بہر حال اسی پریشانی کے عالم میں اس کی ڈلیوری کا مشکل مرحلہ بخیر و عافیت گزر گیا اور وہ دو خوبصورت بچوں کی ماں بن گئی۔ ماں بننے کی خوشی میں وہ ایسی گم تھی کہ اسے اپنے اردگرد کسی چیز کا جیسے ہوش ہی نہیں رہا تھا مگر معاشرے نے اسے زیادہ خوش نہیں رہنے دیا۔ بنا

باپ کے بچوں کو معاشرہ بھلا کیسے قبول کر سکتا تھا؟
لہٰذا آس پاس رہنے والوں نے اس کا جینا اس قدر دوبھر کر دیا کہ اس پر زندگی تنگ ہوگئی، یہاں تک کہ اسے اپنا فلیٹ چھوڑنا پڑا۔ اس کٹھن وقت میں میرے علاوہ اس کا کوئی غم گسار نہیں تھا، چنانچہ میں نے کوشش کر کے اسے ایسی جگہ فلیٹ دلوایا جہاں وہ سکون سے رہتے ہوئے تمہارا انتظار کر سکے مگر اس عرصے میں ماہ رخ کے اندر جانے کس مرض نے جنم لیا کہ وہ اندر ہی اندر گھل گھل کر کھوکھلی ہوگئی اور جب تک اس کی پراسرار بیماری کھل کر سامنے آئی، تب تک وہ موت کے دروازے پر پہنچ چکی تھی مگر اسے خود سے زیادہ اپنے بچوں کی فکر تھی۔ اس کے لبوں پر بس یہی دعا تھی کہ قدرت تمہارے واپس آنے تک اسے زندہ رکھے مگر افسوس، ایسا نہیں ہو سکا۔ وہ ہنستی مسکراتی ماہ رخ دن بدن موت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں ہر ممکن اس کا ساتھ دے رہی تھی مگر اس کے دکھ بہت انوکھے تھے اور بچوں میں تو اس کی جان تھی، ان کی ذرا سی تکلیف پر وہ بلبلا جاتی۔

ایک دن وہ اپنے بچے لے کر میرے پاس آ گئی۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ تھامتے ہوئے وعدہ لیا تھا کہ تمہارے آنے تک میں اس کے بچوں کا خیال رکھوں۔ اس کی باتوں پر میں رونے لگی۔ وہ تو میری بہنوں جیسی تھی، میں نے وعدہ کیا کہ اس کے بچوں کا خیال رکھوں گی۔ میں نے اس سے کہا کہ فیروز کو خبر کر دینی چاہیے مگر اس نے قسم دے کر مجھے ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا اور میں مجبور ہوگئی۔ اگلی صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اس کے چہرے پر قدرے رونق تھی جسے دیکھ کر میں مطمئن ہوگئی کہ اب وہ سنبھل گئی ہے مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ اس کی زندگی کی آخری صبح طلوع ہوئی ہے؟ ابھی میں کام پر جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اس کی طبیعت بگڑنے لگی، چند لمحوں میں وہ بالکل نڈھال ہوگئی اور پھر کچھ بولنے سے پہلے ہی اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ مجھ پر تو بجلی گر گئی، میری چیخیں نکل گئیں۔ وہ تمام دکھوں سے آزاد ہو چکی تھی۔"

یہ سب سن کر میں پتھر کا بت سا بن گیا تھا۔ کس طرح میں نے خود کو سنبھالا، یہ تو میں ہی جانتا ہوں۔ زندگی سے دل اچاٹ ہو چکا تھا مگر مجھے زندہ رہنا تھا، اپنے اور ماہ رخ کے بچوں کے لیے جو ہمارے پیار کی نشانی تھے۔ ان پھولوں کو تو کچھ خبر ہی نہیں تھی کہ ان پر کیا قیامت بیت گئی ہے؟ ماہ رخ کے بعد میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گاؤں میں ماں بابا میری شادی کا خواب دیکھتے دیکھتے اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ انہیں تو مجھ پر گزرنے والی قیامتوں کا پتہ ہی نہ چلا۔

زندگی کے کئی برس گزر گئے۔ میرے دونوں بیٹے میٹرک میں ہیں۔

آج میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں اور اپنے دونوں بیٹوں ماہتاب اور آفتاب کو دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں البتہ میں نے اپنے بہن بھائیوں کو نہیں بتایا کہ یہ بچے میرے ہیں بلکہ انہیں یہی کہا ہے کہ یہ میرے دوست کے بچے ہیں جو اپنی بیوی کے ساتھ ایک حادثے میں انتقال کر گیا ہے۔ اکثر بھی ماہ رخ کی یاد زیادہ ستاتی ہے تو صوفیوں کی درگاہوں پر چلا جاتا ہوں اور روح کو تسکین مل جاتی ہے۔ یوں تو زندگی اچھی ہے لیکن ستم یہ ہے کہ میں اپنے بچوں کو بیٹا نہیں کہہ سکتا۔ میرے بچے بھی مجھے ابو کی بجائے انکل کہتے ہیں۔ شاید زندگی میں کبھی ایسا موڑ آ جائے اور مجھ میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے کہ میں اپنے بچوں کو سب کچھ سچ سچ بتا سکوں اور انہیں بیٹا کہہ کر اپنے سینے سے لگا سکوں۔



سونے سے مہنگا ناتا

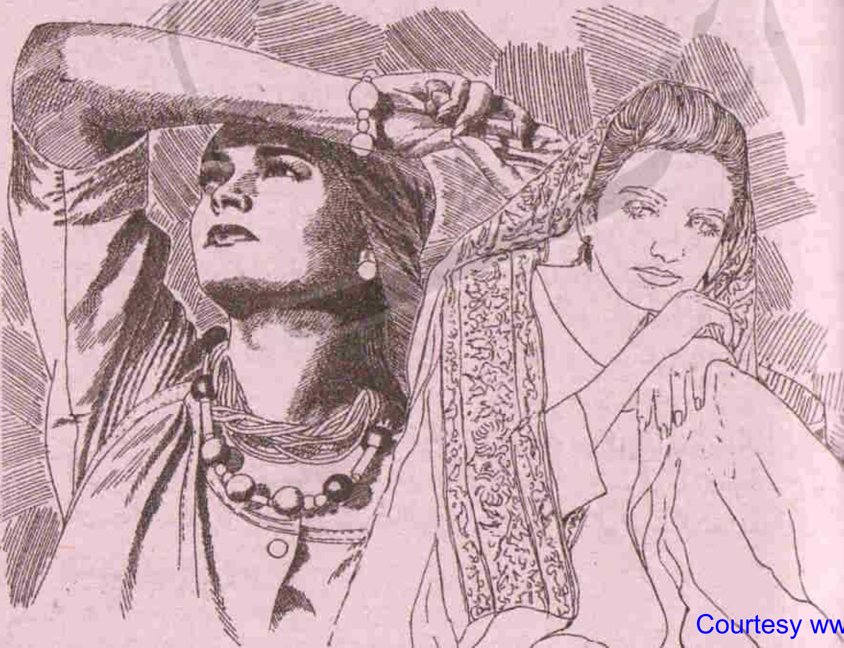
مس منزل خان

شگفتہ شفیق کا خیال

اس سے رشتہ ہمارا کچھ ایسا
پھول تتلی کی جیسے یاری ہے

حسد میں جلنے والی ایک لڑکی کی کہانی اس نے پُرخلوص ساتھی کھو دیا تھا

آج میں اتنی پر اعتماد ہوں کہ لوگ مجھے حیرت سے دیکھتے ہیں گو کہ میری عمر کچھ اتنی زیادہ نہیں مگر حالات کے تھپیڑوں نے مجھے چٹان سے زیادہ مضبوط اور بے خوف بنا دیا ہے۔ آج نہ مجھے کسی سے ڈر لگتا ہے اور نہ ہی مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنی زندگی اپنے گھر والوں کے لیے وقف کر دی ہے۔ میں اپنی ماں کی بیٹی ہی نہیں بلکہ بیٹا ہوں۔ اب میں اگر کسی کے بارے میں سوچتی ہوں تو وہ صرف اور صرف میری ماں اور بہنیں ہیں۔ اب نہ مجھے لوگوں کی باتوں کی پروا ہے اور نہ ہی ان کے



سوالوں کی۔ آج مجھے پروا ہے تو صرف ماں کی جن کی ٹوٹی ہوئی لاٹھی کو میں نے سہارا دینا ہے۔ اگر مجھے پروا ہے تو صرف اپنی بہنوں کی جن کی آنکھوں میں بسے معصوم سپنوں کو پورا کرنا ہے۔ میں اپنی ماں اور بہنوں کے لیے ڈھال کی مانند ہوں جو انہیں زندگی کی تپش سے بچائے گی چاہے اس تپش سے میری جوانی خزاں ہو جائے یا میرے سپنے جل جائیں، مجھے پروا نہیں۔ مجھے عزیز ہے تو صرف اپنی بہنوں کا مستقبل اور اب مجھے ہی اپنی بہنوں کا مستقبل تاریک ہونے سے بچانا ہے۔ میں آج جتنی پراعتماد اور بے خوف ہوں، پہلے اتنی ہی ڈرپوک اور دبو قسم کی تھی، اعتماد نام کی چیز میرے اندر موجود نہ تھی۔ اگر میں ماضی کے اوراق پلٹوں تو آپ امثال نام کی ایک نہایت خوبصورت اور چھوٹی سی بچی کو پائیں گے، ایک ایسی لڑکی جو چیخ سن کر بھی سہم جاتی تھی، جسے تتلیوں کے ساتھ کھیلنا پسند تھا جو زندگی کو قوس و قزح کی مانند حسین تصور کرتی تھی۔

اُن دنوں زندگی کسی خوبصورت میٹھے پانی کے چشمے کی طرح رواں تھی نہ کسی بات کا غم تھا حالانکہ ہم پانچ بہنیں تھیں مگر میرے ماں باپ نے ہمیں کبھی بیٹوں سے کم نہ سمجھا بلکہ ہماری ہر خواہش کو پورا کیا تھا اور نہ ہی انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے بلکہ انہوں نے ہمیں بیٹوں سے بڑھ کر مانا تھا۔ مجھے آج بھی اپنے باپ کا کاندھا یاد آتا ہے کہ جب وہ ڈیوٹی سے تھکے ہارے گھر آتے تھے تو میں ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کندھوں پہ جھولتی اور کوئی نئی فرمائش بیان کر دیتی تھی اور وہ ہنس کر کہتے۔

"چلو، کل لے آؤں گا۔"

میں نے پہلی بار اپنے والد کو شدید غصے میں اُس روز دیکھا تھا جب میں نے پہلی اور آخری بار اُن سے جھوٹ بولا تھا۔ اُن کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا اور انہوں نے پہلی بار مجھے سخت انداز میں ڈانٹا تھا۔

"آج سے تمہارا اسکول جانا بند..... خبردار آج کے بعد گھر سے قدم بھی باہر نکالا......" میرے والد مجھ پر چلائے تھے۔

"ابوجی......! مجھے معاف کر دیں، میں آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گی۔" میں زار و قطار روتے ہوئے والد صاحب کے پاؤں میں گر گئی تھی۔

"اس سے پوچھو تسلیم......! کبھی میں نے اسے کسی بات پہ ڈانٹا؟ کبھی مارا یا کوئی خواہش پوری نہ کی ہو تو پھر اس نے کیوں نہیں بتایا کہ یہ فیل ہو گئی ہے۔ کیوں اس نے ہم سے رپورٹ کارڈ چھپایا؟" میرے والد نے میری والدہ سے کہا تھا۔

"ابوجی......! آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گی۔" میں نے بدستور اپنے والد کے پاؤں میں پڑے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا اب بس بھی کریں، رو رو کر بچی ہلکان ہو چکی ہے اب معاف کر دیں۔ آئندہ نہیں کرے گی۔" میری ماں مجھے گلے سے لگاتے ہوئے بولی تھی۔

اس واقعے کے بعد مجھ میں بڑی تبدیلی یہ آئی کہ میں نے سنجیدگی سے پڑھائی کرنا شروع کر دی تھی۔ جب میں آٹھویں جماعت میں پہنچی تو مجھے کزن کی شادی میں گاؤں جانے کے لیے اسکول سے کچھ ہفتوں کے لیے چھٹیاں لینی پڑی تھیں جس سے میرا اچھا خاصہ تعلیمی حرج ہوا تھا، تاہم اس سلسلے میں میری سندس نے بہت مدد کی تھی۔ سندس میرے گھر کے قریب ہی رہتی تھی۔ اب میں اکثر شام میں اس کے گھر جانے لگی تھی، اس نے نہ صرف میرا اسکول کا کام مکمل کرنے میں میری مدد کی تھی بلکہ وہ

امتحان کی تیاری میں بھی میری مددگار رہی تھی اور یوں ہماری دوستی کا آغاز ہوا تھا پھر ہماری فیملی کا بھی ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا تھا مگر جلد ہی میری اس سے میری دوستی یکطرفہ رقابت میں بدل گئی تھی۔ مجھے اس سے حسد اور جلن محسوس ہونے لگی تھی اور یہ احساس اُس وقت بامِ عروج پر پہنچ گیا تھا جب امتحان میں اُس کے مارکس مجھ سے زیادہ آئے تھے۔ میں نے اُسے اچھے مارکس لانے پر ظاہراً مبارک باد ضرور دی تھی مگر میرے اندر سانپ لوٹ رہے تھے، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کچھ کر جاؤں۔ میں تو اُس سے حسد کی آگ میں جل رہی تھی جبکہ میرے ساتھ اُس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ وہ میرا ہر کام بخوشی کر دیتی تھی اور ہر معاملے میں میری مدد کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی سندس نے میرے کسی کام سے انکار کیا ہو، یہاں تک کہ وہ اکثر میرا ہوم ورک بھی کر دیا کرتی تھی مگر میرے اندر جو حسد کا سانپ پل رہا تھا، اسے کسی طور چین نہیں تھا، وہ ڈسنے کو تیار موقع کی تاک میں تھا اور دوسری طرف سندس کی عنایتیں اسی طرح جاری تھیں پھر وقت کے ساتھ ساتھ میرا حسد ہار گیا اور اس کا اخلاص جیت گیا۔ اس نے میرے اندر کنڈلی مارے بیٹھے حسد کے سانپ کو مار دیا تھا، میں ہار چکی تھی، اب میرے اندر حسد کی آگ کی جگہ بے بسی نے لے لی تھی۔ میں اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔ مجھے ایسا لگتا جیسے سندس مجھ پر ترس کھا کر مجھ پر اتنی ہمدردی اور مہربانی کیا کرتی ہے، اس کے مقابلے میں مجھے اپنا آپ بہت کمتر محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ احساس میری جان کا روگ بن گیا تھا کہ وہ مجھ سے برتر ہے۔ کلاس میں سوائے سندس کے، میرا کوئی دوست نہیں تھا لہٰذا ہر وقت میرے ذہن میں یہ خیال گردش کرتا کہ میرا کوئی دوست نہیں، میں پوری کلاس کی موجودگی میں بھی خود

تب سے......

مجھے یاد ہے
جانے سے پہلے
اِک دن اُس نے کہا تھا
"اُسے" بارش اچھی لگتی ہے
بس تب سے ہی
میں ہر موسم
آنکھوں سے بارش کرتا ہوں

کامران شمشاد

کو تنہا محسوس کرتی تھی اور اگر سندس مجھ سے بات کرتی تھی تو مجھے لگتا جیسے وہ مجھ پر ترس کھا رہی ہو۔ وہ جتنا مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کرتی، میں اتنا ہی اس سے دور ہوتی جاتی تھی پھر اکثر کلاس میں میری حالت غیر ہونے لگی تھی، میں بیٹھے بیٹھے پسینے میں شرابور ہو جاتی اور زور زور سے کانپنے لگتی تھی۔ میری حالت دیکھ کر ٹیچرز اور کلاس فیلوز بھی ڈر جاتی تھیں۔ آخر میرا معاملہ پرنسپل تک بھی جا پہنچا اور انہوں نے میرے گھر والوں کو بلا کر میری صورت حال بتائی تھی اور مجھے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ میں پوری طرح ایک نفسیاتی مریضہ بن چکی تھی اور محلے والوں نے بھی مجھے پاگل جیسے کلمات سے نوازنا شروع کر دیا تھا کیونکہ گھر ہو یا اسکول یا پھر کوئی محفل، کسی بھی جگہ اور کسی بھی بات پر میری حالت خراب ہو جاتی تھی اور مجھے قابو کرنا مشکل ہو جاتا تھا مگر سلام ہے اپنے ماں باپ پر جو لوگوں کی پروا کیے بغیر مجھے نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور میرا علاج کروایا تھا حالانکہ میرے والدین تعلیم یافتہ نہ تھے مگر انہوں نے ڈاکٹر کی ہدایات پر مکمل عمل کرتے ہوئے مجھے نارمل زندگی کی طرف لانے کے لیے بہت جتن کیے تھے، انہوں نے ہر موقع پر میری

حوصلہ افزائی کی تھی اور اس بات کی قطعی پروا نہیں کی کہ کوئی میرے بارے میں کیا بات کرتا ہے بلکہ انہوں نے ان لوگوں کے گھر جانا تک ترک کر دیا تھا جو میرے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ میری والدہ اکثر اسکول آکر میرے اساتذہ اور دوستوں کو میری مدد اور دلجوئی کرنے کا کہتی تھیں چنانچہ ماں باپ' اساتذہ اور دوستوں کی توجہ سے میں آہستہ آہستہ اپنی روٹین پر آنے لگی اور میری حالت میں بہتری آنے لگی۔ اُن ہی دنوں ہمارے میٹرک کے امتحانات قریب آ گئے تھے اور میں نے سندس کے ساتھ مل کر امتحان کی تیاری شروع کر دی تھی' تاہم سندس سے متعلق میرے خیالات میں تبدیلی نہیں آئی تھی' اس سے جلن و حسد کا جذبہ میرے اندر اب بھی موجود تھا پھر کچھ عرصے کے بعد ہمارے سالانہ امتحان بھی شروع ہو گئے تھے۔ ابھی دوسرا ہی پیپر تھا کہ سندس کی پھپھو کا انتقال ہو گیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب میں اپنی امی کے ساتھ سندس کے گھر افسوس کے لیے گئی تھی اور سندس مجھ سے لپٹ کے بلک بلک کر روئی تھی جبکہ اس وقت مجھے عجیب سی تسکین مل رہی تھی۔ وہ اپنی پھپھو سے بہت محبت کرتی تھی۔ تمام پیپرز میں اس کا معمول تھا کہ وہ پیپر دے کر اپنی پھپھو کے گھر چلی جاتی تھی جو اُن کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پھپھو کی وفات کے بعد سندس نے بہت کٹھن حالات میں باقی پیپرز دیئے تھے۔ اُس کا تمام دن پھپھو کے گھر میں آئے لوگوں کے ساتھ گزر جاتا تھا جبکہ رات میں اسے تھوڑا بہت ٹائم مل پاتا تھا۔ اُن دنوں سندس کا کِھلتا ہوا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ جب وہ پیپر دینے اسکول آتی اور مجھ سے ملتی تو اُس کا زرد اور بجھا ہوا چہرہ میرے لیے عجب طرح کی تسکین کا باعث بنتا تھا۔ اس بار مجھے پکا یقین تھا کہ میں سندس سے سبقت لے جاؤں گی مگر جب رزلٹ آیا تو میرے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے اور میں اپنی ماں کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''آخر کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ میں کسی قابل نہیں ہوں' کچھ بھی نہیں میرے بس میں۔ سندس کی پھپھو فوت ہوئی تھی' اسے پڑھنے کا ٹائم بھی نہیں ملا مگر اس نے پھر بھی اتنی اچھی percentage لی ہے جبکہ میں وہی B گریڈ...... آخر کیوں ماں؟ ایسا کیوں؟''

''چپ ہو جاؤ امثال......! اتنا مت روؤ' دیکھو بیٹا......! اس نے پہلے ہی سب تیاری کر لی ہو گی جبھی اسے امتحان کے دنوں میں اتنی محنت نہیں کرنی پڑی ہو گی۔'' امی نے مجھے بہت پیار سے سمجھایا تھا۔ میرے بکھرے وجود کو ایک بار پھر سمیٹا تھا' صرف یہی نہیں' وہ مجھے ساتھ لے کر گفٹ شاپ گئیں اور سندس کے لیے گفٹ خریدا تھا اور اپنی ماں کے بے حد اصرار پر میں نے اوپری دل کے ساتھ سندس کو گفٹ بھی دیا تھا۔ میں اسے منہ پہ کبھی کچھ نہ کہتی بلکہ میرا برتاؤ اس کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ ہوتا تھا مگر میرا باطن کبھی میرے ظاہر کا ساتھ نہ دیتا تھا۔

اسکول تو ہمارا چھوٹ گیا تھا مگر ساتھ نہیں چھوٹا تھا کیونکہ سندس کے والد نے میرے والد کے کہنے پر میرا اور سندس کا ایڈمیشن ایک ہی کالج میں کروایا تھا۔ کالج میں بھی سندس میرے لیے ڈھال بنی رہتی تھی' کوئی کچھ کہتا تو جواب وہ دیتی تھی جبکہ میں اُس کا احسان مند ہونے کے بجائے اس کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں سوچتی تھی گو کہ اپنے والدین کی کوششوں سے میں بہت حد تک نارمل ہو چکی تھی مگر اب بھی کبھی کبھار میری اندرونی کیفیت مجھ پہ غالب آ جاتی تھی۔

اسی جلن اور حسد کی آگ میں جلتے جلتے کالج لائف بھی گزر گئی تھی۔ اس کے بعد ہمارے راستے الگ ہو گئے تھے۔ میں نے ہومیو پیتھک کالج میں داخلہ لے لیا تھا جبکہ اس کا مقصد کچھ اور تھا مگر میری آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ خدا مجھے سب کچھ دے کر آزما چکا تھا۔ ایک بہت مخلص دوست دیا تھا اس نے بغیر کسی غرض کے میرا ہر طرح ساتھ دیا تھا' وہ دوست مجھ سے جدا ہو چکی تھی مگر مجھے اس بات کا احساس اُس وقت نہیں ہوا تھا کہ میں کتنی قیمتی شے گنوا چکی ہوں' مجھے تب احساس ہوا جب میری دوسری آزمائش شروع ہوئی تھی۔

ابھی مجھے کالج جوائن کیے ہوئے کچھ ہی ماہ ہوئے تھے کہ ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ میرے والد صاحب کو کینسر ہے' اس خبر نے تو جیسے ہمارے پیروں تلے سے زمین کھینچ دی تھی۔ میری والدہ جو میری ہمت بندھاتی تھیں' آج وہ خود ہمت چھوڑ بیٹھیں اور بستر سے جا لگی تھیں۔ والد کو فوری طور پر ہسپتال میں داخل کروایا گیا اور سرکاری خرچے پر اُن کا مہنگا علاج ہونے لگا تھا۔ اب مسئلہ تھا کہ والد صاحب کے ساتھ ہسپتال میں کون رہے گا جبکہ وہ ہسپتال ہمارے علاقے سے کافی دور تھا؟ ایک تو ہمارا اس شہر میں کوئی تھا نہیں اور بہنیں ساری چھوٹی کہ اُن کے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور بھائی ہمارا کوئی تھا نہیں جبکہ والدہ الگ چارپائی سے جا لگی تھیں جبکہ میں خود ایک ٹوٹی پھوٹی شخصیت کی مالک تھی جس میں اعتماد نام کو نہیں تھا۔ یہ سب سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگا تھا جبکہ اس صورتِ حال میں گھر کا ہر فرد گھر کے کسی نہ کسی کونے میں منہ چھپائے آنسو بہا رہا تھا۔ اس گمبھیر صورتِ حال میں مجھے ہی کوئی قدم اٹھانا تھا چنانچہ میں نے تمام ہمت جمع کی اور والد صاحب کے پاس ہسپتال جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہسپتال میں پہلا دن تھوڑی گھبراہٹ کے ساتھ خیر و عافیت کے ساتھ گزر گیا تھا۔ دوسرے دن میں دوبارہ صبح سویرے ہسپتال کے لیے روانہ ہوئی تھی' وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ والد کی رپورٹس آ چکی ہیں جن کے مطابق وہ کینسر کی last stage پر ہیں۔ یہ بات میرے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھی مگر میں یہ بات نہ جانے کیسے اپنے اندر جذب کر گئی تھی' میں نے گھر میں کسی کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔ والد ہسپتال میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد گھر آ گئے تھے کیونکہ اُن کی حالت میں قدرے فرق آ گیا تھا۔ والد کے آنے سے گھر میں تو جیسے بہار آ گئی تھی۔ ماں اور بہنوں کی آنکھوں میں امید کی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔ ماں جو چارپائی سے جا لگی تھیں' اب بھاگ بھاگ کر والد صاحب کے کام کر رہی تھیں مگر ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ دیا بجھنے سے پہلے ٹمٹماتا ضرور ہے لہٰذا ہمارے والد کی زندگی کا دیا بھی بجھ گیا...... ایک صبح ابو ہمیں بے یقینی کے عالم میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں روئی ضرور تھی مگر نہ میں پسینے میں شرابور ہوئی تھی اور نہ ہی بری طرح کانپی تھی۔ میرے والد مجھے اتنا مضبوط اور پُراعتماد اپنی زندگی میں تو نہ بنا پائے تھے لیکن اُن کی موت نے مجھے مضبوط اور اعتماد سے بھرپور بنا دیا تھا۔ واقعی زندگی میں آنے والی مصیبتیں' پریشانیاں اور آزمائشیں انسان کو اندر سے مضبوط بنا دیتی ہیں اور ہاں' کئی برسوں سے سندس سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ میں اُس سے ملنے کے لیے بے قرار ہوں تاکہ زندگی میں پہلی بار اُسے خلوصِ دل سے گلے لگا سکوں کیونکہ آزمائش کی اِن گھڑیوں میں مجھے سندس جیسی پُرخلوص اور بے غرض دوست کی کمی انتہائی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ اگر آپ کی زندگی میں بھی کوئی پُرخلوص ساتھی کسی بھی رشتے یا تعلق کی صورت میں موجود ہے تو خدارا' اُس کی قدر کریں۔ یاد رکھیں' پُرخلوص ساتھی یا دوست سے بڑھ کر دنیا میں کوئی قیمتی شے نہیں ہے۔





مینا تاج

پرچھائیاں ہمراہی تھیں

حزیں صدیقی کا خیال

نہیں یہ خواب کا عالم نہیں ہے
یہ سب منظر تو جیتے جاگتے ہیں

محبت کے آفاقی جذبے سے پھوٹتی ایک ناقابلِ یقین پریم کہانی

ہندوستان جو تاریخی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے اور اس کا ہر حصہ اپنے اندر ایک داستان سموئے ہوئے ہے اسی سرزمین پر غالب کا جنم ہوا جس کا سحر آج بھی ہم پر غالب ہے۔ اس دھرتی پر نامور انقلابی دانشوروں سے لے کر اعلیٰ پارچہ جات اور دستکاروں نے اپنا کردار اس محنت اور لگن سے ادا کیا کہ ان کے کارنامے خوشبو بن کر فضا میں بکھر گئے اور آج بھی اپنے بزرگوں کے توسط سے ہم ان خوشبوؤں کو محسوس کرتے ہیں۔

ان ہی خوشبوؤں کے سہارے آج میں ہندوستان کی سرزمین اور اپنے اجداد کے آبائی شہر پٹنہ پہنچی تھی۔ گو کہ میں پہلی مرتبہ انڈیا دیکھ رہی تھی مگر اپنے بابا کی نگاہوں اور باتوں سے بہت بار اس دیس کا نظارہ کر چکی تھی۔

پٹنہ سے بذریعہ ٹرین جب میں ممبئی پہنچی جس کا سابقہ نام بمبئی تھا۔ اسٹیشن سے فلورا فاؤنٹین کو کراس کرتے گیٹ آف انڈیا کے آہنی گیٹ سے گزرتے ہوئے ذہن 1940ء والے بمبئی تک جا پہنچا اور ایک پرانے واقعے سے جا ملا جو اپنے بابا کی زبانی میں نے سنا تھا۔

اسی گیٹ آف انڈیا کے سامنے بنے تاج ہوٹل کے عقب میں بسترو ہوٹل ہوا کرتا تھا جس کی قدیم عمارت نئے مالکان کی جدید سوچ کی نذر ہو گئی۔ بسترو ہوٹل تو اپنی مدت پوری کر کے زوال پذیر ہو گیا مگر اس ہوٹل میں جنم لینے والی محبت لازوال ہو گئی۔

•......•......•......•

”ہنری، تم بہت سیلفش ہو، جن پیرنٹس نے تمہیں پالا، جوان کیا، تم انہیں گوا میں اکیلا چھوڑ کر ادھر بمبئی میں سر ٹکرانے آ گئے؟“

”تو کیا کرتا ڈوک؟ ادھر گوا میں رہ کر اپنے باپ کی طرح گیراج میں امیروں کی گاڑیاں مرمت کرتا اور مالک کی جھڑکیاں کھاتا اور گھر آ کر دو سلائس کے بیچ پنیر کا ایک ٹکڑا ڈال کر پیٹ بھرتا پھر پیٹر انکل کی دارو کی دکان سے دیسی شراب کا ایک پیگ مار کر سو جاتا؟

یہی حال ممی کا تھا جن کا سارا دن بیکری میں ڈبل روٹی بناتے گزر جاتا اور واپسی پر باسی ڈبل روٹی کے چند سلائس، بیکری کے مالک کی جھک جھک اور معمولی اجرت کے ساتھ اپنے اکلوتے کوٹ میں بیٹے گھر میں داخل ہوتی جہاں ریٹا اس کی شکل دیکھ کر بلی کی طرح اس کی ہاتھ سے بانس کی بنی ٹوکری پر جھپٹتی پھر مایوس ہو کر ٹوکری ایک طرف رکھ دیتی اور گھورتی ماں سے کہتی۔

”اوہ نو ممی......! آج پھر صرف بریڈ؟ کبھی تو بیکری سے پیسٹری اور بسکٹ لیتی آیا کرو۔“

”ریٹا، میں وہاں جاب کرتی ہوں، وہ بھی بیکری کے کچن میں معمولی سلیری پر۔ تمہارے لیے کیک، پیسٹری خریدنے نہیں جاتی۔“ ممی کا کڑوا جواب ریٹا کو موصول ہوتا۔

”ممی، کرسمس آنے کو ہے، اس بار تو مجھے نئی فراک بنوا دو وائٹ ساٹن کی۔ اب کی بار میں سارا آنٹی کی بیٹی کا پرانا ڈریس نہیں پہنوں گی۔ چھوٹی سی تو فراک ہوتی ہے، کم کپڑے میں بن جائے گی۔“

”او کے، بجٹ نے اجازت دی تو ضرور بنوا دوں گی۔“ اور ایسے ہی سوال جواب سے گزرتے ہوئے ریٹا کی چھوٹی سی فراک نے لمبی فراک کی جگہ لے لی، ساتھ میں ممی کا جواب بھی لمبا ہو گیا۔

”اب تم سارے شوق اپنے ہسبینڈ کے پاس جا کر پورے کرنا۔“

”ہونہہ......ویسے ہی جیسے آپ نے اپنے

ہسبینڈ کے پاس پورے کیے؟'' ریٹا کا کرارا جواب آتا۔ اب ریٹا باتوں سے بہلنے والی بچی نہیں رہی تھی بلکہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی پھر ایک دن اس کی بچپن کی سفید فراک پہننے کی خواہش اپنی عمر سے تین گنا بڑے مائیکل سے شادی کی صورت میں پوری ہوئی۔

''ڈوک...... میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گا۔ گوا میں ایک فوٹوگرافر کے پاس کافی کام سیکھ چکا ہوں' بس تم بمبئی کے بڑے فوٹوگرافرز سے ملوادو' باقی کام میرا۔''

''ہینری' تم مجھ پر بوجھ ہرگز نہیں' پر میں آنٹی' انکل کے واسطے پریشان تھا' وہ بوڑھے لوگ تمہارے بغیر کیسے رہیں گے؟''

''ڈوک' ہم لوگ ایک ساتھ رہ کر بھی ساتھ نہیں تھے۔ غریبی کی دیوار ہمیشہ ہمارے درمیان حائل رہی ہے۔ ہاں' کمی کہو تو مان لیتا ہوں۔ ایک بندہ اس کھولی سے کم ہو گیا' پر بہت جلد میرا پیسہ اس کمی کو بھی دور کر دے گا' یقیناً اس نئے مہمان کو مجھ سے اور ریٹا سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گی۔''

............*......*

''مبارک ہو ہینری' آخر کو تمہیں مطلوبہ جاب مل ہی گئی۔''

''اس مبارک باد کے صحیح حقدار تم ہو ڈوک' تم ہی نے تو اسٹوڈیو کے مالک تک پہنچانے میں میری مدد کی ورنہ میں تو کبھی گوا سے باہر نکلا ہی نہیں پھر بمبئی جیسے بڑے شہر میں......''

''لفظوں سے کھیلنا بند کرو۔ تمہاری صلاحیت کی بنا پر تمہیں جاب ملی ہے ورنہ میری طرح کسی دفتر میں پیون لگے ہوتے۔''

''ایک بار پھر شکریہ اپنے ساتھ رکھنے کا۔''

''کیا مطلب' تم اب میرے ساتھ نہیں رہو گے؟''

''اسٹوڈیو کے مالک نے اسٹوڈیو میں ہی مجھے رہنے کی پرمیشن دے دی ہے' ویسے ویک اینڈ پر تم سے ملنے آیا کروں گا۔''

''ویسے ہینری' آج ویک اینڈ ہے اور جانے سے پہلے چلو' تمہاری جاب ملنے کا جشن مناتے ہیں۔''

''ڈوک' آج نہیں' نیکسٹ ویک سیلیبریٹ کریں گے تاکہ کچھ رقم بھی میرے ہاتھ میں ہو۔''

''ہینری' آج کی ٹریٹ میری طرف سے' نیکسٹ ٹائم تمہاری طرف سے' اوکے؟''

''ٹھیک ہے۔''

............*......*

بیسٹرو ہوٹل کی سہ منزلہ عمارت انگلستان کی طرز تعمیر کا منہ بولتا ثبوت کی صورت کھڑی تھی۔ ویک اینڈ ہونے کی وجہ سے ہوٹل کی رنگینیاں عروج پر تھیں۔

''کافی مہنگا ہوٹل لگتا ہے؟''

''ہا...... ہا...... ہا...... مائی ڈیئر ہینری' ابھی تم نے مہنگے ہوٹل دیکھے کہاں ہیں' یہ تھری اسٹار' فور اسٹار ہوٹل ہم جیسے لوگوں کی فائیو اسٹار ہوٹل کی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے بنے ہیں۔ میں بھی یہاں کبھی کبھی آتا ہوں جب جیب گرم ہو اور گرل فرینڈ کو امپریس کرنا ہوتا ہے۔''

''اچھا تو آج مجھے امپریس کرنے لائے ہو؟''

''ہرگز نہیں' آج تو میں بچپن کے دوست کے ساتھ شام گزارنے اور اس کی خوشی میں شریک ہونے آیا ہوں۔''

ویک اینڈ پر یہاں بوفے (buffet) سسٹم ہوتا تھا۔ کھانا شروع ہو چکا تھا اور چھری کانٹوں کی آواز میں ملی جلی ہنسی کا شور لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا پھر ڈنر ختم ہوا۔

''کیسا لگا ڈنر؟''

''آں...... کچھ کہا تم نے؟'' ہینری نے چونک کر ڈوک کو دیکھا۔

''تم کہاں کھوئے ہوئے ہو؟''

''ڈوک' اس ویٹرس کو دیکھو' میں نے اس سے قبل اتنا معصوم چہرہ نہیں دیکھا' بالکل ایسا جیسے کوئی تازہ پھول۔''

''ہینری' اس سے قبل تم نے بمبئی بھی نہیں دیکھا تھا۔ ابھی نئے نئے گوا سے آئے ہو اسی لیے سب تمہیں اچھا لگ رہا ہے' کچھ دن رہ لو گے تو تم بھی عادی ہو جاؤ گے۔ ویسے بچ کے رہنا ڈیئر' یہ بمبئی ہے' یہاں ہر قدم پر ایک سے بڑھ کر ایک ٹھگ اور جیب ٹٹولتی محبوبائیں ملیں گی۔''

اچانک ناچ کے سازوں نے جاز کی ایک دھن چھیڑ دی۔ شراب کے گلاس اونچے کیے گئے' جام ایک دوسرے سے ٹکرائے' ناچ شروع ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ جاز کو کانوں کے بجائے ٹانگوں سے سنا جاتا ہے' ڈوک بھی اٹھا اور ایک روسی لڑکی کے ساتھ رقص کرنے لگا۔

''ہینری' تم بھی ڈانسنگ فلور پر آ جاؤ۔''

بے خیالی میں ہینری کے اٹھتے قدم سرخ چیک دار اسکرٹ اور سیاہ جوتے پہنے' ہاتھوں میں وہسکی کی ٹرے اٹھائے لڑکی کے قریب جا کر تھم گئے۔

ناچ کا دوسرا دور شروع ہوا تو وہ اس کے قریب آ گیا۔

''یس' کون سا ڈرنک سر؟'' لبوں کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی بولیں۔

''میرا نام ہینری ہے' کیا تم میرے ساتھ ڈانس کرو گی؟''

''سوری سر' ڈیوٹی آور میں یہ ہمیں الاؤ نہیں۔''

''ٹھیک ہے' کب تک تمہاری ڈیوٹی ختم ہو گی؟ میں اس وقت تک تمہارا انتظار کرتا ہوں۔''

''سوری سر' ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بھی ممکن نہ ہو گا۔''

''کیوں؟''

''میری آنٹی کی طبیعت ناساز ہے اور ان کے کھانے اور دوا کے ٹائم سے پہلے گھر جانا ہے ورنہ وہ سو جائیں گی۔''

''کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟''

''مارگریٹ لینگ۔''

''تھینکس' کم از کم آج کے دن کا یہ تحفہ بھی بہت ہے۔''

''کیا کوئی خاص دن ہے آج؟'' مارگریٹ نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

''اوروں کے لیے تو نہیں' پر میرے لیے ضرور ہے۔ مجھے بمبئی کے ایک بڑے اسٹوڈیو کے' میں جاب ملی ہے اور اسی خوشی میں میرے دوست نے مجھے اس ہوٹل میں ٹریٹ دی ہے۔''

''اوہ' مبارک ہو سر۔''

''تھینک یو ماری......''

''اتنی جلدی آپ نے......''

''تکلف کی دیوار گرا دی' یہی نا؟'' ہینری نے مارگریٹ کی بات اچکتے ہوئے کہا۔

''نہیں' اپنی پریشانی بڑھا لی۔''

''وہ کیسے؟''

''ابھی تو آپ کو جاب ملی ہے اور تنخواہ ملنے سے قبل ہی اسے لٹانے کا بندوبست کر رہے ہیں؟'' مارگریٹ نے مسکراہٹ کے جلو میں کہا

لیکن اگلے ہی لمحے اس کے چہرے سے مسکان غائب ہوگئی۔

"اچھا سر! اب اجازت دیں، ہوٹل منیجر نے دیکھ لیا تو شامت آجائے گی۔ کہیں آپ کی جاب کا جشن میری جاب کا ماتم نہ بن جائے؟"

"او کے ماری، چلتا ہوں پھر ملنے کے لیے۔"

............*

"ارے ہینری، کہاں رہ گئے تھے؟ میں تو سمجھا کسی کونے میں تم اوور ڈرنک ہو کے پڑے ہو گے۔"

"ڈرنکر تو میں ہوگیا پر وسکی سے نہیں، پیار میں۔"

"اچھا، دو گھنٹے قبل تو یہ حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ لگتا ہے میرا اندازہ صحیح نکلا، تم نے زیادہ پی لی ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

"تھینکس ڈوک......"

"فار واٹ؟"

"تھینکس فار ٹریٹ۔"

"اوہ نو، تھینکس فار ایوری تھنگ۔"

............*

"ویری گڈ ہینری، تو نے تو کمال کر دیا تو اب تک کہاں تھا رے؟" بمبیا سیٹھ اپنی پارٹی کی تصویریں دیکھ کر خوش ہو رہا تھا جو کہ ہینری کے فن کا کمال تھیں۔

"شکریہ سر! آپ کو پکچرز پسند آئیں۔"

"پسند؟ ارے، بہت پسند آئیں۔ اب تک تیرا مالک پتا نہیں کن کن اناڑیوں کو میرے پاس بھیجتا رہا، اب بہت افسوس ہو رے لا ہے کہ تو اس وخت ہوتا جب میں نہرو جی کے ساتھ ملاقات کر رہا تھا تو اچھی سی فوٹو کھینچتا پھر میں اسے فریم میں لگاتا اور ڈرائنگ روم میں سجاتا۔"

"تو اب دوبارہ ملاقات کر لیجیے تصویر کے واسطے۔ نہرو جی سے کہہ دیجیے گا اس دن جلدی میں فوٹو کھنچوانا بھول گیا تھا۔"

"تو جھوٹ سمجھ رہا ہے کہ میری ملاقات نہرو جی سے ہوئی ہے؟ مجاق اڑا رہا ہے، کوئی بات نہیں، آج تو نے مجھے خوش کیا ہے اسی لیے معافی دیتا ہوں، پر آج کے بعد میری ہر پارٹی اور اہم لوگوں سے ملاقات کی تصویریں صرف تو کھینچے گا اور یہ لے اپنا انعام۔" سیٹھ نے سو روپے کا نوٹ ہینری کی ہتھیلی پر دھر دیا۔

"شکریہ سر......"

............*

"ہینری، تم میرے لیے بہت لکی ثابت ہوئے ہو۔ میرے کلائنٹ میں بھی اتنے سے دنوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اسی لگن سے کام کرو گے تو بڑی ترقی کرو گے۔"

"شکریہ سر! یہ انعام کی رقم آپ......"

"اپنے پاس رکھو یا اپنے پیرنٹس کو بھیج دو، جیسا چاہو اس پر تمہارا حق ہے۔"

"کیا بات ہے ہینری، تم بار بار گھڑی کیوں دیکھ رہے ہو؟ کہیں جانا ہے کیا؟"

"یس سر! آج مجھے اپنے فرینڈ سے ملنا ہے۔"

"تو پھر جاؤ، کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ کام تو تم اپنے وقت پر کر ہی لو گے۔"

"تھینکس سر......"

............*

"ڈوک......ڈوک......"

"ارے ہینری، بڑے خوش نظر آ رہے ہو، خیریت؟"

"خیریت ہی ہے، چلو تیار ہو جاؤ۔"

"تیاری، کیسی تیاری؟"

"ڈنر کے لیے یار بیسٹرو ہوٹل۔"

"دیکھو ہینری، ابھی تمہاری نئی نوکری لگی ہے اور اپنی کمائی کو بلاوجہ دیکھو...... ہم کسی اور سستے ہوٹل چلتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں، ٹریٹ تو میں تمہیں بیسٹرو ہوٹل میں ہی دوں گا اور پیسوں کی فکر مت کرو، میں نے کچھ ایڈوانس رقم لی ہے اپنے مالک سے تنخواہ میں سے۔"

............*

"لگتا ہے ہینری، تمہیں بسترو ہوٹل کی رنگین فضا کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی ہے۔" ڈوک نے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ارے اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو؟ ڈرنک لو۔"

لمحہ بہ لمحہ میوزک کی دھن بڑھتی جا رہی تھی، ساتھ میں ڈانس کا جوش اور مستی بھی، شاید یہ شراب کا نشہ تھا یا فراوانی دولت کا کہ بہکتے لڑکھڑاتے قدم اپنی ہم رقص کے ساتھ ناچتے ہوئے تھکنے نہیں پا رہے تھے اور اس بڑھتے شور اور جنوں میں ہینری کی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو واپسی کے ارادے سے اٹھا۔

"ارے سر، آپ؟" مترنم آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"میری...... کہاں تھیں تم؟ میں کب سے تمہیں تلاش کر رہا تھا؟"

"میں آج خاص طور پر تم سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔"

"اوہ یعنی آپ نے اپنی پریشانی بڑھانے کا بندوبست کر لیا۔ سر، میں بہت عام سی لڑکی ہوں، مجھ سے ملنے کے لیے آپ کو اس ہوٹل کی ضرورت نہیں، وہ بھی اس وقت جبکہ آپ کی نئی جاب لگی ہو۔"

"اگر تمہیں میری مالی حالت کا اندازہ ہے تو پھر ہوٹل سے باہر ملنے کا پتہ دے دو تا کہ مجھے تم سے ملنے اس ہوٹل میں آنے کی ضرورت نہ پڑے۔"

"اگر آپ واقعی مجھ سے ملنے اس ہوٹل آتے ہیں تو آئندہ آپ کو مایوسی ہوگی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آج یہاں میری جاب کا آخری دن ہے، بہت دنوں سے نئی جاب کی تلاش تھی۔ ہوٹل کی جاب مجبوری میں کرنی پڑی تھی۔ مجھے ایک کمپنی میں اسٹینو کی جاب مل گئی ہے۔"

"ویری گڈ ماری، بہت مبارک ہو نئی جاب۔"

"کیا اس خوشی میں ایک کپ چائے نہ ہو جائے؟ یہاں نہیں، باہر کسی ڈھابے پر؟"

"ضرور، کیوں نہیں، کل سن ڈے ہے، ہم کل ملتے ہیں۔"

"پر کہاں؟ جگہ تو بتا دو۔ میں نے تو ابھی پورا بمبئی بھی نہیں دیکھا سوائے گیٹ آف انڈیا کے یا پھر اسٹوڈیو جہاں میری نوکری لگی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، گیٹ آف انڈیا پر ہی شام پانچ بجے ملتے ہیں۔"

"ہینری، یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میری، یہ ڈوک ہے، میرا قریبی دوست اور ڈوک، یہ میری ہے، میری......"

"گرل فرینڈ؟" ڈوک نے جملہ اچک لیا۔ تینوں کا مشترکہ قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔

............*

"یار ہینری، بڑے فاسٹ نکلے، آتے ہی جاب کے ساتھ گرل فرینڈ بھی بنا ڈالی؟ یہ جانے بنا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے اور......"

"ڈوک، وہ جو کوئی بھی ہو، مجھے لگتا ہے، وہ صرف میرے لیے بنی ہے۔"

"کیا خاص بات ہے اس میں، ذرا میں بھی

سنوں، عام سی لڑکی ہے جیسی کہ لڑکیاں ہوتی ہیں۔“

”تو کیا کسی سے محبت کرنے کے لیے خاص ہونا ضروری ہوتا ہے؟ میں بھی تو عام سا بندہ ہوں بلکہ ہر شخص عام سا ہوتا ہے، یہ محبت ہی ہے جو ایک عام انسان کو خاص بلکہ بہت خاص بنا دیتی ہے، دنیا کے لیے نہیں بلکہ اس شخص کے لیے جو اسے پیار کرتا ہے اور میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے، کم از کم اس میں پرائیویسی تو رہتی ہے۔“

”او کے ہینری، گڈ لک۔“

•......•......•......•

”ایکسکیوزمی، ذرا ٹائم بتائیں گے؟“ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ گیٹ آف انڈیا پر پہنچ کر ایک راہ گیر سے ہینری نے وقت دریافت کیا تھا۔

”چار بج کر دس منٹ۔“

”تھینکس، اف ابھی تک صرف چار بجے ہیں۔ ارے، یہ کیا؟“ گرین اسکرٹ اور میچنگ ہیٹ پہنے اسے سامنے سے مارگریٹ آتی دکھائی دی۔ قریب آنے پر دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔

”میں نے سوچا، پانچ بجے سے پہلے پہنچ جاؤں تا کہ تمہیں انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔“ ہینری نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہینری، کوئی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں، میں بھی تو وقت سے پہلے پہنچ کر تمہیں کوفت سے بچانا چاہتی تھی۔ اب کیا ارادہ ہے؟“

”ارادہ تو تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کا ہے۔ اگر تم کو میرا یقین ہو۔“

”ہینری، تم پر تو مجھے پہلی بار ہی یقین ہو گیا تھا اور اس کا ثبوت تم نے لاسٹ نائٹ صرف مجھ سے ملنے ہوٹل تک آنے پر دے دیا تھا مگر ہینری، کوئی بھی فیصلہ جلد بازی میں مت کرنا، ہو سکتا ہے آنے والے وقت تک میں تمہارے معیار پر پوری نہ اتروں تو تمہیں پچھتانا پڑے۔“

”ایسا ہرگز نہیں ہوگا میری، میں تمہارا ساتھ ہمیشہ کے لیے......“

”اچھا، اب ساری باتیں یہیں کرو گے یا کہیں اور چلیں؟“ میری نے مسکراتے ہوئے بات کاٹی۔

”میں تو اس شہر میں نیا ہوں، تم ہی لے کر چلو، کہاں چلنا ہے؟“

”چوپاٹی سے بھیل پوری کھاتے ہیں۔ کشور لال بڑی اچھی بھیل پوری بناتا ہے، وہیں بیٹھ کر باتیں بھی کریں گے۔“

”ہندوستانی کھانے تو بڑے چٹ پٹے ہوتے ہیں، تم کیسے کھا......“

”میرا بچپن ہندوستانی کھانا کھاتے گزرا ہے کیونکہ میری پرورش ایک آشرم میں ہوئی ہے۔“

”اچھا، وہ کیسے؟“

”ہینری، میری ماں تپ دق کی مریضہ تھی، سینی ٹوریم میں دورانِ علاج ہی دنیا سے چلی گئی۔ میرے باپ نے دوسری شادی کر لی اور مجھے آشرم میں چھوڑ گیا کیونکہ اس کی نئی بیوی مجھے ساتھ رکھنے کو تیار نہیں تھی۔ سات سال کی عمر میں، میں آشرم پہنچی تھی۔ آشرم کا چوکیدار رتن داس اور اس کی بیوی نرملا بڑے نیک لوگ تھے، ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، وہ لوگ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ ہر تہوار پر اپنے پاس سے کپڑے بنا کر دیتے اور کھانے پینے کی چیزیں بھی مجھے اپنے کوارٹر میں لے جا کر کھلاتے تھے۔ میں انہیں داسی انکل اور ان کی بیوی کو نرملا آنٹی بلاتی تھی۔

دو برس قبل داسی انکل کی ڈیتھ ہو گئی۔ آشرم کے قانون کے مطابق، سولہ سال کی عمر کے بعد اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوتا ہے، اس کے لیے آشرم میں جگہ نہیں ہوتی کیونکہ نئے بے سہاروں کے لیے جگہ

[illegible] ہے اور اس طرح میں نرملا آنٹی کے کوارٹر [illegible] آشرم کے باہر بنا تھا۔ ہوٹل کی نوکری اپنا [illegible] گزر بسر کرنے کے لیے کی تھی۔“

”[illegible] ٹریجیکل اسٹوری ہے تمہاری۔“

”نہیں ہینری، ہر شخص کے ساتھ کوئی نہ کوئی [illegible] ہوتی ہے، بس شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ میں نے کبھی خود پر ترس نہیں کھایا اور نہ لوگوں کو موقع دینا چاہتی ہوں کہ وہ مجھ پر ترس کھائیں۔“

”مجھے اپنے انتخاب پر فخر ہے میری......“

”چلیں اب، کل میری جاب کا پہلا دن ہے اس لیے رات جلدی سونا چاہتی ہوں تا کہ ٹائم پر آفس پہنچوں اور تم بھی اب تھک گئے ہو گے۔“

”تمہارے ساتھ میں کبھی نہیں تھک سکتا، اب تو زندگی سے موت تک کا سفر تمہارے ساتھ طے کرنا چاہتا ہوں۔“

”اتنی بڑی بڑی باتیں مت کرو، بعض دفعہ ہم وقت کے ہاتھوں اپنی کہی باتوں کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو جاتے ہیں اور پھر ساری عمر ایک گلٹ کا بوجھ اٹھاتے گزر جاتی ہے۔“

”میری، تمہاری باتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں، اینی وے اب ہم فرائیڈے کو ملتے ہیں بلکہ اب کی بار تمہاری آنٹی سے بھی ملوں گا۔“

•......•......•......•

”ڈوک، تم یہاں؟“

”ہاں، سوچا، تم سے ملتا چلوں، اسی بہانے تمہارے ہاتھوں ایک دو تصویر بھی کھنچوالوں۔“

”تم بیٹھو، ابھی آیا، جب تک تم یہ کافی پیو۔“

”اور سناؤ ہینری، کیسی گزر رہی ہے؟“ تصویر کھنچواتے ہی ڈوک نے کہا۔ ”ابھی تک وہی گرل فرینڈ ہے یا لائف میں کوئی دوسری انٹری دے چکی ہے؟“

”ڈوک، میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہہ رہا ہوں، میں شادی کروں گا تو میری سے ہی اور بہت جلد۔“

”او کے ڈیئر، پر تمہاری شادی میں بیسٹ مین میں ہی بنوں گا۔“

”ضرور، مجھے خوشی ہوگی۔“

”ہینری، اس سنڈے میں اور میری گرل فرینڈ سنیما جا رہے ہیں۔ گیگری پیک کی نئی فلم لگی ہے، تم اور میری بھی چلو تو اچھا رہے گا۔“

”ٹھیک ہے ڈوک، اچھا ہے، میری بھی ساتھ ہو گی تو ہم لوگوں کی انڈر اسٹینڈنگ بڑھے گی۔“

•......•......•......•

”ڈوک، یہ کچھ پیسے ہیں، انہیں کو ابھجوا دو میرے پیرنٹس کو۔ مجھے جلدی ہے اس لیے تم میرا یہ کام کر دو۔“ ہینری نے ایک لفافہ ڈوک کو دیتے ہوئے کہا۔ اس وقت میری بھی موجود تھی۔

”میری، مجھے ہندوستان کے کچھ دیہاتوں میں جانا ہوگا اپنے مالک کے ساتھ، دو ماہ بعد واپسی ہوگی۔ تصویری مقابلے میں ہم حصہ لے رہے ہیں، بیسٹ تصویر کو انعام ملے گا اور بیسٹ فوٹو گرافر کے اعزاز کے ساتھ میڈل بھی۔ جانے کیوں مجھے لگتا ہے، یہ انعام میں جیت لوں گا۔“ ہینری نے پر جوش انداز میں کہا۔

”پر دو ماہ ہینری، زیادہ نہیں ہیں؟“

”بہت زیادہ ہیں مگر تصویری کام ایک دو دن میں تو مکمل نہیں ہوگا۔ ہر وقت کا سین الگ ہوتا ہے اور پھر دور دراز کے دیہات میں اس سے قبل تو گیا نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے، کام پہلے مکمل ہو جائے تو جلد لوٹ آؤں گا۔“

”ہینری، ان دس مہینوں میں مجھے تمہاری اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اب......“ میری نے اداسی سے

کہا۔
''میری' میرے حوصلے پست مت کرو۔ اس جدائی کا رزلٹ ہمارے شاندار مستقبل کی ضمانت ہو گا۔ میں آنے کے فوراً بعد تم سے شادی کرلوں گا اور ڈوک' تم میری کی خبر گیری کرتے رہنا' اسے اداس ہرگز مت ہونے دینا پھر جب میں واپس آؤں گا تو ہم گوا چلیں گے ممی ڈیڈی سے ملنے۔ دو ماہ بعد ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہوں گے۔ میرا انتظار کرنا' میری۔''

''اوکے ہینری' تم جاؤ' میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' اور الوداعی بوسے کے ساتھ دونوں جدا ہوئے۔

......•......•......

1940ء کے آخری ڈوبتے سورج کے ساتھ ہینری کی واپسی ہوئی تھی اور بے اختیار اس کے قدم گیٹ آف انڈیا کی طرف بڑھ گئے تھے۔

نارنجی اسکرٹ پہنے' بلیو مفلر گردن کے گرد لپیٹے مارگریٹ کو گیٹ پر منتظر پا کر ہینری کی حیرت کے مارے چیخ نکل گئی۔

''او میری ڈارلنگ' تم کیسے یہاں؟ میں نے تو آنے کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ تمہیں کیسے پتا کہ میں......''

''میں نے کہا تھا نا کہ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ دیکھو' میں نے اپنا وعدہ پورا کیا' اسی جگہ موجود ہوں جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔''

''میں تو تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا کہ آج نیو ایئر نائٹ کا فنکشن ہم اسی ہوٹل میں منائیں گے جہاں ہماری ملاقات ہوئی تھی اور اسی لیے میں تمہاری آنٹی کے گھر جانے والا تھا۔

ایسا کرتے ہیں' ڈوک کے پاس چلتے ہیں' اسے بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ تھوڑا ریسٹ بھی کرلوں گا اس کے کوارٹر میں۔''

''نہیں ہینری' ابھی ڈوک سے مت ملو' پورے دو مہینے' تین دن بعد ہم ملے ہیں۔ ابھی میں تمہارے ساتھ بہت انجوائے کرنا چاہتی ہوں' صرف تم اور میں۔ ڈوک سے ملنے کے لیے تو تمام عمر پڑی ہے پھر جانے' یہ موقع ملے نہ ملے۔''

''او کے' او کے' ہنی...... ایسا کرتے ہیں' ہم تمہاری آنٹی کے گھر چلتے ہیں۔''

''میں نے کہا نا' صرف میں اور تم اور کوئی نہیں' چاہے آنٹی ہی کیوں نہ ہوں۔''

''پھر کیا کریں؟''

''ایسا کرو' دو گلی چھوڑ کر ایک سستی سی سرائے ہے' اس میں ریسٹ لے لو' سامان ہی کیا ہے تمہارا' ایک بیگ اور ایک کیمرہ' سونے کے لیے ایک بستر ہی تو چاہیے' باقی وقت تو ہم انجوائے کریں گے۔''

''چلو' ٹھیک ہے ماری' تم ایک بہترین بیوی ثابت ہوگی' میرا انتخاب کتنا بہترین ہے' اس کا مجھے ہمیشہ فخر رہے گا۔'' وہ دونوں سرائے کی جانب چل دیے۔

''تمہیں کیسے پتہ ماری' کہ یہاں سرائے ہے؟'' سرائے کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے ہینری نے پوچھا۔

''زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں' بمبئی شہر میں جگہ جگہ ایسی سرائے بنی ہوئی ہیں۔ اچھا' اب ہم رات کو ملیں گے بیسٹرو ہوٹل میں۔''

''ماری' رکو' یہ ڈریس لیتی جاؤ' یہ میں نے تمہارے لیے لیا تھا۔ آج تم اسی ڈریس کو پہننا اور یہ ہار بھی۔'' ہینری نے سیپیوں سے بنا ہار مارگریٹ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔

......•......•......

کیمرے میں رول ڈالتے ہوئے ہینری مسرور آواز میں رومینٹک سا گانا گنگنا رہا تھا کہ اچانک کسی کا احساس ہوا اور اس احساس کے ساتھ ہی اس نے سرائے کے دروازے کے باہر قدم رکھا جہاں پہلے سے مارگریٹ کھڑی نظر آئی۔

''کمال کرتی ہو تم' اندر نہیں آ سکتی تھیں؟ اگر ... لگ جاتی تو......؟'' ہینری کہتے کہتے رک گیا اور میری کو نظر بھر کے دیکھا۔ ''او گاڈ...... ماری...... اتنی خوبصورت کبھی نہیں لگیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ تم کسی اور دنیا سے آئی ہو' سب سے الگ۔''

''واقعی ہینری' تمہاری محبت مجھے دوسری دنیا سے کھینچ لائی ہے۔''

''او ماری...... تم اور تمہاری باتیں......''

''اچھا چلو' دیر ہو رہی ہے۔ پارٹی شروع ہونے والی ہوگی۔''

......•......•......

رات بارہ بجے کا گھنٹہ بجتے ہی بیسٹرو ہوٹل کی نیم تاریک فضا ایک دم رنگ و روشنیوں میں نہا گئی۔ نیو ایئر 1941ء کا بورڈ اسٹیج پر جگمگا رہا تھا اور ساتھ ہی ... جاتے سازوں کے ساتھ دمکتے چہرے بھی۔

''ہیپی نیو ایئر ماری......''

''ہیپی نیو ایئر ہینری......''

''ماری...... کل سال کا پہلا دن شروع ہو رہا ہے اور میں اس دن پہلا کام تمہاری آنٹی کے پاس ... ڈول لے کر جاؤں گا' تمہیں ہمیشہ اپنے پاس ... کے لیے۔''

''ہینری...... میں تو ہمیشہ سے تمہاری ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے' پر کسی اور کی نظر بھی تمہیں پسند ... تو اور ویسے بھی تم آج اتنی خوبصورت لگ ... اس لیے کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔''

''اب تو صرف تم ہی مجھے دیکھ سکتے ہو ہینری۔'' ... اداسی سے یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ماری

غزل

تمہیں یاں چھوڑ کے آگے بڑھوں تو کیسے؟
کٹھن ہے راستہ' میں آگے بڑھوں تو کیسے؟

زمانہ دیتا ہے دکھ' یہ بھی جانتی ہوں مگر
زمانہ چھوڑ کے میں آگے بڑھوں تو کیسے؟

بڑھی ہے تیرگی' چہرے دکھائی دیتے نہیں
کسی کے چہرے کو میں جا کے پڑھوں تو کیسے؟

بہت بلندی پہ منزل دکھائی دیتی ہے
میں تھک کے بیٹھ گئی اور چڑھوں تو کیسے؟

بتول دکھ سے بھری ہے کتاب زیست مری
بہت کٹھن ہے' اس کتاب کو پڑھوں تو کیسے؟

نازیہ بتول رضا

نے نظریں چرائیں۔
"کیوں؟ کیا دنیا کے سارے لوگ اندھے ہو گئے ہیں جن کو تم نظر نہیں آ رہیں؟ جو صرف میری آنکھیں تمہیں دیکھ سکتی ہیں؟ اچھا ماری...... رات بہت ہو چکی ہے، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"
"نہیں ہینری...... تم ریسٹ کرو، سفر کر کے آئے ہو، میں چلی جاؤں گی، ویسے بھی نیو ایئر نائٹ ہے، کافی رونق لگی ہے، میں آرام سے چلی جاؤں گی اور ہاں، کل ہم سمندر کے کنارے ملیں گے صبح میں، تم اپنے کام مکمل کر لینا۔ ڈوک سے ابھی مت ملنا، ہم ایک ساتھ وقت گزاریں گے۔"
"اچھا بھئی، نہیں ملوں گا اور سنو تم کل یہی میکسی پہن کر آنا، میں نے کچھ تصویریں تمہارے ساتھ اتارنی ہیں۔"
"اوکے بائے۔"
....
"کسے ڈھونڈ رہے ہو ہینری؟" سمندر کا نظارہ کرتے ہوئے ہینری کو مارگریٹ کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔
"ارے ماری...... تم؟ میں اب کسے تلاش کروں گا؟ میری تلاش تو تم پر ختم ہو گئی ہے۔ میں ابھی ابھی پہنچا تھا۔ سمندر کا نظارہ بھی کتنا دلفریب لگتا ہے نا، وہ بھی اس وقت جب ہم سفر بھی دلکش ہو۔"
"ہینری، تم تو شاعرانہ باتیں کرنے لگے ہو۔"
"اچھا ماری...... ادھر بیٹھو، یہاں سے بیک گراؤنڈ بڑا خوبصورت آئے گا۔ میں اس تصویر کو انلارج کرا کے رکھوں گا پھر ہم اسے اپنے گھر میں سجائیں گے حسین یادوں کے طور پر۔" اسٹینڈ پر کیمرہ فٹ کرتے ہوئے ہینری مسلسل بولے جا رہا تھا۔ آٹومیٹک کیمرے کو سیٹ کر کے جلدی سے مارگریٹ کے ساتھ جا کھڑا ہوا اور کتنی ہی تصویریں اس نے ماری کے ساتھ کھینچ ڈالیں۔
"ماری، چلو سینما چلتے ہیں۔"
دونوں سینما پہنچے، ٹکٹ گھر سے ٹکٹ لیا۔
"ماری، سردی زیادہ ہے، ایسا کرو، تم یہ میرا کوٹ پہن لو۔" پاپ کارن اور چپس کے پیکٹ پکڑے سینما ہال میں داخل ہوتے ہوئے ہینری نے اپنا کوٹ اسے اوڑھایا۔
انٹرویل ہوتے ہی سینما ہال مدھم روشنی میں نہا گیا۔
"ماری، وہ دیکھو، اگلی دو سیٹ پہلے ڈوک بیٹھا ہے۔"
"ہینری، مجھے واش روم جانا ہے۔"
"اچھا چلو، میں بھی چلتا ہوں۔"
"نہیں، میں چلی جاؤں گی، فلم اسٹارٹ ہونے والی ہے۔ اگر تم بھی چلو گے تو پتا کیسے چلے گا سین میں کیا ہوا؟" پھر خاصی دیر ہو گئی مگر ماری نہیں آئی تو ہینری کو فکر ہونے لگی۔ وہ ہال سے باہر نکلا اور اس نے سارے واش روم چیک کر لیے مگر ماری کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔
"ایکسکیوز می، یہاں آپ نے کسی لیڈی کو اندر جاتے دیکھا ہے؟ لمبا قد، سنہری بال، اس نے بلیو میکسی اور بلیک کوٹ پہن رکھا ہے۔" ہینری نے ٹکٹ چیکر سے دریافت کیا۔
"نو سر، ادھر تو جب سے فلم شروع ہوئی، ایک بھی آدمی باہر نہیں آیا۔ لگتا ہے، فلم زیادہ انٹریسٹنگ ہے کہ لوگ انٹرویل میں بھی نہیں نکلا سوائے ایک پارسی بوڑھے کے۔"
"ارے ہینری، تم کب آئے؟" سینما ہال کے دروازے سے نکلتے ڈوک نے اسے گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"کل آیا ہوں۔"
"اور تم نے مجھ سے ملنا ضروری نہیں سمجھا؟ بڑے مغرور ہو گئے ہو۔"
"یہ بات نہیں ہے، میں تو آتے ہی تم سے ملتا، پر ماری کی خواہش تھی کہ ہم کچھ ٹائم ساتھ گزاریں۔ میں آج ماری کے ساتھ تمہارے پاس آنے ہی والا تھا کہ ایک نئی پریشانی کھڑی ہو گئی۔ یہاں سینما دیکھتے ہوئے ماری واش روم گئی تھی، پر گیٹ کیپر کہتا ہے کہ اندر سے کوئی لڑکی باہر نہیں نکلی۔ تمام جگہ ڈھونڈ لیا، پر ماری کا کہیں پتا نہیں۔"
"ہینری، تم کیا کہہ رہے ہو؟ کہیں صدمے سے تمہاری دماغی حالت تو...... اوہ گاڈ......!"
"کیسا صدمہ ڈوک؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
"ہینری، مارگریٹ اب اس دنیا میں نہیں رہی، وہ مر گئی ہے تمہارے جانے کے پندرہ دن بعد ہی روڈ ایکسیڈنٹ میں......" ہینری کے سر پر جیسے بم پھٹا تھا۔
"بکواس کر رہے ہو تم......"
"میں سچ کہہ رہا ہوں، تم نے جانے سے قبل مجھے تاکید کی تھی کہ میں مارگریٹ سے ملتا رہوں، اس کا خیال رکھوں، میں صرف دو بار ہی اس سے مل پایا، ایک تمہارے جانے کے بعد پہلے ویک اینڈ پر اور دوسری بار اس کی موت سے دو روز قبل جب میرا کسی کام سے اس کے آفس کی طرف سے گزر ہوا تو میں اس سے ملنے چلا گیا جہاں سے معلوم ہوا کہ آفس آتے ہوئے ماری کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ہسپتال کی نوبت بھی نہ آئی اور وہ راستے میں دم توڑ گئی۔ اس کے آفس اسٹاف کے ساتھ میں بھی اس کی آنٹی سے افسوس کرنے ان کے گھر گیا تھا۔ اگر میرا یقین نہیں تو اس کی آنٹی سے چل کر پوچھ لو۔"
"کیوں پوچھوں؟ جبکہ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں بیشتر وقت ماری میرے ساتھ...... بلکہ چلو، میں اس کا ثبوت بھی تمہیں دکھاتا ہوں، آؤ میرے ساتھ۔ ابھی پروف مل جائے گا۔" ڈوک کو لے کر ہینری سیدھا اسٹوڈیو پہنچا، بیگ ایک طرف پھینک کر وہ ڈارک روم میں چلا گیا۔
"ڈوک...... ڈوک......" تھوڑی دیر بعد ہینری کی آواز بلند ہوئی۔ ڈوک تیزی سے ڈارک روم میں پہنچا، اس نے روشنی جلائی۔
"کیا بات ہے ہینری؟"
"یہ دیکھو۔" ہینری نے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے اسے تصویریں دکھائیں، ہر تصویر میں صرف ہینری تھا اور اس کا ہاتھ کسی نہ کسی پوز میں ہوا میں معلق نظر آیا۔
"دیکھو، اس تصویر میں یہاں میری کو میں نے شانے سے پکڑ رکھا تھا، اس میں اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے، اس میں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے اور اس میں تو میں نے میری کے ہاتھوں کو تھام کر پروپوز کرتے ہوئے اور......"
"باہر چلو ہینری......" ڈوک ہاتھ پکڑے اسے روم سے باہر لے آیا۔ ہینری حیرت کے سمندر میں غوطہ زن چل رہا تھا کہ کسی چیز سے پاؤں ٹکرایا، ڈوک نے جھک کر اٹھایا، بیگ سے نکلے کپڑے پر نظر پڑتے ہی ہینری کی چیخ نکل گئی۔
"ڈوک...... یہ تو وہی ڈریس ہے جو میں ماری کے لیے لایا تھا کل رات اور آج بھی وہ اسی ڈریس میں تھی۔" بلیو میکسی اور اس میں الجھا سیپیوں کا ہار ہاتھوں میں لیے ہینری چیخ رہا تھا۔
"وہ یہاں آئی تھی، وہ یہاں رکھ گئی ہے، وہ مجھے......"
"ہینری......" ڈوک نے قدرے چیختے ہوئے

کہا۔

''مارگریٹ مرچکی ہے..... چلو' میرے ساتھ ابھی اور اسی وقت مارگریٹ کی آنٹی کے پاس۔''

•......•......•

''کون ہے؟''

''آنٹی..... میں ڈوک ہوں' دروازہ کھولیے۔''

''ہیلو آنٹی ...... آنٹی ..... یہ ہینری ہے۔''

''اچھا تم ہو ہینری...... مارگریٹ ہر وقت تمہارا ذکر کرتی رہتی تھی بلکہ اپنی باتیں کم اور تمہاری زیادہ کرتی تھی۔''

''تھی..... مطلب.....؟'' ہینری نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''ہاں بیٹا.....! لیکن وہ اب بھی زندہ ہے ہماری یادوں میں۔''

''آنٹی..... ہینری' مارگریٹ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''آپ پلیز' اسے' اس سے ملوا دیں جہاں وہ ہے۔'' ڈوک نے کہا۔

''اس وقت؟ ابھی تو رات ہو گئی ہے۔''

''ضروری ہے آنٹی.....!'' ڈوک نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

کنٹری قبرستان میں قطار در قطار قبروں پر کراس کے نشان اور اس کے نیچے آویزاں کتبے اور سفید صلیب کے نیچے ابدی نیند سوتے ہوئے ساکن وجود کا تصور آتے ہی خوف کی لہر آنے والوں کے قدم منجمد کر رہی تھی۔

ہینری اور ڈوک نرملا آنٹی کی قیادت میں چلتے جا رہے تھے۔ آخر ایک قدرے زیادہ سفید قبر پر نرملا آنٹی کے قدم تھم گئے۔ قبر اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ پول پر لگی ہلکی پیلی روشنی قبر پر نصب تختی پر لکھے نام کو پڑھنے کے لیے کافی تھی۔

'مارگریٹ لینگ

'15th Nov,1940.

ہینری اور ڈوک' نرملا آنٹی کے پیچھے تھے۔

''اوہ......!'' ایک ہلکی سی چیخ ہینری کے منہ سے نکلی اور اس کے ہاتھ قبر پر رکھے کوٹ پر تھے۔ وہ کوٹ جو اس نے چند گھنٹوں قبل ماری کو پہنایا تھا۔

''تو ماری سچ مچ اس دنیا میں نہیں رہی تھی اسی لیے وہ مجھے' ڈوک اور نرملا آنٹی سے ملنے سے روک رہی تھی۔ وہ اپنی اور میری تشنگی پوری کرنا چاہ رہی تھی۔ اگر میری نہیں رہی تو میں کیا کر رہا ہوں اس دنیا میں؟'' یہ الفاظ بڑبڑاتے ہوئے ہینری نے ایک جانب دوڑ لگا دی۔ وہ دیوانوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔

''ہینری...... ہینری...... کہاں جا رہے ہو؟'' سرپٹ بھاگتے ہینری کو ڈوک روکتا ہی رہ گیا تھا پھر اس کے بعد ہینری کہاں گیا' یہ کسی کو پتا نہیں چلا۔''

•......•......•

محبت کی یہ عجیب کہانی میرے بابا کی زبانی مجھ تک پہنچی تھی۔ میرے بابا اس کہانی کے زندہ کرداروں سے بہ نفسِ نفیس خود تو نہیں ملے تھے البتہ کسی کے ذریعے اُن تک یہ قصہ پہنچا تھا۔ میں اس وقت تاج ہوٹل کے روبرو کھڑی تھی مگر میرے تصور میں بسٹرو ہوٹل گھوم رہا تھا جہاں اس پریم کہانی نے جنم لیا تھا۔ بسٹرو ہوٹل تو فنا ہو چکا ہے مگر اس سے وابستہ محبت کی کہانی کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

محمد سلیم اختر

پھر وہ زندہ ہو گیا

محسن نقوی کا خیال

لہو سے جن کو منور کرے دماغ بشر
ہوائیں ایسے چراغوں سے خوف کھاتی ہیں

ایک شہید کا روح پرور ماجرا، اس نے حقیقی زندگی کا مفہوم سمجھ لیا تھا

ساجد علی کو قدرت نے خوب صورتی اور ذہانت دونوں عطا کی تھیں۔ وہ پیدائشی ذہین تھا۔ ابھی وہ محض دو سال کا تھا کہ ایسے ایسے سوال کرتا' گھر والے دنگ رہ جاتے اور کہتے تھے کہ ساجد بڑا ہو کر وکیل بنے گا پھر وہ کچھ اور بڑا ہوا اور آس پڑوس والوں کو اس کی ذہانت کا علم ہوا تو وہ بھی یہی کہنے لگے۔ یوں بچپن ہی سے وہ وکیل ہی کہلانے لگا۔ ہر کوئی اسے اصلی نام کی بجائے 'وکیل' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ تھا بھی ایسا ہی' بڑے بوڑھوں سے کوئی بات سن لیتا جو اس کے مطلب کی نہ بھی ہوتی مگر پھر بھی اس کے بارے میں طرح طرح کے عجیب سوال کرتا اور اس بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ اس



نے بچپن میں جب پہلی بار ہی یہ سنا کہ شہید زندہ رہتا ہے' اس وقت سے یہ فقرہ اس کے ننھے سے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ شہید زندہ کیسے رہ سکتا ہے؟ جبکہ وہ مر جاتا ہے۔ وہ گھنٹوں سوچتا لیکن اس کا ننھا سا ذہن اس گتھی کو سلجھا نہ پاتا کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟

اسکول میں اس نے اپنے استاد سے پوچھا۔ ''بھلا شہید کیسے زندہ رہے گا جبکہ وہ مر جاتا ہے؟''

تب استاد اسے پیار سے سمجھاتے اور کہتے۔ ''ساجد بیٹے! شہید خدا اور وطن کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے اس لیے مرتا نہیں' مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔''

لیکن ساجد کے پلے کچھ بھی نہ پڑتا' بس وہ خاموش ہو جاتا۔

اس نے گاؤں کے اسکول سے آٹھ جماعتیں پاس کیں اور باپ کے ساتھ زمینداری کرنے لگا حالانکہ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن گاؤں میں صرف مڈل تک اسکول تھا۔ آگے پڑھنے کے لیے شہر جانا پڑتا تھا اور اس کے باپ کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ اسے شہر بھیج سکتے اس لیے اس نے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا۔ وہ ہل چلاتے ہوئے بھی شہید کے زندہ ہونے کے بارے میں سوچتا رہتا۔ آہستہ آہستہ اسے اس بات کی سمجھ آ گئی کہ وطن کی آن پر قربان ہونے والا شہید کہلاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید ہو جاتا ہے۔

•......•......•......•

پھر وہ وقت بھی آیا جب مسلمان پاکستان کے حصول کی جنگ میں جدوجہد میں مصروفِ عمل ہو گئے' تب وہ اسی جذبے کے تحت گاؤں کے مسلمان لڑکوں کے ساتھ مل کر ایک چھڑی پر ہری سی پٹی باندھ کر ''پاکستان زندہ باد! لے کے رہیں گے پاکستان۔'' کے نعرے لگانے لگا' تب اس کی عمر پندرہ' سولہ سال تھی۔ جب وہ یہ نعرے لگاتا تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھتا۔ وہ خوشی سے دیوانہ ہو جاتا اور زیادہ جوش و ولولے سے ہاتھ کی مٹھی اونچی کر کے زور زور سے نعرے لگاتا اور جب گھر میں داخل ہوتا تو مٹی سے اٹا سر' ننگے پاؤں' کھدر کے پیوند شدہ کپڑے' پسینے سے تر چہرہ اور ہاتھ میں وہی چھڑی جس پر سبز پٹی لہرا رہی ہوتی تھی' وہ چھڑی کو بڑی ہی حفاظت سے اونچی جگہ رکھ دیتا پھر وہ اپنی ماں کو تمام دن کی کارروائی سناتا تو ماں خوشی اور شفقت سے اس کا چہرہ جو دھوپ کی تمازت اور جوش کی شدت سے تپ رہا ہوتا تھا' دونوں ہاتھوں میں تھام کر ہولے سے اس کی پیشانی چومتی پھر ماں اسے نیم گرم دودھ کا پیالہ دیتی' دودھ پی کر وہ تصور میں پاکستان کو دیکھتا' تب نیند کی دیوی دھیرے دھیرے اسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔

دوسرے دن پھر وہی نعرے' وہی ڈگر اور وہی وکیل ساجد چھڑی پکڑ کر اپنے سفر پر روانہ ہو جاتا۔ وہ بے تکان چلتا' بے لگان بولتا' نہ پاؤں رکتے نہ ہاتھ' نہ حلق خشک ہوتا۔ وہ دن بھر جوش اور ولولے سے نعرے لگاتا۔ جوں ہی سورج اپنے چہرے پر شام کی سیاہی کا نقاب ڈالتا' تب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھر واپس آ جاتا۔

اُس دن سورج نیلے گگن کی چھاتی پر اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا کہ ہر طرف ایک شور سا اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ نمسکار کرنے والے ہاتھوں میں خنجر اور چھرے لہرا رہے ہیں۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کے اماں ابا اور وہ اپنا گھر چھوڑ کر کچھ کپڑے اور کھانے پینے کا تھوڑا سا سامان لے کر چھکڑے پر بیٹھ کر گاؤں سے باہر آ گئے۔

''اماں......! ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس

...اس کے ذہن میں بس یہی سوال آیا تھا اور اس ...اں نے جواب میں کہا تھا۔ ''پاکستان!'' گاؤں کے دوسرے مسلمان بھی ایک قافلے کی ...ں میں پاکستان کی طرف رواں دواں تھے۔ راستے میں ساجد نے ماں سے پوچھا۔ ''کتنی ...ے پاکستان؟''

''بس تھوڑی ہی دور ہے۔'' ان الفاظ سے اس ...اں کے چہرے پر سے دکھ کے سائے چھٹنے

''ہمارا پاکستان اس سے اچھا ہوگا؟'' تب اس ...اں کچھ نہ بولی۔

پھر وہ چھکڑے پر کھڑا ہو کر آنکھوں پر ہاتھ کا ...کر کے دور پاکستان کی سرزمین دیکھنے کی سعی ...لگا لیکن اسے حدِ نظر تک درخت ہی نظر آئے ...گرد و غبار جس پر خون کی سرخی غالب تھی۔ وہ ...ہو کر قافلے کی بھول بھلیوں میں کھو گیا پھر ان کا ...ایک جھٹکے سے رک گیا۔ قافلے میں افراتفری ...۔ پتہ چلا کہ کچھ ہندوؤں اور سکھوں نے قافلے ...کر دیا ہے۔ اُس کی ماں اُسے اور اُس کی بہن کو ...جھاڑیوں میں دبک گئی۔ اس وقت اُس نے ...کہ ماں کچھ کہہ رہی ہے۔ ہندو اور سکھ ایک نہر ...پل پر راستہ روکے کھڑے تھے۔ سورج کی ...کرنوں میں چھرے' خنجر اور کرپانیں بجلی کے ...کوندوں کی مانند چمک رہے تھے پھر نہر کا پانی سرخ ...لگا اور اس نے ایک مانوس سی آواز سنی۔ ''نعرۂ ...اللہ اکبر! نعرۂ حیدری......یا علیؓ!'' ان ...کی تیز آنچ سے اُس کا خون کھولنے لگا۔ وہ بے ...سا ہو گیا لیکن اس کی ماں نے مضبوطی سے اسے ...رکھا۔ بربریت کی دھند چھٹی تو اس نے اپنے ...خون اور مٹی کے کفن میں لپٹا پایا۔ اُس وقت ...آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کی ماں نے

مقدر کا چاند

وہ پوچھتا ہے
گلاب زادی
تری ہتھیلی کے آسماں پر
چمکنے والا
مرے مقدر کا چاند کیسے گہن گیا ہے؟
میں فون بند کر کے رو پڑی ہوں
میں اس کو کیسے بتاؤں آخر
وہ میری منزل تو تھا ہمیشہ
مگر مقدر کبھی نہیں تھا

عکاشہ سحر

آسمان کی طرف نظر اٹھا کر اس کے باپ کے سینے پر ہاتھ پھیرا پھر اس کی ماں کی انگلیاں سینے کے بے شمار زخموں پر سے چہرے پر آ کر ٹھہر گئیں۔ اس کی ماں کے لب تھرتھرائے۔ ''تم شہید ہو' تم زندہ ہو۔'' اِن الفاظ کو سن کر ساجد کے ذہن میں ہلچل مچ گئی پھر وہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر آگے چل پڑے۔

راستے میں اُس نے دیکھا کہ بے شمار بے گور و کفن شہید پڑے ہیں تو اس نے سوچا کہ ایک میرا باپ ہی نہیں' ہزاروں باپ ہیں جو پاکستان پر قربان ہو گئے ہیں' سینکڑوں معصوم بچے جن کے سر کہیں اور دھڑ کہیں اور عورتیں جو اپنا سب کچھ لٹا کر گہری نیند سو رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی ماں کی آنکھیں نم ہو گئیں لیکن ساجد نہ رویا' روتا بھی کیسے' بھلا خوشی کے موقع پر کون روتا ہے؟ آج اس کے لگائے ہوئے نعرے سچ ثابت ہو رہے تھے۔ باطل ہار گیا تھا۔ چھکڑے کے پہیے کے ہر چکر کے ساتھ اس کے معصوم ذہن میں سوچ کی ایک گرہ بندھ جاتی۔ گرد و غبار سے اٹے چہرے' بچوں کے بھوک سے کمہلائے چہرے' عورتوں کے سوگوار چہروں پر

سہاگ اجڑنے کی ایک الم ناک داستان لیکن ان تمام باتوں سے ہٹ کر تمام چہروں پر ایک چمک بھی تھی دلوں میں ایک خوشی بھی تھی کہ پاکستان آنے ہی والا ہے جیسے انہیں اپنوں سے بچھڑنے کا غم نہیں اپنے گھر بار چھوڑنے کا افسوس نہیں۔

پاکستان آ کر بھی ان کو ایک گاؤں میں ہی رہائش ملی پھر رشتے داروں کی تلاش شروع ہوئی۔ کچھ بچھڑ گئے کچھ کھو گئے اور کچھ مل گئے۔ دوسری صبح مسجد سے اللہ اکبر کی میٹھی صدا ابھری جس نے لوگوں میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔

جب امام مسجد نے بتایا۔ ''اِن فسادات میں مرنے والے سب شہید ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔'' تو وہ خوشی خوشی اپنے ساتھیوں کو بتاتا کہ اس کا باپ شہید ہے اور وہ زندہ ہے۔

جب وہ کچھ اور بڑا ہوا تو اس نے ماں کا سہارا بننا چاہا۔ اس کی ماں نے اسے بڑے لاڈ اور ناز و نعم سے پالا تھا۔ ماں کی ہی خواہش پر وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اپنی ماں اور بہن کو اللہ کی نگہبانی میں دے کر وہ ٹریننگ پر چلا گیا پھر ایک دن جب وہ فوجی وردی پہنے گاؤں آیا تو اس کی ماں خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ اس نے مولوی صاحب کو بلایا اور نیاز فاتحہ دلا کر شیرینی بانٹی کہ اس کا بیٹا وطن کا محافظ بن گیا ہے۔ ساجد اب ایک بانکا اور سجیلا جوان تھا۔ اس کی ماں اور بہن اس پر واری جاتی تھیں۔

....

۱۹۶۵ء میں وہ سالانہ چھٹیاں گزارنے گاؤں آیا ہوا تھا کہ ایک رات ہندوستان نے اس کے ملک پر رات کے اندھیرے میں حملہ کر دیا۔ اسے بلاوا آ گیا۔ وہ اسی وقت روانہ ہو گیا۔ اس کی ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے چہرے پر ایک عزم تھا ایک جوش ایک ولولہ تھا ایک امنگ تھی ایک خواہش تھی جو اس کے جھریوں بھرے ... چاندنی کی مانند عیاں تھیں۔ ''اُس کا ... کہلائے۔''

جاتے وقت اُس کی ماں نے اُس ...

''ساجد بیٹا! ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد ... لیے یہ حق و باطل کا پہلا معرکہ ہے۔ تیرے ... جان دے دی تھی لیکن بھاگا نہیں تھا۔ تم بھی ... وطن کی آن پر قربان ہو جانا لیکن پیٹھ نہ دکھانا ... ملک کی بنیادوں میں تیرے باپ کا ہی نہیں ... باپوں کا خون شامل ہے۔ اب پھر پاکستان کو ... ضرورت ہے، خون ضرور دینا، دریغ نہ کرنا۔ شہادت کا ... رُتبہ پا کر گاؤں واپس آنا۔ میں شہید کی بیوہ ... شہید کی ماں بھی کہلانا چاہتی ہوں۔ اگر گولی ... پشت پر لگی تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی، ... نہیں بخشوں گی۔''

وہ بڑے انہماک سے ماں کی باتیں سنتا ... سہاگ قربان کر کے بیٹے کو قربانی کی تلقین کر ... والی عظیم عورت نے بیٹے کو خوشی سے رخصت ... اس کی پیشانی چوم کر خدا حافظ کہا۔ سارے را... ساجد یہ سوچتا رہا کہ اللہ تعالیٰ نے شہید کو کتنا بلند ... عطا کیا ہے کہ ماں جیسی عظیم ہستی بھی بیٹے کو شہید ... دیکھ کر مسکراتی ہے جو عام حالات میں بیٹے کو ذرا ... تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے۔

ساجد کی رجمنٹ چونڈہ کے محاذ پر دشمن کا مقا... کر رہی تھی۔ ساجد کو پیادہ بریگیڈ میں شامل کیا گیا ... جس کے ساتھ چند ایک ٹینک تھے۔ ہندوستان کے ... پاس چھ سو ٹینک تھے جبکہ پاکستان کے پاس صرف ... ڈیڑھ سو۔ بھارتی فوج کے مقابلے میں ہماری فوج ... طاقت چار گنا کم تھی، اسلحہ میں بھی ہم ان سے کئی ... پیچھے تھے اس لیے ہماری فوج کی ذمہ داری بڑھ گ... تھی۔ ساجد بھی اُن سپاہیوں میں شامل تھا جنہوں ... کے ٹینکوں کی یلغار کو روکنا تھا۔ جنگ کے ... میں صرف فوج ہی نہیں بلکہ پاکستان کے ... شانہ بشانہ تھے۔ وہ بھی اپنا فرض ادا کر رہے ... ٹے چھوٹے بچے ہاتھوں میں صندوقچیاں ... ی پیسے میں ٹینک۔'' کہتے ہوئے بھوک و ... سے بے خبر چندہ جمع کر رہے تھے۔ ... اسکولوں، بازاروں اور گھروں میں چندہ جمع ... کی مہم زوروں پر تھی۔ ہر کوئی اس کارِ ثواب ... چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ اسپتالوں میں خون ... والوں کی قطاریں تھیں۔ ایسے حالات اور ... نے فوج کا حوصلہ اور بڑھا دیا تھا۔ ساجد بھی ... دیگر ساتھیوں کے ساتھ اپنے فرائض کی ... میں سرگرمِ عمل تھا اور اس کی بس ایک ہی ... تھی۔ ''میں شہید ہو کر زندہ ہو جاؤں۔'' وہ اپنی ... خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔

... کمانڈنگ آفیسر نے ۷ ستمبر کو مورچوں کا دورہ ... اس نے دیکھا کہ مورچے کھدے ہوئے ہیں ... بھارتی ٹینکوں کے حملے کو ناکام بنانے کے لیے ... جوانوں کا جوش اور جذبہ قابلِ دید تھا۔ جوانوں کو ذرا ... تشویش نہ تھی کہ ان کے سامنے ٹینک آ رہے ... پاک فوج کے جوانوں کو حکم تھا کہ جب دشمن ... ٹینک آ ئیں تو انہیں تباہ کر دیا جائے، کیسے، یہ ... عملی طے پا گئی تھی کہ فوجی جوان اپنے جسم کے ... بم باندھ کر دشمن کے ٹینک سے ٹکرا کر نہ صرف ... آپ کو بلکہ دشمن کے ٹینک کو بھی اڑا دیں گے۔ ... کی پیش قدمی روکنے کا کوئی اور چارہ بھی نہ ... ساجد بھی اِن ہی نوجوانوں میں شامل تھا۔ ... کی تمنا اُسے پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اُس ... خون جوش مار رہا تھا۔ میدانِ جنگ میں ہر طرف ... برس رہی تھی مگر وہ بے خوف و خطر بم باندھے ... رہا تھا۔ ماں کے الفاظ اُس کے دماغ میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ گولیوں کی، بندوق کی، دھاکوں کی آوازیں اُس کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور اُس کے جذبۂ شہادت کو جلا بخش رہی تھیں۔ وہ جذبۂ شہادت کے نشے میں مخمور تھا پھر اشارہ ملتے ہی جوان نعرۂ تکبیر اور یا علیؑ کے نعرے لگاتے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن ٹینک چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ساجد نے دشمن کا ایک ٹینک تباہ کر دیا تھا۔ اسے مشن ہی یہی سونپا گیا تھا۔ اُس کا جسم دور جا گرا تھا۔ ابھی اُس میں کچھ سانسیں باقی تھیں۔ اُس کا جسم لہولہان تھا۔ اُس نے ایک لمحہ کو اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے جسم کو خون میں لت پت دیکھا تو اُس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم بکھر گیا۔ اُس نے خون سے لتھڑے ہاتھ کو اپنے تشنہ ہونٹوں سے لگایا تو وہ بے اختیار مسکرا اٹھا جیسے آج وہ زندہ ہو رہا ہو۔ اُس نے ہونٹوں کو ذرا سی جنبش دی۔ ''ماں......! میں نے...... تت...... تیرا...... کہا...... پپ...... پورا...... کر دیا ہے۔ آج میں......زندہ......ہو......رہا......ہوں۔'' اُس کے لبوں پر سرخی اور گہری ہو گئی اور اُس نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں اور......اور اُس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر سکون سا پھیل گیا تھا کیونکہ اُس نے ماں کی خواہش پوری کر دی تھی۔

شرط

سجاد گل صاحب نے ایک دن موڈ میں آ کر کہا۔

''میری بیوی اتنی پڑھی لکھی ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر گھنٹہ بھر بات چیت کر سکتی ہے۔''

جواب میں اقبال میمن نے کہا۔

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ یہی کام ان پڑھ عورت بھی کر لیتی ہے اور اس کے لیے موضوع کی شرط بھی نہیں ہوتی۔''

اقراء۔ کراچی

فارحہ

گر حوصلے جواں رہیں

نور جہاں نوری کا خیال

بگاڑ سکتی نہیں کچھ بھی آندھیاں میرا
انہیں خبر نہیں طوفاں نے مجھ کو پالا ہے

زیست کے نشیب و فراز سے گزرنے والی ایک باحوصلہ عورت کا فسانہ

وہ آفس میں میرا پہلا دن تھا اور پہلے ہی دن میں اپنی میڈم سے بہت زیادہ متاثر ہو گئی تھی۔ ان کا نام تو مہر النساء تھا' تاہم سب انہیں مہر میڈم کہتے تھے۔ ان کا چہرہ ہر وقت ایک خاص قسم کے نور سے منور رہتا تھا' ساتھ ہی ان کے بات کرنے کا انداز بھی نہایت دلنشین اور شفقت آمیز تھا۔ جب انہوں نے مجھ سے انٹرویو لیا تھا تو مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے خاندان کے کسی بڑے بزرگ سے بات کر رہی ہوں۔ انٹرویو میں انہوں نے انتہائی شفقت کا برتاؤ کیا تھا۔ مجھے اُن سے بات کرتے ہوئے کسی قسم خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ مزا آ رہا تھا۔ میں زندگی میں بہت کم لوگوں کے چہروں پر ایسا نور دیکھا ہے جو مہر میڈم کے چہرے پر تھا۔ میں اکثر سوچتی کہ شاید ان کی زندگی میں کبھی کوئی دکھ نہیں ہوگا کیونکہ وہ ہمیشہ بہت پرسکون رہتی تھیں۔ ایک دن باتوں باتوں میں یونہی میں نے اُن سے اب اور مچلنے والا یہ سوال پوچھ ہی لیا تھا۔



"مہر آنٹی......! کیا آپ کی زندگی میں کبھی دکھ پریشانی نہیں آئی؟ میں نے آپ کو کبھی پریشان نہیں دیکھا؟"

میرے سوال پر انہوں نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولیں۔ "دکھ اور پریشانی ہر انسان کی زندگی میں لازمی ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا بندہ نہیں جسے دکھ اور پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ میری زندگی بھی ان کے بغیر نہیں گزری ہے۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں پھر ذرا توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئیں۔

"میں اپنے ماں باپ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ چونکہ میں سب سے چھوٹی تھی اس لیے گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ ان دنوں میں انٹر کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ میرے لیے ایک مناسب رشتہ آ گیا اور والدین نے میری شادی کر دی۔ اس وقت میں انیس سال کی تھی۔ میرے شوہر اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ وہ فوج میں تھے اور سال میں دو بار چھٹیوں پر آتے تھے نہ صرف شوہر میرا بہت خیال رکھتے تھے بلکہ ساس سسر بھی محبت کرنے والے تھے۔ مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ اپنا گھر چھوڑ کر میں کسی اور گھر میں آ گئی ہوں۔ سب ہی پیار کرنے والے تھے۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا کہ اتنا اچھا سسرال ملا تھا۔ زندگی اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہی تھی۔ اسی اثناء میں میرے ہاں دو بچوں کی پیدائش بھی ہو گئی۔ ابھی گھر میں بچوں کی کلکاریاں گونج رہی تھیں کہ ایک روز اچانک میری ساس چل بسیں۔ ماں کے انتقال پر رضوان بھی دو دن کی چھٹی پر آئے تھے۔ وہ جاتے جاتے مجھے تلقین کر گئے تھے کہ ابا کا خاص خیال رکھنا۔ ان کی ہدایت کے بموجب میں بہت کوشش کرتی تھی کہ ابا کا ہر طرح خیال رکھوں۔ اب میری ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ مجھے اپنے دو چھوٹے بچوں کو بھی دیکھنا ہوتا تھا۔ گھر کا سودا سلف لانا ہوتا اور ابا کی بھی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ کبھی کبھی میں بہت تھک جاتی تھی۔ اس طرح شادی کے 6 سال کیسے گزر گئے' پتہ ہی نہیں چلا۔

ایک دن اچانک رضوان کی شہادت کی خبر ملی۔ یہ صدمہ میرے لیے ایسا ہی تھا کہ میری تو دنیا ہی لٹ گئی تھی لیکن صبر تو کرنا تھا' اس وقت میری عمر محض پچیس برس تھی۔ میرے والدین چاہتے تھے کہ میں دوسری شادی کر لوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں اپنی اولاد پر کسی اور کا سایہ پڑنے دینا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ سوتیلا باپ کبھی بھی میری اولاد کو وہ پیار اور محبت نہیں دے سکے گا جو سگا دیتا ہے۔ میرے سسر نے اپنا گھر میرے نام کر دیا تھا۔ میں کبھی والدین کے گھر اور کبھی اپنے گھر میں رہتی تھی۔

گھر میں کمانے والا نہیں رہا تھا تو کھانے پینے کا بھی مسئلہ ہو گیا تھا کیونکہ گھر کا سارا خرچہ رضوان کی کمائی سے چلتا تھا۔ اس صورتِ حال میں مجھے اپنے دونوں بچوں کا مستقبل تباہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے وہ وقت بھی گزارا جب گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تھا' تب میں نے کچھ کام کرنے کا سوچا۔ اس سلسلے میں میرے بھائی نے میری بہت مدد کی۔ میں نے گھر میں رہتے ہوئے مرغیوں کی دوائی بنانی شروع کر دی۔ مجھے اس کا تجربہ تھا اور ہمارے گھر میں مرغیاں تھیں جس کی وجہ سے ابا مرغیوں کی دوائی لے کر آتے تھے' اس کا نام 'لاسوٹا' تھا۔ مجھے یہ بنانی آ گئی تھی اور یہ آسان بھی تھی۔ میں نے یہ دوائی گھر میں بنانی شروع کر دی اور پھر قریب ہی کے ایک پولٹری فارم میں فروخت کرنے کے لیے لے گئی۔ اللہ نے مجھے اس کام میں اتنی برکت دی کہ میرا کاروبار روز بہ روز بڑھتا چلا گیا۔ کام کے ساتھ ساتھ میں نے اپنا

رکا ہوا تعلیمی سلسلہ بھی دوبارہ شروع کر دیا تھا چنانچہ اسی دوران میں نے بی اے بھی کرلیا۔ گریجویشن کرتے ہی ابا نے کوشش کر کے مجھے سرکاری نوکری دلا دی۔ وہ لائبریرین کی جاب تھی۔ میں نے اپنا کام انتہائی محنت اور ذمہ داری سے کیا اور ترقی کر کے یہاں تک پہنچی ہوں۔ ان ہی دنوں جب میں نے نئی نئی نوکری جوائن کی تھی' میرے والدین اس دنیا سے رخصت ہو گئے پھر اس کے فوراً بعد میرے سسر بھی ایک دن فالج کا شکار ہو گئے۔ اب وہ اپنے ہر کام کے لیے پوری طرح میرے محتاج ہو گئے تھے۔ وہ دن میرے لے بہت تکلیف دہ تھے۔ میں نے ایک کُل وقتی ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ بچے اس وقت تک بڑی کلاسز تک پہنچ گئے تھے۔ بیٹی میٹرک میں تھی اور بیٹا انٹر میں تھا۔ میرے سسر بیماری کی وجہ سے چڑچڑے ہو گئے تھے' وہ میرے علاوہ کسی اور کے ہاتھ سے کھانا نہیں کھاتے تھے۔ انہیں میری بہت عادت ہو گئی تھی۔ انسان جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ پھر سے ''بچہ'' بن جاتا ہے' اسی طرح میرے سسر بھی بالکل ''بچہ'' ہو گئے تھے لیکن وہ مجھے بہت دُعائیں دیا کرتے تھے۔ اب وہ اِس دنیا میں نہیں ہیں' ابھی دو سال پہلے ہی اُن کا انتقال ہوا ہے اور آج میرے بیٹے اور بیٹی دونوں باہر رہتے ہیں۔ بیٹا وہیں ڈاکٹر ہے اور بیٹی بیاہ کر امریکہ چلی گئی۔ اس کی ایک بیٹی ہے۔ میرے اللہ نے جتنی مجھے مشکلات دیں' اس سے زیادہ آسانیاں بھی دیں۔'' اپنی کہانی سنا کر وہ خاموش ہو گئی تھیں اور میں حیرت سے اُن کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اُن کے چہرے پر دنیا بھر کا سکون تھا۔

''لیکن مہر آنٹی ......! آپ کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ آپ نے اتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں؟''

''بیٹا......! ابھی تم چھوٹی ہو' جب بڑی ہو گی تو وقت کے ساتھ بہت کچھ سیکھ جاؤ گی اور میں اکیلی تو نہ تھی۔ میرا اللہ ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ اسی یقین کا انعام ہے کہ آج میں بہت مطمئن ہوں۔ میری اولاد بھی فرمانبردار ہے ورنہ تو آج کل کے بچے اپنے بوڑھے والدین کو کچھ سمجھتے ہی نہیں نہ ان کی عزت کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ واقعی بوڑھے والدین کے لیے فرمانبردار اولاد اللہ کی طرف سے بہت بڑا انعام ہوتی ہے۔

مجھے جاب کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے اور اس عرصے میں مہر آنٹی نے اپنے بیٹے کی بھی شادی کر دی تھی۔ ان کی بہو بھی بہت اچھی تھی۔ وہ بھی اپنی ساس کی بہت خدمت کرتی تھی۔ مہر آنٹی ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتی رہتی تھیں پھر وہ اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ امریکہ چلی گئی تھیں۔ اب انہیں وہاں پانچ سال ہو گئے ہیں۔ اس دوران انہوں نے حج اور عمرے کی سعادت بھی حاصل کر لی ہے۔

ہر انسان کی زندگی میں برا وقت آتا ہے لیکن یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اسے کیسے گزارتا ہے۔ مہر آنٹی نے اپنی زندگی میں بہت سی مشکلات دیکھیں لیکن انہوں نے ہمت و حوصلے کے ساتھ بہت جدوجہد کی تبھی آج وہ پُرسکون زندگی گزار رہی ہیں اور ہاں' انہیں ''سچی کہانیاں'' پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ آفس میں یہ ڈائجسٹ منگواتی تھیں تو میں بھی ان سے لے کر پڑھتی تھی۔ جب وہ امریکہ وغیرہ جاتیں تو تاکید کر کے جاتی تھیں کہ اس مہینے کا ''سچی کہانیاں'' ضرور لے کر رکھنا۔ اس طرح سے مجھے بھی ''سچی کہانیاں'' پڑھنے کا شوق ہوا۔ اپنی کہانی اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ میں پڑھ کر وہ یقیناً بہت خوش ہوں گی۔ میری دُعا ہے کہ مہر آنٹی جہاں بھی رہیں' خوش رہیں۔ (آمین!)

محمد اسلم آزاد

ہوس کے غلام

شیریں گلِ رعنا کا خیال

نہ ظالموں کی کمی ہے نہ صابروں کی کمی
کہانی ختم ہوئی، خوں بنا ہے میرا قلم

ہوس کے پجاریوں کے ہاتھوں برباد ہونے والی ایک عورت کی پُرالم کہانی

گزشتہ دنوں سفر کے دوران ایک ایڈووکیٹ میرے شریکِ سفر بنے جنہوں نے مجھے اپنی زندگی کا ایک دلچسپ اور عجیب و غریب واقعہ سنایا جو انہی کی زبانی قارئین کی نذر ہے۔

''یوں تو میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ہمہ اقسام کیس لڑے ہیں مگر ایک ایسا عجیب و غریب کیس بھی لڑا کہ آج تک میں حیران و پریشان ہوں...... اور آپ بھی یہ جان کر حیران و پریشان ہوں گے کہ بھلا سہرا بھی کبھی پھانسی کا پھندا بنا ہے؟ جی ہاں' یہ سچ ہے اور اس حوالے سے کہانی کچھ یوں ہے کہ چند برس پہلے ایک دن دو نوجوان میرے آفس میں آئے تھے جو حلیے سے ہی اَن پڑھ اور



آوارہ لگ رہے تھے۔ ان کے قد لمبے' بے ترتیب گھنی داڑھیاں اور لمبی لمبی مونچھیں تھیں' سر پر بھاری بھرکم پگڑیاں رکھی ہوئی تھیں' ان میں سے ایک جوان اپنی مونچھوں کو بار بار تاؤ دے رہا تھا۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"جناب وکیل صاحب! مجھے ایک چھوکری (لڑکی) سے ماجبت (محبت) ہوگئی ہے اور وہ چھوکری بھی ہم سے شادی کرنے کو تیار ہے۔ آپ ہمارا کچھ مدد کریں۔"

میں ان کی بات سن کر بولا۔ "جناب' میں بھلا آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟ اگر لڑکی راضی ہے تو اس میں مسئلہ کیا ہے؟ لڑکا' لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟"

وہ میری بات سن کر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "جناب' بات دراصل یہ ہے کہ وہ لڑکی دارالامان میں ہے اور شادی شدہ بھی ہے مگر اب اس کو ہم سے ماجبت (محبت) ہوگئی ہے اور اپنے میاں سے طلاق لے کر ہم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

میں اس کا حلیہ اور اندازِ گفتگو دیکھ کر دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ وہ کون سی بدنصیب لڑکی ہے جسے ایسے شخص سے محبت ہوگئی ہے؟ وہ میری خاموشی کو دیکھ کر بولا۔

"جناب' کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟"

"کیا واقعی وہ لڑکی تم سے شادی کرنا چاہتی ہے؟"

وہ میرے اس سوال پر اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "اللہ کی قسم' وہ میری دلیری بہادری دیکھ کر مجھ پر فدا ہوگئی ہے۔ آپ بس میرا مسئلہ حل کرنے کی ترکیب بتائیں؟"

میں اس وقت اپنی فیس سے زیادہ اس نادان لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاید اس لیے میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا کہ "جناب' فیس کو ڈالو بھاڑ میں' مجھے فوراً اس لڑکی سے ملاؤ۔ میں اس کا یہ بیانِ حلفی عدالت میں پیش کروں گا کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر تم سے شادی کرنا چاہتی ہے پھر اگلی پیشی میں اسے جج کے سامنے اس بات کا اقرار کرنا ہوگا جس کے بعد جج صاحب اس لڑکی کے شوہر کو ایک سمن (summon) بھیجیں گے اور پھر تیسری یا چوتھی پیشی میں تمہارا کام ہوجائے گا اور تم اس لڑکی کے دولہا میاں بن جاؤ گے۔"

میری زبانی یہ تمام احوال سن کر اس شخص کا چہرہ خوشی سے کھل گیا اور وہ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا کہ...... "یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر اس لڑکی سے میری شادی ہوگئی تو میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا اور ایک کپڑوں کا نیا جوڑا بھی دوں گا تاکہ تم وہ نیا جوڑا پہن کر میری شادی میں آنا۔"

"اچھا' اب آپ دونوں کل میرے پاس آنا' میں آپ کے ساتھ دارالامان چل کر اس لڑکی سے بیان لوں گا۔" یہ سن کر ہزار روپے کے پانچ نوٹ میرے آگے رکھنے کے بعد وہ دونوں چلے گئے تھے۔

اگلے دن وہ دونوں وقتِ مقررہ سے پہلے ہی آ گئے تھے اور پھر ہم تینوں دارالامان چلے گئے تھے جہاں میں اس نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ لڑکی خاصی پڑھی لکھی اور سمجھدار نظر آرہی تھی۔ میں حیران تھا کہ آخر وہ ان کے جھانسے میں کیسے آ گئی جبکہ وہ لڑکی کسی شہری علاقے کی اور نوجوان گاؤں' دیہات کے دکھائی دے رہے تھے؟ بہرحال کچھ حال احوال کے بعد اس لڑکی نے یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس اَن پڑھ' آوارہ قسم کے نوجوان سے شادی کرنا چاہتی ہے' اس لیے میں عدالت میں اس کی طرف سے درخواست دائر کروں۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ ان دونوں کا لڑکی سے رابطہ کیسے ہوا اور شادی تک بات

کیسے پہنچی؟ یہ سوال میں نے عدالت سے واپس آکر اپنے آفس میں ان دونوں سے پوچھا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ جب شادی ہوجائے گی تو پھر ہم تمہیں ساری بات بتائیں گے کہ اس کے ساتھ ہمارا رابطہ کیسے ہوا؟

اگلے دن میں نے کورٹ میں اس لڑکی کی درخواست جمع کرادی تھی۔ پیشی کی تاریخ پندرہ روز بعد کی مقرر ہوئی تھی جس میں اس لڑکی کو بھی بلایا گیا تھا تاکہ وہ عدالت کے روبرو اپنا بیان دے۔

عدالت میں پیشی سے ایک دن پہلے وہ دونوں نوجوان میرے آفس میں آئے تھے اور کیس کے بارے میں کچھ تفصیلات لی تھیں اور پھر اگلے دن ہم عدالت میں موجود تھے۔

ہمارے کیس کی باری آنے پر جج صاحب نے میری جانب سے دائر کردہ درخواست کا مطالعہ کرنے کے بعد اس لڑکی کو مخاطب کیا تھا۔ "کیا آپ واقعی اپنے شوہر سے طلاق لے کر اس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہیں جس نے عدالت میں اس بارے میں درخواست دی ہے؟"

جج صاحب کی یہ بات سن کر اچانک ہی اس لڑکی کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہوگیا تھا اور آنکھیں آگ برسانے لگی تھیں اور وہ اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر جج صاحب کی طرف پھیلاتے ہوئے بولی تھی۔

"خدارا...... جج صاحب......! میری فریاد سنیں اور ان دونوں کو سزائے موت دیں...... اور یہ شخص جو مجھ سے شادی کرنے آیا ہے' یہ میری عزت کا قاتل ہی نہیں ہے' ڈاکو بھی ہے' اس نے ڈاکہ زنی کے دوران بہت سے لوگوں کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا ہے' لوگوں کی عزت سے' ان کی جان و مال سے کھیلا ہے۔ یہ ایک ایسا مجرم ہے کہ جس نے مجھے اور میری چار سالہ بیٹی کو میرے گھر سے اغوا کیا تھا اور اپنے کسی

غزل

ملنے کا یہ زینہ ہے اب رات گئے
یادوں کے سنگ جینا ہے اب رات گئے

خوش رہتا ہوں' دنیا کو دکھلانا تھا
زہر غموں کا پینا ہے اب رات گئے

اپنوں نے جو زخم دیئے تھے سارا دن
چپکے چپکے سینا ہے اب رات گئے

وصل کی صبحیں ختم ہوئے تو عرصہ گزرا
ہجر کا نام شبینہ ہے اب رات گئے

عمر کا پہلا حصہ گزرا ساحل پر
بیچ بھنور سفینہ ہے اب رات گئے

کیسے کیسے زیور پہنے تو نے ندیم
اُس کی یاد نگینہ ہے اب رات گئے

شفیق احمد ندیم

قیدی ادیب

امریکا کا مشہور کہانی کار ولیم سنڈنی پورٹر (1862-1960ء) جس کا قلمی نام او ہنری تھا۔ کچھ رقم غبن کرنے کے الزام میں تین سال کی قید بھگت رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ قید کے یہ تین سال کیوں کر گزارے۔ آخر ایک ترکیب سوجھی' اس نے افسانے لکھنے شروع کر دیئے۔ جب وہ جیل سے رہا ہوا تو وہ تین سو افسانے لکھ کر اور چھپوا کر ملک گیر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس کے افسانوں کی خاص بات یہ تھی کہ ہر افسانے کا انجام چونکا دینے والا ہوتا تھا۔

فیصل دین پوری۔ خان پور کٹورا

نامعلوم جگہ بے ٹھکانے پر لے گیا تھا' وہاں اس نے مجھے چھ ماہ تک قید رکھا تھا اور میری عزت سے کھلتا رہا تھا اور پھر ایک دن اچانک اس کا موبائل میرے ہاتھ لگ گیا تھا جس پر میں نے اپنے میاں کو اپنے بارے میں اطلاع دی تھی اور اس کا موبائل نمبر بھی یاد کر لیا تھا۔ تقریباً ایک ہفتے بعد اس کے اڈے پر پولیس کا چھاپہ پڑا تو اس کے کچھ ساتھی تو گرفتار ہوئے تھے مگر یہ فرار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میری بیٹی تو اپنے باپ کے پاس چلی گئی تھی مگر میں اپنے شوہر کے قابل نہ رہی تھی' اس لیے میں نے دارالامان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا...... اس دوران مجھے اس کا وہ موبائل نمبر یاد تھا...... میں نے اس سے رابطہ کیا تھا تو اس نے مجھے فوراً پہچان لیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ ''تم تو اس وقت زندگی کے مزے لوٹ رہے ہو مگر میں تمہاری محبت میں گھٹ گھٹ کر جی رہی ہوں۔'' میری یہ بات سن کر اس نے حیرانگی سے پوچھا کہ وہ کس طرح؟ تو میں نے اسے کہا کہ ''میں تمہاری محبت' بہادری اور دلیری پر فدا ہو گئی ہوں اور اب اپنے شوہر کے ساتھ مزید زندگی نہیں گزار سکتی...... اسی لیے اسے چھوڑ کر دارالامان میں رہ رہی ہوں اور تم ہو کہ مجھے بھول گئے ہو؟'' اس کے بعد یہ ہر روز مجھ سے گھنٹوں موبائل پر باتیں کرتا تھا اور میں اس سے اپنی شدید محبت کا اظہار کر کے کہتی تھی کہ تم مجھے اپنا جیون ساتھی بنا لو' میں تمہاری زندگی کے ہر گام' ہر معاملے میں تمہارا ساتھ دوں گی...... اور پھر کئی ماہ کے بعد اس کو یقین ہو گیا کہ میں واقعی اس کی محبت میں گرفتار ہوں اور اس کی خاطر شوہر کو چھوڑ کر دارالامان میں رہ رہی ہوں تو پھر ایک دن یہ مجھ سے وہاں ملنے آیا تھا۔ میں نے اس کو کہا تھا کہ تم عدالت کے ذریعے مجھے یہاں سے لے جا سکتے ہو' اس مقصد کے لیے کسی اچھے سے وکیل سے مل لو تو اگلے دن یہ وکیل صاحب کے ساتھ دارالامان آیا تھا اور میرا بیان اور یہ درخواست لی تھی۔

''جج صاحب......! اب آپ ہی بتائیں کہ کیا میں اتنی بے وقوف اور پاگل ہوں جو اپنی عزت کے قاتل' گھر کی تباہی کے ذمے دار ڈاکو' قاتل سے شادی کروں گی؟ دراصل مجھے اس سے اپنی عزت کا بدلہ لینا تھا اور میں اسے اب عدالت کے کٹہرے تک لے آئی ہوں۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ اسے سزائے موت دیں یا رہائی؟'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ اس لڑکی کی المناک داستان سن کر تو عدالت میں موجود تمام لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور پھر جب وہ دونوں مجرم فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے تو عدالت کے حکم پر انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

وہ جو شادی کا سہرا پہننے کی تمنا لے کر آیا تھا' اسے کچھ عرصے بعد سزائے موت ملی تھی...... جبکہ اس کے ساتھی کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔ یوں سہرا پھانسی کا پھندا بنا تھا......



جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

نعیم حبیب

دعا کے ہاتھ نہیں رہے

حامد علی سید کا خیال

کڑی ہے دھوپ بے سایہ شجر ہے
ہمیں درپیش یہ کیسا سفر ہے

معروف فلمی صحافی اور مدیر نعیم حبیب کی اپنی مرحوم ماں کی دلگداز یادیں



۲۰ ستمبر ۲۰۱۱ء کی تاریخ اور منگل کی صبح میں نے اپنی پیاری ماں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ دُعا کے ہاتھ نہیں رہے۔ یہ خوف اب ساری زندگی مجھ پر طاری رہے گا اور جانے کتنا وقت لگے ان کے جانے کی حقیقت تسلیم کرنے میں؟ موت اٹل ہے، شاید اس سے بڑی کوئی سچائی نہ ہو۔ انسان دنیا میں آتا ہے تو حرارت، حرکت اور (رونے کی) آواز کے ساتھ مگر جاتا ہے تو ایک جسم ستواں اور بے حرکت پڑا ہوتا ہے۔ آئے تو آواز اور حرکت ساتھ تھی اور جاتے وقت تو ان کی رفاقت بھی نصیب نہیں ہوتی۔ خالی ہاتھ جانے کی بات بہت سنی، غور بھی کئی بار کیا مگر اتنی اچھی طرح یہ بات پہلے کبھی سمجھ نہ آئی تھی۔ ماں کو یوں اچانک بستر پر بے سدھ پڑے دیکھا تو حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ بیمار بالکل نہ تھیں، رات کو موت کے موضوع پر مکالمہ کیا تھا، ان کی ایک رشتے دار (جو عمر میں اُن سے چھوٹی تھیں۔) پچھلی صبح ہی انتقال کر گئی تھیں، انہیں کینسر تھا۔ ماں نے کہا۔

''اُن کی قبر کی ایک رات گزر گئی، سوال، جواب کا سلسلہ ہو گیا ہو گا۔'' اور پھر کہنے لگیں۔ ''اولاد ہو یا کوئی اور، سب مُردے کو قبر میں ڈال کر جلد از جلد لوٹ جاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ماں......! ہمارا طریقہ یہی ہے، کوئی قبر سے لپٹ کر نہیں بیٹھ سکتا اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔''

پھر ماں نے کہا۔ ''زندگی کیا ہے؟ جو کچھ اتنے برسوں میں پایا، لگتا ہے، کچھ نہیں۔ رب کے پاس جانا ہے۔ وہاں چکی سے پکی عمر تک جمع کیا مال کام نہیں آئے گا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''بے شک۔''

اور پھر ماں کو ساحر کی نظم کا مصرعہ سنایا۔

یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟
بڑے بڑے شاہوں سے خالی ہاتھ پیر والے گدا تک
سب خاک نشیں ہوئے اور
دنیا کا مال ان کے ساتھ نہ گیا۔

یہ رات کی بات اور صبح ماں دنیا میں نہ تھیں۔ انہیں ناشتے کے لیے اٹھایا جا رہا تھا مگر کوئی آواز اُن تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ جب ڈاکٹر نے تصدیق کی اور بتایا کہ صبح نو سے دس بجے کے بیچ سانسوں سے اُن کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے تو میرا ضبط بھی ٹوٹ گیا۔ خدا سے کوئی شکوہ نہیں، موت برحق اور رَب کی مرضی سے دن اور وقت اسی کا مقرر کردہ مگر مٹی کے اس پتلے میں محبت کا جذبہ بھی تو اسی نے ڈالا ہے۔ ہم رشتوں کی قدر کرنے والے لوگ ہیں، اپنی مصروف اور دوڑتی بھاگتی زندگی میں ماں کے لیے کبھی تنگیِ وقت کا رونا نہ رویا اور جب انہوں نے پکارا تو ان کے پاس چلے آئے۔ ان کے دور چلے جانے کا دکھ آنکھ نم کر گیا پھر کانوں میں آواز آئی کہ یہ تو بہت اچھی موت ہے، سوئے اور پھر نہ اٹھے ورنہ ایمبولینس منگواؤ، ڈاکٹر کو بلاؤ، فلاں دوائی نہیں مل رہی، یہ والا انجکشن ہر حال میں چاہیے۔ ہاں، موت برحق ہے اور یہ بہت اچھی موت ہے۔ میرے دل نے کہا اور پھر زبان سے دُعا ادا ہوئی کہ پاک پروردگار! میرا جسم بھی روح سے یونہی آزاد کرنا۔ مجھے بھی سوتے سے اٹھنا نصیب نہ ہو۔ کوئی اور طریقہ مجھے اپنے پاس بلانے کے لیے مقرر نہ کرنا۔ بس ماں کی طرح ہی میں آپ کے پاس آنا چاہوں گا۔ اُن کا بیٹا ہوں اس لیے آپ رَب میری بات ضرور مانیں گے بلکہ ماں باپ کو چاہنے والے اِس عظیم رشتے کا احترام کرنے والے ہر انسان کو یونہی اپنے پاس بلانا۔ ماں کہا کرتی تھیں کہ مال کی محبت کم کرنے سے سکون ملتا ہے اسی لیے انہوں نے اپنے پاس کچھ نہ رکھا تھا۔ کئی سال پہلے ہی تن کے کپڑوں اور ضرورت کے سامان کے سوا سب بانٹ دیا تھا۔ ہم جو کچھ دیتے، وہ اگلے دن ہی کسی اور کی نذر ہو جاتا تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں۔

''اس طرح ہلکی پھلکی رہتی ہوں اور پھر خدا نے اتنی اچھی اولاد جو دی ہے تو پھر کوئی اور چیز اپنے قبضے میں کیوں رکھوں؟''

وہ سچ کہتی تھیں، انہوں نے ہم سب بہن بھائیوں کے دل قبضے میں کر رکھے تھے اور اس کے سوا اُن کے قبضے میں کچھ نہ تھا۔ وہ کہتی تھیں۔

''زندگی کا سب سے خوبصورت بہلاوا اپنے جیسے انسانوں سے ملنا ملانا اور اُن سے پیار کرنا ہے۔ ہنس بول کر وقت گزر جائے تو نعمت ہے ورنہ کون سی چیز قبر میں ساتھ جانے والی ہے؟''

آخری سالوں میں ماں عید بقر عید پر رشتے داروں سے خصوصاً اور دیگر احباب سے عموماً ملنے جلنے کو کہتی تھیں۔ اُن کا کہنا تھا۔

''کسی کا انتظار مت کرو، کوئی تمہارے پاس آئے نہ آئے، تم اُس کے پاس پہنچ جاؤ۔''

اور واقعی جب جب ایسا کیا تو من کو بہت خوشی ملی۔

ماں تین سال سے وہیل چیئر پر تھیں، بیماری کوئی نہ تھی، بس خود ہی چلنا پھرنا ترک کر دیا تھا اس لیے کہیں آنے جانے میں دقت محسوس کرتی تھیں۔ اس کے باوجود حالیہ عید الفطر پر اپنے اُن رشتے داروں کے گھر گئیں جو لمبے عرصے سے رابطے میں نہ تھے۔ اُن سے مل کر ماں نے اپنی عید کی خوشیاں دوبالا کیں اور پھر ہمیں سمجھایا کہ زندگی کا حسن اسی میں ہے کہ خوشیاں اپنوں میں تلاش کی جائیں۔ واقعی آج کل کے دور میں ہم انسان جلدی جلدی ناراض ہو جاتے ہیں، کوئی چھوٹی سی بات ہو جائے اور ہم برسوں کے یارانے چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ عید جیسے تہوار پر بھی اُن اپنوں کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے ساتھ کبھی خوب راہ و رسم رکھتے تھے اور جن سے اب کوئی ناراضی ہو گئی ہے۔ چھوٹی سی بات اتنی بڑی ہو جاتی ہے کہ جیتے جی نہ ملنے کی قسم کھا لیتے ہیں۔ ذرا غور کریں تو ساری خوشیاں اس میل ملاپ میں ہیں جس سے آپ کوئی مادی یا کاروباری فائدہ نہ چاہتے ہوں۔ وہ رشتے جو دوستی اور خلوص میں گندھے ہوں جو خون کے رشتے ہوں اور جو آپ کے اپنے ہوں۔ دولت کے لاکھ انبار لگا لیں، یہ آپ کو کب تک بہلا سکتی ہے؟ دنیا گھوم کے آ جائیں، جدید مشینیں خرید لیں، کمپیوٹر، موبائل فون اور Led ٹی وی تک لے آئیں مگر یہ مشینیں کبھی نہ کبھی آپ کو بور کر دیں گی اور آپ ان سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگیں گے۔ وجہ ان کی حد بندی ہے، یہ انسان کی طرح تغیر نہیں رکھتیں، ان میں اتنی ورائٹی نہیں جو انسان کو سدا بہلا سکیں۔ انسان کو صرف اس جیسا انسان ہی مطمئن کر سکتا ہے اور ایسا انسان کسی سچے اور اچھے رشتے میں آپ سے بندھا ہو گا۔ یہ رشتہ رَب کے قانون کے تحت ہی ہے۔

ماں اور باپ سے آپ پیدا ہوتے ہیں اور آپ کے بھائی بہن، ماں کی کوکھ میں آگے پیچھے شریک ہوتے ہیں۔ یہ تصور ہی کتنا خوش کن ہے کہ آپ ایک خون ہیں اور ایسے میں اگر کوئی بات آپ کو جدا کرتی ہو تو کیوں نا اس بات کو ہی اپنے بیچ سے جدا کر دیا جائے۔ خوش قسمتی سے ہم ایک جدید دور میں جی رہے ہیں۔ ناراض رشتوں کو منانے میں پہل کی ہمت نہیں۔ عید بقر عید پر ملاقات کا اہتمام نہیں کر سکتے، فون کال سے بھی خوف محسوس ہوتا ہے تو کیوں نا مبارک باد کے ایک سادہ سے sms کا سہارا لے لیا جائے۔ آپ کی یہ چھوٹی سی کوشش، آپ کو تو خوش کر ہی جائے گی مگر ساتھ ہی دوسری طرف بھی عید بارات اتر آئے گی اور دوسروں کو خوشی دینے والے کے لیے میرے رَب نے کتنا بڑا درجہ رکھا ہے، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں نا؟

آپ سب سے درخواست ہے کہ ماں کی مغفرت اور اُن کے درجات بلند ہونے کی دُعا مانگیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ مجھے اور سبھی متعلقین کو پاک رَب صبرِ جمیل عطا کرے۔ (آمین!)



بینا عالیہ

خواہشوں کا جنگل

گلنار آفرین کا خیال

کچھ خاص دلوں کے لیے ہوتی ہے یہ دولت
سب کے لیے احساس کی دولت نہیں ہوتی

ایک نادان عورت کا احوال جو آرزوؤں کے بھنور میں پھنس گئی تھی

اس نے کولڈ ڈرنک کا گلاس میرے ہاتھ میں تھمایا۔ میں بغور اس کے سفید دودھیا اور اپنے سانولے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ اس کی زندگی سے بھرپور آنکھیں جن کی چمک کبھی ماند نہیں پڑی تھی، آج ان میں زندگی سے بے زاری و تھکن کا عکس نمایاں تھا۔ میں اپنے سامنے بیٹھی النساء کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

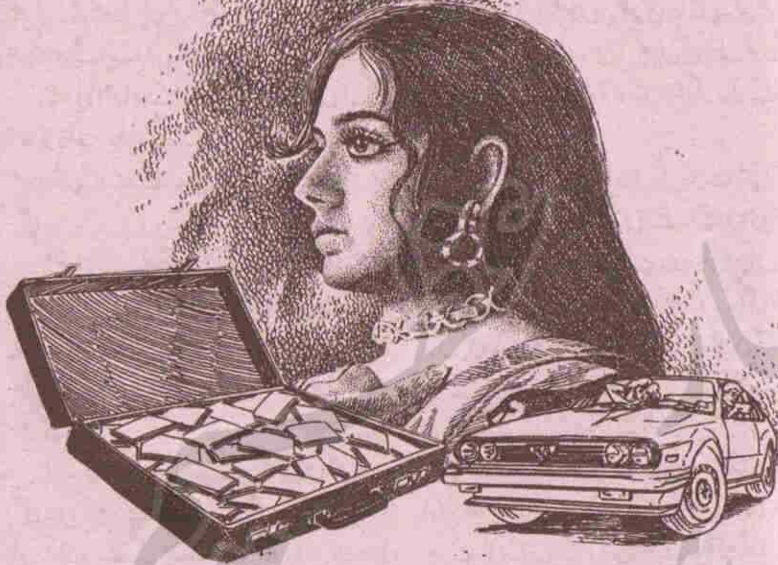
''النساء! کیا ہوا تھا تمہاری امی کو؟'' میرے سوال پر اس کے اداس چہرے پر مزید کرب چھا گیا جیسے وہ اپنے وجود کے قبرستان میں آنسوؤں کا سیلاب دفنانا چاہ رہی ہو۔

''طاہرہ آپا! اُن کا شوگر لیول خطرناک حد تک گر گیا تھا۔ میں اور اعجاز فوری طور پر انہیں ہاسپٹل لے کر گئے مگر اُن کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ تین دن کے اندر اُن کا انتقال ہوگیا۔'' النساء کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ ہفتہ پہلے شاپنگ کرتے ہوئے بازار میں مجھے النساء اپنی بیٹی مونا کے ساتھ ملی تھی۔ کافی عرصہ بعد میری اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔

میں اس سے گھر والوں کی خیریت پوچھ رہی تھی۔ اس نے اپنی امی کے انتقال کے بارے میں بتایا۔ مجھے خالدہ آنٹی کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ میں اسے تسلیاں دیتی رہی اور اس کے گھر آنے کا وعدہ کرلیا۔

میرے والد میجر رضوان علی اور النساء کے والد میجر حامد ملک کولیگ ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے دوست بھی تھے۔ ملتان کینٹ میں ہمارے بنگلے قریب قریب تھے۔ ہماری امیاں بھی آپس میں گہری دوست بن گئی تھیں۔ امی اور خالدہ آنٹی ہر جگہ ساتھ ساتھ دکھائی دیتی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں تمام بیگمات میں ان کی دوستی کے چرچے مشہور ہوگئے تھے۔ انکل حامد کے پانچ بچے تھے، چار بیٹیوں کے بعد بیٹا تھا، بڑی اسما آپی تھیں پھر النساء، انیلہ اور افرا تھیں۔ سب سے چھوٹا بھائی انس تھا۔ ہم تین بہن بھائی تھے، وقاص بھائی پھر میرا نمبر اور چھوٹا ارسلان۔

میں اور النساء کلاس فیلو ہونے کے علاوہ دوست بھی تھیں۔ ہم اکٹھے کھیلتے، ہوم ورک بھی ساتھ کرتے۔



ہمارا ویک اینڈ کالونی کی سڑکوں پر سائیکلنگ کرتے گزرتا۔ اس شوق کے باعث اکثر چوٹیں بھی بہت لگتی تھیں۔ وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے ہم میٹرک میں پہنچ چکے تھے۔ اُن ہی دنوں ڈیڈی کی ٹرانسفر لاہور ہوگئی۔ یوں ہم ایک دوسرے سے الگ ہوگئے، تاہم ہماری خط و کتابت باقاعدگی سے جاری رہی۔ کبھی کبھار فون پر بات بھی ہوجاتی تھی۔ خالدہ آنٹی کا لاہور آنا جانا ہوتا تو امی سے ضرور ملتی تھیں۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا، مصروفیات ایسے بڑھیں کہ سب ہی انہی کے ہو کر رہ گئے اور رابطے منقطع ہوگئے۔ کوئین میری سے بی اے کے بعد میں نے پڑھائی کو خیرباد کہہ دیا۔ چھ ماہ بعد میری شادی عمیر علی سے ہوگئی اور میں گھر گرہستی میں مصروف ہوگئی۔ وقاص بھائی کی جیسے ہی جاب لگی، اُن کی شادی بھی پھوپھی زاد زنیرہ سے ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد میں، ملائکہ اور زین کی ماں بن چکی تھی۔ ڈیڈی کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہم اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ ایک سال پہلے ڈیڈی کا انتقال ہوگیا تھا۔

اب النساء اکثر میرے گھر آنے لگی تھی۔ ہمیشہ وہ ماں کو یاد کرتی۔

''طاہرہ......! میری ماں دنیا کی بہترین ماں تھیں۔'' اُس کی آنکھوں میں اداسی چھا جاتی جیسے وہ گم شدہ منظروں میں ماں کو تلاش رہی ہو۔

''پگلی، مائیں تو سب ہی اچھی ہوتی ہیں۔'' میں نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔

اسما کی شادی اس کی پھوپی زاد راشد سے ہوئی

تھی حالانکہ اس کے ابو اس رشتہ کے حق میں نہیں تھے۔ پھوپھا کی کنسٹرکشن کمپنی تھی۔ راشد باپ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ پھوپی بھی بھی سگھڑ خاتون واقع نہ ہوئی تھیں۔ پھوپھا نے بے حساب دولت کمائی جو پھوپی کے پھوہڑ پن اور فضول خرچی کی نذر ہوگئی۔ ان کا صرف ایک ذاتی گھر تھا۔

پھوپی، النساء کے ابو کے پاؤں پڑ گئیں کہ مجھے اسما کا رشتہ رحمان کے لیے دے دیں۔ ابو بہن کی محبت میں مجبور ہوگئے۔ اس طرح اسما، مسز راشد بن گئی۔

النساء کے لیے بھی ایک اچھا رشتہ آ گیا۔ اعجاز احمد اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ النساء سے تقریباً پندرہ سال بڑے تھے، تاہم النساء اُن کے ساتھ خوش تھی۔ دونوں میں زبردست انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی تھی۔

انیلہ کی شادی بھی کھاتے پیتے لوگوں میں ہوئی تھی۔ وہ بھی اپنے گھر میں سکھی تھی۔ افرا کی شادی ماں کے مرنے کے چھ ماہ بعد ماموں زاد سے ہوگئی تھی۔ انس کی منگنی ماموں کی بیٹی ثمرہ سے طے پائی تھی۔

النساء جب بھی آتی ہم بچپن کی باتیں یاد کرتے تھے اور بیتے لمحوں کو آواز دینا ہم دونوں کا تسکین بخش مشغلہ تھا۔

وقت کا پہیہ تیزی سے گھومتا رہا۔ اس دوران النساء کے چھ بچے ہوگئے تین بیٹے، تین بیٹیاں۔ چھوٹا بیٹا ابھی دو سال کا تھا۔ شادی کے بعد النساء میں ایک تبدیلی آئی تھی۔ وہ باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتی تھی لیکن شادی کے بعد صوم وصلوٰۃ کی پابند ہوگئی تھی۔ ہر وقت نماز، قرآن پاک اور تسبیحات میں مصروف رہتی تھی۔ مجھے بھی اکثر کہتی۔

"طاہرہ! یہ تسبیح پڑھا کر، دو والی پڑھو، سورۃ رحمٰن باقاعدگی سے پڑھو اور سنا بھی کرو۔" اب وہ پردہ بھی کرنے لگی تھی۔ ہر وقت سیاہ گون پر سیاہ اسکارف اس کے چہرے پر لپٹا رہتا جس کے اندر سے اس کی چمکتی آنکھیں جھانک رہی ہوتیں۔ اکثر میری نگاہیں اس کی آنکھوں پر ٹھہر سی جاتیں۔ لمحہ بھر کے لیے تو میں سٹپٹا جاتی۔ ان آنکھوں کی چمک اور انہیں ملی زباں سامنے والے کو سحر میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھی۔

اعجاز محمود بھی نیکوکاروں کی صحبت میں بیٹھنے والے نمازی اور پرہیزگار شخص تھے۔ اچھوں کی صحبت میں انسان اچھا ہی تو ہوتا ہے۔ وہ بیوی بچوں سے بھی بے حد محبت کرتے تھے۔ انہوں نے بھی النساء کی کسی بات کو رد نہیں کیا تھا۔ اسے پوری آزادی دے رکھی تھی۔ پوری تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ سگریٹ، پان کی انہیں لت نہیں تھی جبکہ النساء بے حد فضول خرچ تھی۔ آئے دن شاپنگ کرتی، وافر مقدار میں کھانا بناتی، دوسرے دن وہ کھانا ماسی کو دے دیتی۔ اس کے برعکس اسما کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ راشد کا کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔ بچوں کی فوج بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ راشد کے والدین تھوڑے عرصہ بعد یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے تھے۔ جب راشد کا کام بالکل ہی ٹھپ ہو گیا تو وہ گھر میں بیٹھ گیا۔ اس صورت حال میں اسماء نے لوگوں کے کپڑے سلائی کرکے اور بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر گھر کی گاڑی چلانے کی کوشش کی جبکہ راشد فارغ بیٹھا تھا اور فارغ انسان کا دماغ شیطان کا گھر بن جاتا ہے۔ چنانچہ راشد برے دوستوں کی صحبت میں پڑ گیا۔ دوستوں نے اسے نشے کا عادی بنا دیا۔ وہ ہیروئن کا استعمال کرنے لگا تھا۔ کئی مرتبہ اسما نے اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرایا مگر نشے کی لت اس سے نہ چھوٹ سکی۔ حالات تیزی سے خراب ہو رہے تھے، گھر کا

آدھا حصہ بھی بک گیا مگر راشد نے نشہ نہ چھوڑا۔ گھر میں جھگڑے، مار کٹائی روز کا معمول بن گیا تھا۔ راشد، اسما سے لڑتا اور اس سے نشے کے لیے پیسے مانگتا۔ راشد کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ایک رات وہ ایسا سویا کہ پھر کبھی نہیں اٹھ سکا۔

انیلہ اپنے گھر میں مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔

سب سے چھوٹی افرا کی چار بیٹیاں تھیں۔ اس کا شوہر والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ساس، نندیں اٹھتے بیٹھتے اسے بیٹا نہ ہونے کے طعنے دیتی رہتی تھیں، یوں گھر میں ہر وقت کھنچاؤ اور کساؤ رہتا۔ ساس، پوتے کی خواہش میں بیٹے کی دوسری شادی کے پلان بناتی رہتی۔ افرا شدید ذہنی انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔

ان سب میں النساء تھی جو اپنے گھر میں خوش تھی لیکن اسے شوہر کی محنت کی کمائی کی قدر نہیں تھی۔ وہ پانی کی طرح فضول چیزوں پر پیسہ بہاتی۔ بچوں کی ناجائز فرمائشیں پوری کرتی رہتی۔

اکثر وہ میرے سامنے رونا روتی۔ "طاہرہ، بچے بڑے ہو رہے ہیں، اخراجات بڑھ رہے ہیں، مہنگائی بہت ہے، مونا کالج میں پہنچ گئی ہے۔"

"تمہیں کس نے کہا تھا اتنے بچے پیدا کرو؟" میں ہنستے ہوئے اسے سرزنش کرتی۔

"یار، یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔" وہ کچھ جھینپ کر مجھے گھورتی۔

"اپنے اخراجات کم کرو النساء، تم بہت فضول خرچ ہو۔ تم نے کبھی سوچا، اعجاز بھائی دن رات کام کرتے ہیں؟"

"طاہرہ، میں تو ضرورت کے تحت ہی خرچ کرتی ہوں۔"

"نہیں النساء، تم بہت فضول خرچ ہو، تمہیں پیسے کی قدر نہیں ہے۔ آگے چل کر تمہیں پرابلم ہو سکتی ہے۔" میں نے اس کے سوٹ کی طرف دیکھا جو لینن کا تھا، اس پر کڑھائی ہوئی تھی، وہ دو ڈھائی ہزار سے کم کا نہیں تھا۔

"طاہرہ، اپنی پوزیشن کا بھی تو خیال رکھنا ہوتا ہے۔" اس نے میری نظروں کو بھانپتے ہوئے جواز پیش کیا تھا۔

"ضرور رکھو لیکن طریقے سلیقے سے، تم خود اچھی سلائی کر لیتی ہو، اس سے اچھے کپڑے تھوڑی قیمت میں تم گھر میں سی سکتی ہو۔ تم سارا دن گھر میں فارغ رہتی ہو، بوتیک کیوں نہیں کھول لیتیں؟"

"اتنا ٹائم نہیں ہوتا میرے پاس۔" اس نے بہانہ تراشا۔

پھر کئی دن مصروفیات کی نذر ہوگئے۔ ایک روز النساء کا فون آ گیا۔

"طاہرہ، کہاں غائب ہو؟ کیا مجھے بالکل ہی بھول چکی ہو؟" وہ شکوہ کر رہی تھی۔ میں اپنی مصروفیات اسے گنوانے لگی۔ میں انٹیریئر ڈیزائننگ کے شعبے سے منسلک ہوگئی تھی۔ النساء کی آواز سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"طاہرہ، اعجاز کی ریٹائرمنٹ نزدیک آ رہی ہے، اب کیا ہوگا؟ اپنا گھر بھی نہیں ہے، بچوں کے اخراجات بہت زیادہ ہیں، ان کی نت نئی فرمائشیں؟"

میں نے دل میں سوچا، تم نے خود ہی تو بچوں کی عادات بگاڑی ہیں، خواہشات کے جنگل کو تم نے اتنا وسیع کرلیا تھا۔ دنیا کی ہوس ہی تو بندے اور خدا کے درمیان دوریاں پیدا کرتی ہے۔

"مونا نے تو ماسٹرز کرلیا ہے، وہ جاب کیوں نہیں ڈھونڈتی؟"

"کئی جگہ اپلائی کر رکھا ہے اس نے۔ شام میں

وہ اور عاطف بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتے ہیں۔" اس کی باتوں سے مجھے لگ رہا تھا' وہ مالی مدد چاہ رہی ہے مجھ سے۔ میں نے بارہا اسے سمجھایا تھا' "تم اپنا ہاتھ تھوڑا کھینچ کر رکھو' اعجاز بھائی نے تمام عمر اچھا خاصا کمایا تھا۔ اس کی جگہ کوئی سگھڑ عورت ہوتی تو اپنا ذاتی گھر بنا چکی ہوتی مگر النساء نے آنے والے وقت کی کوئی پلاننگ نہیں کی تھی۔ اگر کچھ بچایا ہوتا تو آج کام آتا۔ چند روز بعد پھر اس کا فون آ گیا۔ اس بار بھی وہی رونا دھونا۔

"میں بہت پریشان ہوں...... مہنگائی بہت ہے...... پورا نہیں پڑتا۔ مالک مکان نے گھر کا کرایہ بھی بڑھا دیا ہے۔ عاطف کینئرڈ کالج میں ایڈمیشن کے لیے ضد کر رہا ہے۔"

"دیکھو النساء' تم کسی اور کالج میں اس کا داخلہ کرا دو' کینئرڈ میں تو صرف سیاست دانوں یا بزنس مینوں کے بچے پڑھ سکتے ہیں' ہم جیسے سفید پوش افورڈ نہیں کر سکتے۔"

"میں نے یہ تمام باتیں عاطف کو سمجھائی ہیں لیکن اس کی ایک ہی ضد ہے۔ پلیز طاہرہ' تم میری ہیلپ کر دو۔" وہ قرض نہیں مانگ رہی تھی' مدد مانگ رہی تھی۔

"میں عمیر سے بات کروں گی۔" مجھے اس کا انداز کچھ ناگوار لگا۔ میں بخوبی جانتی تھی' اعجاز بھائی اچھا خاصا کما رہے ہیں' ان کی زرعی زمینیں بھی ہیں۔

اس روز وہ صبح ہی صبح میرے گھر پہنچ گئی۔ ملائکہ یونیورسٹی جا چکی تھی۔ زین کالج اور عمیر دفتر۔ صبح کے وقت گھر میں جو بے ترتیبی مچی ہوتی ہے' میں وہ سمیٹ رہی تھی۔

"النساء' کیسے آنا ہوا؟ خیریت تو ہے؟" میں نے فکرمندی اور حیرت سے پوچھا۔

"تم سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا' سو چلی آئی۔"

"اچھا' اچھا' بیٹھو۔" میں نے اسے لاؤنج میں بٹھایا اور جلدی سے دو کپ چائے اور کچھ لوازمات ٹرالی میں رکھے اس کے لیے لے آئی۔

"گرما گرم چائے پیو' آج سردی بہت ہے۔" میں اس کے قریب کوچ پر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت ریڈ اور سی گرین ڈریس میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے سراپے میں اب بھی بہت کشش تھی۔ اس کی منی سی ناک میں ڈائمنڈ نوز پن پہلے تو نہ تھی پھر یہ کیونکر حالات کی خرابی کا رونا روتی دکھائی دیتی ہے؟ میں نے سوچتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔

"النساء......! اور سناؤ' بچے کیسے ہیں؟" میں نے اس کے دمکتے چہرے اور ملائم ہاتھوں کو دیکھا۔ لانبے ناخنوں پر لائٹ پنک کیوٹیکس سج رہی تھی۔ "لگتا ہے' امپورٹڈ کریمیں استعمال کرتی ہو۔"

"کہاں طاہرہ' تم تو جانتی ہو' بچپن سے ہی میرا کلر فیئر ہے۔" میں دفعتاً مسکرائی۔ "شکر ہے طاہرہ' عاطف کا کینئرڈ میں داخلہ ہو گیا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اعجاز کو سیکوریٹی کی جو رقم ملی ہے' بس اسی سے سارے مسئلے حل ہو گئے ہیں۔"

"تم اپنا گھر خرید لو۔" میں نے نایاب قسم کا مشورہ دے ڈالا۔

"اتنے پیسے میں بھلا گھر خریدا جا سکتا ہے؟" اس نے چائے کا سپ لیا۔ "سوچ رہی ہوں' کوئی اچھا رشتہ مل جائے تو مونا کی شادی کر دوں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے' ایک فرض ادا ہو جائے گا۔"

"اعجاز بھائی کسی اور جاب کے لیے اپلائی کیوں نہیں کرتے؟"

"طاہرہ' اب ان کی پہلی سی صحت نہیں ہے' کچھ ہارٹ کا مسئلہ بھی لاحق ہو گیا ہے۔ ڈاکٹرز نے انہیں

مکمل ریسٹ کا مشورہ دیا ہے۔"

"تو پھر اپنا کوئی بزنس شروع کر لیں؟" مشورے دینے میں' میں ماہر ہوں۔

"ہاں' سوچ تو رہے ہیں۔" میری نگاہیں بار بار النساء پر ٹھہر جاتیں۔ وہ اتنی مطمئن تو دکھائی نہ دیتی تھی۔ میرے اندر کی حس الارم کی صورت میرے ذہن کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ میں نے کندھے اچکا کر ذہن جھٹکا۔

ایک روز لبرٹی سے شاپنگ کرتے ہوئے میں نے سوچا' راستے میں ہی النساء کا گھر پڑتا ہے' اس سے ملتی جاؤں۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

"گھر تو بڑا اچھا ڈیکوریٹ کر لیا ہے۔" میں نے طائرانہ نظر لاؤنج اور سامنے ڈرائنگ روم پر ڈالی۔

"کیا بتاؤں طاہرہ' حالات بہت خراب ہیں' سوچا' گھر کی حالت صحیح رکھوں' جوان بیٹی ہے' کوئی نہ کوئی رشتہ آ ہی جائے گا۔ تم بھی دعا کیا کرو۔"

"انشاء اللہ' بہتر ہو گا۔" وہ میرے لیے اورنج جوس لے آئی تھی۔

"اعجاز بھائی کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ اسلام آباد چلے گئے ہیں' وہاں کسی دوست کے ساتھ مل کر رینٹ اے کار کا کاروبار کر رہے ہیں۔"

"یہ تو اچھی خبر سنائی تم نے۔"

"طاہرہ' میرے لیے دعا کیا کرو۔" یہ راگ الاپنے کی عادت تھی اس کی۔

"النساء...... کبھی تو خدا کا شکر بھی ادا کر دیا کرو۔" مجھے غصہ آ گیا۔ "اگر شروع سے میانہ روی اختیار رکھتیں تو اچھا تھا۔ اعجاز بھائی کی ہڈیوں کا سرمہ ہو گیا ہے محنت کرتے کرتے۔"

غزل

کھو جائے جو اک بار جوانی نہیں ملتی
ٹھہرے ہوئے پانی کو روانی نہیں ملتی

میں کیسے بتاؤں یہ تجھے تازہ خریدار
اب کوئی روایت بھی پرانی نہیں ملتی

اک شام جو برسوں سے نگاہوں میں ہے میری
اُس جیسی کوئی شام سہانی نہیں ملتی

پہچان کراؤں میں بھلا کس طرح تم سے
تصویر بھی اَب کوئی پرانی نہیں ملتی

کیا لطف بھلا ہوتا یہ سیرابیِ دل کا
آنکھوں کو اگر تشنہ دہانی نہیں ملتی

آتا نہ جوانی پہ مری جلد بڑھاپا
گر خاک میں بھائی کی جوانی نہیں ملتی

سیراب ہو کوثر سے تو نیّر کا بھلا ہو
تسکین تجھ سے رُوح کو پانی نہیں ملتی

نیر رضوی

”طاہرہ......!مہنگائی بھی تو بہت ہے۔“ وہ منمنائی۔

”سب کے لیے مہنگائی ہے النساء بیگم‘ ایک تمہارے لیے نہیں ہے۔“ آج میں اسے لتاڑنے پر تلی ہوئی تھی۔ ”تمہاری امی کتنی قناعت پسند خاتون تھیں‘ وہ صبر والی بھی تھیں۔ تم نے اُن سے کچھ نہ سیکھا؟“

”یار‘ حوصلہ دینے کی بجائے تم مجھے ڈانٹ رہی ہو۔“

”شاباشی دوں تاکہ تم مزید حماقتیں کرو؟“

”طاہرہ‘ تم ذکیہ کو جانتی ہوناں؟“ اس نے اچانک ٹاپک بدلا۔

”کون ذکیہ؟“

”ہماری رشتے دار تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارے پاس ملتان آیا کرتی تھی؟“

میں نے ذہن پر زور دیا۔ ”ہاں‘ یاد آیا۔“

”وہ لاہور میں ہی رہتی ہے۔ اس نے شاندار قسم کا گھر بنوایا ہے۔ مجھے بھی میلاد پر بلایا تھا۔ وہ تمہارا بھی پوچھ رہی تھی۔“

”شادی ہوگئی اس کی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہوئی تھی۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونکی۔

”ایک سال بعد طلاق ہوگئی۔“

”وجہ؟“

”بتا رہی تھی‘ انڈراسٹینڈنگ نہیں ہوپائی۔ جہاں اس کی شادی ہوئی تھی‘ وہ لوگ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ذہنی طور پر جاہل تھے۔ ذکیہ شوبزنس میں فیشن ڈیزائنر ہے‘ خوب کما رہی ہے‘ پہلے الگ اپارٹمنٹ میں رہتی تھی‘ اب ڈیفنس میں تین کنال کی کوٹھی بنوائی ہے۔“ میں انہماک سے النساء کی باتیں سن رہی تھی جو نہایت دلچسپی سے لکی کا ذکر کررہی تھی۔ اب ذکیہ‘ لکی بن چکی تھی۔

”دوبارہ شادی کی اس نے؟“

”نہیں‘ ویسے بڑے بڑے منسٹروں اور بزنس مینوں سے اس کے خصوصی ریلیشن ہیں۔“ النساء بہت دلچسپی سے لکی کا تذکرہ کررہی تھی۔ ”یار‘ خوبصورت و رنگین لائف اسٹائل ہے لکی کا۔ اس کے آگے پیچھے لوگ چل نہیں‘ بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ ایک ہم ہیں۔“ اس نے منہ بسورا۔

”النساء......خدا کا شکر ادا کیا کرو۔ عزت سے زندگی گزار رہی ہو۔“

”طاہرہ......!یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے جہاں چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے سسکنا پڑے؟“

”النساء......دنیا کی دلفریبی سے باہر نکلو‘ یہ اذیت کے سوا تمہیں کچھ نہیں دے گی۔ اپنی حدود میں رہ کر وجود میں امنگیں پالی جائیں تو زیست بوجھ نہیں لگتی۔“ میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ شاید وہ بہت اونچی اڑان اڑنے کی خواہش کررہی تھی۔

”مجھے لکی نے آفر دی ہے۔“

”کس بات کی......؟“ میں ششپٹاکر اسے گھورنے لگی تھی۔

”جو پراجیکٹ وہ کرتی ہے۔“

”تم اسے پراجیکٹ کہہ رہی ہو؟“ مجھے اس سے گھن آنے لگی تھی۔

”طاہرہ......!اس کام میں بہت پیسہ ہے‘ تھوڑے ٹائم کے عوض نوٹوں کی بارش......“

”النساء......لعنت ہے تم پر......“

”یار‘ تم کیوں بگڑ رہی ہو‘ میں نے صاف انکار کردیا ہے۔“ یقیناً وہ جھوٹ بول رہی تھی‘ اس کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا‘ وہ لکی کی شان وشوکت سے خاصی امپریس تھی۔

”النساء......بند کرو یہ بکواس......“ مجھے غصہ آ گیا۔ ”تم تو نمازی‘ پرہیزگار عورت تھیں اور تمہارا شوہر کس قدر نیک ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں اس گھناؤنے کام کے متعلق تم سوچتی ہو؟“ میں شاک کی کیفیت میں تھی۔

”یار‘ اس دنیا میں سب چلتا ہے۔“

”یہ دنیا ہی تمہیں جہنم کا ایندھن بننے پر اکسا رہی ہے۔“

”اسما بھی اسی طرح پیسے کما کر بچوں کو پال رہی ہے اور وہ عرشی بھی ایسی ہے۔ کس ٹھاٹھ سے زندگی انجوائے کررہی ہے۔ میں جوان ہوں‘ خوبصورت ہوں‘ بھلا کوئی کہہ سکتا ہے‘ میں جوان بچوں کی ماں ہوں؟“ میں نے النساء کو ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے سر پر عیش وعشرت سے بھرپور زندگی گزارنے کا بھوت سوار تھا۔

اس دن کے بعد میں نے النساء سے ملنا چھوڑ دیا تھا‘ مجھے پتہ چلتا رہتا وہ لکی کے رنگ میں پوری طرح ڈھل چکی ہے۔ اس کے گھر میں لڑکے لڑکیوں کی مخلوط محفلیں ہونے لگی تھیں۔ اس کام کے لیے گھر کا اوپری پورشن مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ ان سے بھاری رقم بٹورتی۔

اعجاز محمود کی صحت کافی عرصہ سے گر رہی تھی۔ کام کی عادت تھی اس لیے فارغ نہیں رہ سکتے تھے۔ انہیں دوسرا ہارٹ اٹیک جان لیوا ثابت ہوا۔

النساء کی دنیا جیسے اندھیر ہوگئی تھی۔ شوہر کی موت پر اس کی حالت بہت بری تھی‘ اس پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

بہرحال وقت سب سے بڑا مسیحا ہوتا ہے‘ آہستہ آہستہ وہ زندگی کی طرف واپس آرہی تھی۔ دونوں بیٹے بہت چھوٹے تھے‘ گھر بھی کرائے کا تھا‘ زرعی زمین پہلے ہی بک چکی تھی۔ اعجاز کے تمام رشتے داروں نے اس کی مالی مدد کی لیکن کب تک؟ مونا جاب کررہی تھی‘ عاطف گورنمنٹ کالج میں آ گیا تھا‘ باقی بچے ابھی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ اخراجات بہت تھے‘ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کیا کرے پھر اس نے اپنا تمام زیور بیچ کر لکی کے مشورے سے بوتیک کھول لی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ پھر پرانی ڈگر پر آنے لگی۔ نامور شخصیات رات کی سیاہی میں پھر سے اس کے گھر میں آنے لگی تھیں۔

ایک روز مجھے افرا نے فون کرکے کہا۔ ”طاہرہ آپی‘ پلیز‘ النساء باجی کو سمجھائیں‘ ان کی بیٹی جوان ہے‘ کل کو کون بیاہنے آئے گا اسے؟“

”افرا‘ میں نے اسے سمجھانے کی بارہا کوشش کی لیکن وہ عالی شان زندگی جینا چاہتی ہے۔“

پھر میں نے سنا‘ اس کی بیٹی بھی اس کے نقش قدم پر چل پڑی ہے۔ وہ آوارہ وعیاش مردوں کے ساتھ جاتی اور بدلے میں دولت حاصل کرتی تھی۔

النساء آج بھی اعجاز محمود کو یاد کرکے روتی ہے۔ وہ اب بھی پابندی سے نماز بھی پڑھتی ہے‘ حجاب بھی لیتی ہے لیکن اس کی روش میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ بڑی بڑی گاڑیاں آج بھی اس کے دروازے کے سامنے آکر رکتی ہیں۔ وہ سیدھے سادے لوگوں کے سامنے آج بھی حالات کی تنگی کا رونا روتی ہے‘ تب اس کی آنکھوں سے ایسے آنسو نکل رہے ہوتے ہیں جیسے دنیا میں اس سے زیادہ دکھی کوئی نہیں ہے۔

میری نظر میں وہ بری عورت نہیں ہے لیکن خواہشوں کے جنگل میں بھٹک گئی ہے۔ اس کے لیے بس یہی دعا ہے کہ خدا اسے راہِ مستقیم دکھائے تاکہ وہ خواہشات کے اس جنگل سے نکل آئے۔ (آمین!)



مسرت گیلانی

عمر کاٹی جیسے سزا

فوزیہ مغل کا خیال

وہ جس کو دیکھ کے بچے بھی سارے چھوڑ گئے
میں ایک ٹوٹا کھلونا کسی دکان میں ہوں

محرومیوں اور نفرتوں کے سائے میں زندگی بھگتنے والی ایک لڑکی کی غم آلود کہانی



''گلشن آپا! السلام علیکم! کیسی ہیں؟ آج تو بہت اسمارٹ لگ رہی ہیں' کیا بات ہے؟'' فائزہ اپنا بیگ رکھتے ہوئے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بولے چلے جا رہی تھی۔ ادھر گلشن آپا پچپن برس کی مسافت کے آثار چہرے پر سمیٹے آنکھ میں بھرپور پیار لیے باوقار انداز سے مسکراتے ہوئے فائزہ کے چہرے کو تک رہی تھیں اور پھر فائزہ کے سیٹ پر بیٹھتے ہی گلشن آپا نے اسے خبر دی تھی کہ ہوسکتا ہے' آج ہمیں رکنا پڑے کیونکہ کپڑوں کی لاٹ نہیں آئی ہے اور جب لاٹ آئے گی تو شاید پھر لائٹ جائے گی' سو اوورٹائم کرنا پڑے گا۔

''وہ تو کرلیں گے مگر ابھی کیا کریں؟''

''جو تمہارا دل چاہے۔'' فائزہ کے سوال کے جواب میں گلشن آپا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''چلیں پھر میں گزشتہ مہینے میں جو کام ہوا ہے' اسے فائلوں میں کاؤنٹر چیک کرلیتی ہوں۔'' یہ کہنے کے بعد فائزہ کچھ دیر تک فائلیں الٹ پلٹ کرتی رہی تھی مگر شاید دل نہ لگا تھا تو اٹھ کر کھڑکی میں کھڑی ہو کے ہال میں موجود ورکرز لڑکیوں کو دیکھنے لگی تھی۔ ادھر گلشن آپا بھی کچھ فرصت میں نظر آرہی تھیں۔ فائزہ نے موقع کی مناسبت سے فوراً ہی پوچھا تھا۔

''آپا! چائے پئیں گی' بناؤں؟'' گلشن آپا کے ''ہاں۔'' کہنے پر فائزہ نے دو کپ چائے بنائی تھی اور کرسی گھسیٹ کر آپا کی ٹیبل کے قریب ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ چائے کے دوران میں گھریلو معاملات اور حالات کے حوالے سے دونوں کے درمیان باتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا تھا اور باتوں ہی باتوں میں فائزہ نے اچانک گلشن آپا سے سوال کیا تھا۔

''آپا......! آپ کو تو پڑھائی کا بہت شوق تھا پھر آپ نے انٹر کے بعد پڑھائی چھوڑ کر یہ جاب کیوں کرلی تھی؟''

گلشن آپا' فائزہ کا یہ سوال سن کر ذرا دیر کے لیے بالکل چپ سی ہوگئی تھیں پھر خلاؤں میں یوں دیکھنے لگی تھیں جیسے وہ فائزہ کے سوال کی کھڑکی سے ماضی میں دیکھ رہی ہوں پھر انہوں نے دھیرے دھیرے یوں بولنا شروع کیا تھا جیسے بہت عرصے بعد انہیں کوئی گرد آلود تحریر ملی ہو اور اسے وہ محسوس کرتے ہوئے پڑھنا چاہ رہی ہوں۔ یہ پڑھتے' بولتے وہ دیکھ فائزہ کی طرف ہی رہی تھیں مگر نظر میں منظر کوئی اور تھا۔

''میں اپنے ابا کی بہت لاڈلی تھی۔ ابا سے اپنی ہر بات منواتی تھی جبکہ اماں اس بات پر اکثر ابا سے ناراض ہوتی تھیں کہ آپ بیٹی کا دماغ خراب کر رہے ہیں۔ جب میں پانچ سال کی ہوئی تھی اور اسکول میں داخلہ لیا تھا تو میرا چھوٹا بھائی صفدر پیدا ہوا تھا۔ اب اماں کی ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ وہ گھر کے تمام کام کرتیں اور ساتھ ہی بھائی کو بھی سنبھالتی تھیں۔ وہ مجھ پر بھی اب غصہ زیادہ کرنے لگی تھیں اور کبھی کبھی تو بہت مارتی بھی تھیں۔ خیر' زندگی کے دن اسی طرح گزر رہے تھے' ساتھ ہی میری اور چھوٹے بھیا صفدر کی عمر بھی بڑھ رہی تھی۔

•......•......•......•

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس روز میں نے اپنے بیگ سے کتاب نکالی ہی تھی کہ چھوٹے بھیا صفدر نے لپک کر ''میرا قاعدہ۔'' کہتے ہوئے مجھ سے کتاب جھپٹنے کی کوشش کی تھی اور اس چھینا جھپٹی میں میری کتاب پھٹ گئی تھی۔ میں نے بے اختیار اماں سے فریاد کی تھی۔

''اماں! بھیا نے میری کتاب پھاڑ دی۔''

''وہ تو ابھی چھوٹا ہے اور تم جھاڑ کی جھاڑ کیا کررہی تھیں کم بخت...... نالائق......؟'' اماں نے شدید غصے کے عالم میں مجھے ڈانٹا تھا۔

اور پھر اکثر ایسا ہونے لگا تھا کہ چھوٹا بھیا کوئی

بھی غلط کام کرتا تو سوال مجھ سے ہوتے۔ "یہ کیسے ہوا؟ یہ کیوں ہوا؟ اور تم اُس وقت کہاں تھیں؟ کم بخت...... نالائق......؟"

گزرتے وقت کے ساتھ جہاں میرے بہن بھائیوں میں اضافہ ہوا' وہاں اماں کی جھنجلاہٹ اور غصے میں بھی تیزی آئی تھی' خاص طور پر میری ذات کے حوالے سے۔ میرے اسکول سے آ کر بستہ رکھنے کی دیر ہوتی تھی اور اماں کی آوازیں آنی شروع ہو جاتی تھیں۔ "اُس کو دیکھو' اُس کو سنبھالو' اس کا خیال کرو۔" وغیرہ وغیرہ۔ کبھی کبھی اسکول سے واپس آنے کو دل نہ چاہتا' سب لوگوں پر غصہ آنے لگتا' بہن بھائی برے لگنے لگتے مگر ان سب کا حل خاموشی ہی سمجھ آتا تھا۔

میرے ساتھ ایک عجیب معاملہ یہ بھی تھا کہ میں جب کبھی محبت بھرے لہجے میں اماں سے قریب ہو کر کچھ کہنے کی کوشش کرتی تو اماں ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہتیں۔ "گلو! تم کب بڑی ہو گی؟ جاؤ جا کر کام کرو۔" میرے دل میں سوراخ ہو جاتا' نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی سوائے کڑھنے کے۔

ان دنوں مجھے سب سے زیادہ رزلٹ والے دن کا انتظار ہوتا تھا کیونکہ رزلٹ اچھا آنے پر مجھے سہیلیوں کے ساتھ باہر جانے اور کھیلنے کی آزادی ہوتی تھی' ایسے موقع پر میری خوشی سنبھالے نہ سنبھلتی تھی لیکن ساتھ ہی یہ خوف بھی ہوتا تھا کہ کہیں اماں کو کوئی کام نہ یاد آ جائے اور وہ مجھے روک لیتیں اس لیے میں جلدی سے گھر سے باہر نکل کر اپنی سہیلیوں کو جمع کرنے لگتی اور پھر تو میرے سارے ارمان پورے ہوتے تھے' پہل دوج' چھپن چھپائی' اونچ نیچ' برف پانی اور اللہ بھلا کرے' کھوکھو' لنگڑی پالا اور نہ جانے کیا کیا۔ ہم سہیلیاں کبھی ہنس رہی ہیں' کبھی لڑائی کر رہی ہیں' کبھی کسی کے گھر کے آنگن میں' کبھی کسی کے دروازے پر ایک شور و ہنگامہ برپا ہوتا' خوشی کے ان

لمحات میں گھر اور اماں کو یاد کرنا یا ذکر کرنا اُس وقت گناہ کبیرہ ہوتا تھا اور پھر جب شام ہونے لگتی تھی تو ہم کسی منڈیر پر' درخت کے نیچے یا پھر کسی کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ناپسندیدہ ٹیچروں کی نقل بھی اتارا کرتے تھے' اپنے سارے دکھ سکھ کہتے اور پھر مغرب کا وقت قریب ہوتے ہی مجھے گھر واپسی کی فکر شروع ہو جاتی اور گھر جاتے ہوئے سب کو اس طرح خدا حافظ کہتی جیسے شاید یہ سہیلیوں سے میری آخری ملاقات ہو۔

میں جب گھر میں داخل ہوتی تو اماں کے طنزیہ جملے میرا استقبال کرتے۔ "آ گئیں مہارانی صاحبہ؟ ہو گیا شوق پورا؟ نکل گئے ارمان؟"

"جی اماں! وہ آج......" میں کچھ بتانا چاہتی مگر اماں فوراً ہی میری بات کاٹ کر کہتیں۔ "بس' بس' مجھے قصے نہ سناؤ جاؤ نہاؤ' دھول مٹی میں ہو رہے ہیں تمہارے پاؤں۔" (میں حیرت سے اپنے صاف ہاتھ پاؤں دیکھتی۔) مگر پھر بھی نہا کر آتی تو سب کے بستے درست کرنے اور یونیفارم استری کرنے کا حکم ملتا اور میں اس بات پر شکر کرتی کہ چوتھا بھائی ابھی گود میں تھا' اسی وقت اماں کی آواز آتی تھی۔

"چھوٹے کا بستر کر دو' سو گیا ہے اور ہاں' پڑھنے بیٹھو۔ کھیل کود میں بہت دیدہ ہے نالائق کا۔ ماں کو بدنام کرے گی۔ کم بخت کو احساس ہی نہیں۔"

میں خاموشی سے اماں کی سنتی رہی تھی اور اسی میں عافیت تھی ورنہ ایک جوتا یا سروتہ کچھ بھی میرے سر پر پڑ سکتا تھا۔ میں اکثر سوچتی کہ کیا میں اوروں سے مختلف ہوں؟ کیا سب بچوں کو اتنی ڈانٹ پڑتی ہے جتنی مجھے' ایسا کیوں ہے؟

یونہی ماہ و سال گزرتے گئے' چھوٹے بہن بھائی بڑے ہو گئے' میں اور بڑی ہو گئی' اماں اور غضب ناک ہوتی گئیں' مجھ پر پابندیاں بڑھنے لگیں اور پھر جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو میرے حوالے

سے اماں کی پریشانی اور غصے میں اضافہ ہوتا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' ابا جب آفس سے آتے تو کچھ ہی دیر بعد ایک میٹنگ ہوتی اور پھر اماں کا پارہ چڑھ جاتا' ایسے میں ابا اخبار میں گم ہو جاتے اور میں تختۂ مشق بن جاتی۔ اماں میری پڑھائی کے سخت خلاف تھیں مگر میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے پڑھنا ہے' سو میں نے ابا سے وعدہ لیا کہ وہ میرا ساتھ دیں گے' سو انہوں نے کسی کی بھی پروا کیے بغیر میرا پورا پورا ساتھ دیا تھا مگر اماں......! فی امان اللہ۔ میرے کالج سے آنے کے بعد مجھے روز ڈانٹ پڑتی اور اس میں اضافہ اس وقت ہوتا جب کوئی محلے کی عورت یا رشتے دار آ کر کسی لڑکی کی شادی وغیرہ کا ذکر کرتی تو اماں کے غصے کا پہلا طنزیہ تیر یہ ہوتا۔ "کم بخت کا کوئی رشتہ بھی نہیں آتا کہ......" اور پھر ہونے یہ لگا تھا کہ اماں میرے ہر رشتے پر راضی ہو جاتیں۔ ابا کسی نہ کسی بات پر منع کر دیتے۔ اس طرح ہر روز ایک محاذ کھلتا۔ بھائی بھی اب چھوٹے ہونے کے باوجود اماں کی زبان سیکھنے لگے تھے۔ انہیں بھی میرا گھر سے باہر جانا' کالج میں پڑھنا اچھا نہیں لگتا تھا اور پھر اماں اور بھائی جیت گئے' میں اور ابا ہار گئے تھے۔

انٹر کے بعد میرا کالج ختم ہو گیا تھا۔ میں گھر میں رہنے لگی تھی۔ سارا دن گھر کے کام کاج' اماں کی باتیں سننے اور بہن بھائیوں کی خدمت میں گزرنے لگا تھا۔ اب رویوں میں تبدیلی بڑھ رہی تھی' بھائی کچھ بھی اُلٹا سیدھا کر کے اماں سے میری شکایت لگا دیتے' بس پھر اماں اور اُن کی ڈانٹ...... میں جواب کی تلاش میں گم ہو جاتی۔ آہستہ آہستہ میں خاموش رہنے لگی تھی۔

اس روز چھوٹے بھیا نے آواز لگائی تھی۔ "آپا......! کیا مسئلہ ہے' ابھی تک کھانا کیوں نہیں لگایا' اتنی بھوک لگی ہے' کسی کو خیال ہی نہیں۔" اسی

دوران میں چھوٹی بہن رافعہ کی آواز آئی تھی۔ "آپا......! مجھے آپ کے ساتھ درزی کے پاس جانا ہے' جلدی کام ختم کریں' دیر ہو رہی ہے۔" دوسری طرف اماں نجانے کیوں مجھے دیکھ دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے ٹہل رہی تھیں۔

"اچھا بھئی' اچھا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے ہاتھ اور تیزی سے چلانے شروع کر دیے تھے۔

تھوڑی دیر میں سب کھانا کھا رہے تھے' میں صوفے پر لیٹ کر خود سے کہہ رہی تھی کہ کتنا تھک گئی ہوں۔ کہتے ہیں' برا وقت آنے میں دیر نہیں لگتی' سو آ گیا تھا۔ اماں نے میرا خود سے کہا یہ جملہ سن لیا تھا۔ اُن کی گرج دار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"ہاں ہاں' بہت تھک گئی ہے نواب زادی' آتا جاتا کچھ نہیں' نا کوئی ہنر نہ کوئی ڈھنگ' نجانے کس کام سے تھکنے لگی ہے۔ اے بی بی......! سسرال میں نوکروں کی فوج نہیں ہو گی جو تجھ سے تنکا نہ تڑوائے گا کوئی' اٹھ کر ٹوٹی' کام چور کہیں کی' چار حرف کیا پڑھ لیے' بے چاری کے مزاج ہی نہیں ملتے۔" اور جب میں کچھ کہنا چاہتی تھی' اماں ڈانٹ کر چپ کرا دیتی تھیں۔

ایک دن اسی ماحول میں خالہ رضیہ آ گئی تھیں۔ میں نے سلام کیا تھا۔ اسی دوران میں اماں بھی آ گئیں تو میں نے کھسکنے میں عافیت جانی۔ کمرے سے نکلتے نکلتے میں نے پلٹ کر دیکھا تھا تو اماں مسکرا کر اُن سے کچھ پوچھ رہی تھیں اور پھر میرے باہر آتے ہی صفدر بھیا' ہشام بھیا سے بولے تھے۔

"سنو بھئی' آپا کا رشتہ آیا ہے۔" یہ سن کر پہلے تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے' پیروں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی مگر پھر دل میں کہیں کوئی خوشی کا جگنو چمکا تھا کہ آزادی کا خیال آیا تھا۔ ہر بات سے بَری ہونا کیسا لگے گا مگر میری خاموشی نے اس کیفیت کی کسی کو خبر ہونے نہ دی۔

میں برآمدے میں کپڑے تہہ لگانے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد خالہ چلی گئیں تو اماں غصیلے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی برآمدے میں آئیں۔ ان کے چہرے پر آمدِ طوفان کے آثار نمایاں تھے۔ میں سمجھ گئی' بات بنی نہیں۔ اماں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا' بالکل خاموش تھیں مگر ابا کے آتے ہی خاموشی کا یہ بند ٹوٹ گیا تھا۔

اماں نے خالہ رضیہ کی آمد کا ذکر کیا تھا۔ وہ میرے لیے ایک بہت پڑھے لکھے لڑکے کا رشتہ لائی تھیں۔ اماں نے منع کر دیا تھا۔

ابا نے جو بڑے صبر سے اماں کی تمام باتیں سن رہے تھے' بڑے رَسان سے پوچھا تھا۔ ''کیوں' ایسی کیا خرابی تھی؟''

اماں جیسے پھٹ پڑی تھیں۔ ''اُس کی تنخواہ صرف دس ہزار ہے' ڈگریوں کا ہم کیا کریں' اُن کو سجا کر تھوڑی رکھنا ہے' اس تنخواہ میں وہ کس کس کا پورا کرے گا؟ گھر والوں کا' بیوی کا یا اپنا......؟ یہ ہماری گلشن ایسی کوئی ٹھنڈے نصیب والی ہے کہ کسی صورت بات بن ہی نہیں رہی اور بنے بھی کیسے؟ نہ شکل نہ ہنر۔'' اس تمام گفتگو کے دوران میں اور خاتمے پر بھی ابا چپ تھے۔ وہ شاید آندھی کو طوفان میں بدلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

اب وقت گزرنے کے ساتھ رشتے میری چھوٹی بہن رافعہ کے لیے آنے لگے تھے مگر اماں کی ہر بات مجھ پر' میری سیاہ بختی پر' میرا رشتہ نہ ہونے پہ ختم ہوتی تھی۔ اسی دوران میں بہت عرصے بعد میرا ایک رشتہ آیا تھا۔ اماں نے کم تنخواہ والی نوکری کو بنیاد بنا کر انکار کیا تھا تو میں نے بہت ہمت کر کے پہلی بار دبے دبے لہجے میں زبان کھولنے کی کوشش کی تھی۔ ''وقت کے ساتھ ساتھ ترقی ہوگی' سب کچھ مل جائے گا ورنہ جیسا آپ چاہتی ہیں۔''

''ہاں' ہاں' سب کو جمع کرو' سب کو بتاؤ کہ غلطی پر ہم ہیں' ہماری وجہ سے تمہاری شادی نہیں ہوئی' اب تم اپنے لیے رشتے کی بات خود کر لینا۔''

یہ تمام باتیں سن کر میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے' دل بند ہونے لگا تھا' میری غلطی کا کفارہ شاید یہی تھا کہ بس زمین پھٹ جائے اور میں سما جاؤں مگر ایسا بھی نہ ہوا تھا۔ ایک روز ہشام کی ضد پر کہ اُسے شرٹ لینی ہے' میں نے پیسے دے دیے تھے مگر یہ میری بدنصیبی ہی تھی کہ وہ خوشی سے اچھلتا کودتا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا اور اس کی ٹانگ فریکچر ہو گئی۔

بس اماں شروع ہو گئی تھیں۔ ''منحوس نے نجانے کس نیت سے پیسے دیے تھے' میرے بچے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اب تو خوش ہو جا' تیرا بس چلے تو' تو نہ نجانے کیا کرے' وہ تو اللہ کا کرم ہوا کہ جان بچ گئی۔ منحوس کہیں کی بدبخت...... نجانے کون سی گھڑی ہوگی جب اِس کی ڈولی اٹھے گی؟''

مجھے ایسا لگتا کہ میں بے جان ہوں' خاموشی اور تنہائی میرا مقدر بننے لگے پھر بھی میں خود کو زندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی اور یہی سچ تھا یا ہے۔ کبھی کبھی جب کسی وجہ سے میری سہیلیوں سے ملاقات ہوتی تو مجھے زندگی پیاری لگنے لگتی اور ذرا سی دیر میں میرے دل پر سے صدیوں کے بوجھ اتر جاتے تھے۔

زندگی اسی حال میں چل رہی تھی کہ ایک روز غضب یہ ہوا تھا کہ میں نے صفدر کے لیے اپنی ایک سہیلی ناہید کا انتخاب کر لیا تھا اور اماں کو اس کی خوبیاں بتائی تھیں کہ خوبصورت ہے' سلیقہ مند ہے' بس پڑھی لکھی نہیں ہے تو کیا ہوا' خدمت گزار ہوگی۔

''اے صفدر......! سنو' تمہاری عقل مند بہن نے تمہارے لیے رشتہ ڈھونڈا ہے' خدمت گزار ہوگی' کس کی خدمت کرے گی وہ؟ اور کیا یہاں جاہلوں کی کمی ہے جو تیری بہن ایک اور جاہل کو لے کر آ رہی ہے جو اپنا آپ بھی نہ سنبھال سکے؟ ارے گلشن...... کم بخت...... کچھ تو اچھا سوچ' کبھی تو اچھا کر لے مگر تو' تو جب کرنا' غلط ہی کرنا۔''

مجھ پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا' میں اپنا جرم تلاش کرنے لگی' میرا جی چاہا' بے اختیار چیخنے لگوں مگر گلے میں آواز پھنسنے لگی' آنکھیں خودمختار تھیں' سو بھیگ گئیں۔

اب میں گھر میں ایک غیر اہم چیز بن کر رہ گئی تھی' گھر والوں سے میرا سوائے چند مخصوص جملوں کے' کوئی خاص رشتہ نہ رہا تھا۔ ''اوہو آپا......! آپ تو رہنے دیں' ہمیں معلوم ہے' کیا کرنا ہے۔ چھوڑیں بھی' آپ وہاں جا کر کیا کریں گی؟''

''آپ بات کو بالکل غلط سمجھ رہی ہیں۔''

''آپ اپنی پسند اپنے پاس رکھیں۔''

''یہ چیز بہت مہنگی ہے' سنبھال کر استعمال کریں۔'' وغیرہ وغیرہ۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا تھا کہ میں کہاں ہوں؟ میرا مقام کیا ہے؟ مجھے اپنی ہر چیز اپنی ہونے کے باوجود اجنبی اجنبی سی لگنے لگی تھی۔ سب کچھ روح پر بوجھ لگنے لگا تھا۔

•......•......•......•

کچھ اور وقت گزرا' ابا کی بیماری اور وفات کے بعد رشتے مزید دھندلانے لگے' اماں بھی کمزور سی پڑنے لگیں۔ اب بھائیوں کی اماں سے اکثر تکرار رہتی تھی۔

ایک روز اماں کے کمرے سے ہشام اور ماں کے زور زور سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اماں غصے میں تھیں۔

''ہاں...... ہاں...... اب تم کو میری ضرورت نہیں' کر لو خود ہی رشتہ کر لو' نجانے کون ہے؟ کس ذات برادری کی ہے؟ کیسے لچھنوں کی مالک ہے وہ جسے تم ہمارے سر پر......''

''اماں......! میں نے فیصلہ کر لیا ہے' میں کروں گا تو اسی لڑکی سے کروں گا اور بس......'' ہشام نے اماں کی بات کاٹ کر فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا۔

اب میں نے لپک کر معاملہ سنبھالنا چاہا تھا۔ ''سنو ہشام......! تم اُس لڑکی اور اُس کے گھر والوں سے ہمیں ملوا دو' اگر مناسب لوگ ہوئے تو تمہارا رشتہ کر دیں گے۔''

ہشام اپنے کاندھے پر موجود میرا ہاتھ جھٹک کر چیخ پڑا تھا۔ ''کیوں...... کیا میں اچھا برا نہیں سمجھتا' کیا میں اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتا؟ کیا میری کوئی مرضی نہیں ہے؟ اور آپا......! آپ تو رہنے دو' آپ کو ضرورت نہیں میرے معاملے میں بولنے کی۔ آپ کی اپنی شادی تو ہوئی نہیں مگر ہمیں تو کرنے دیں۔''

''ہاں...... ٹھیک ہے...... لیکن بڑوں کی رضامندی......'' میں نے روتے ہوئے دل کے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا تھا۔

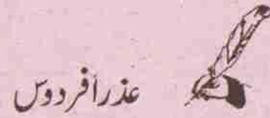
''آپا......! آپ رہنے دیں' بڑے کچھ نہیں کرتے' یہ آپ کی غلطی تھی کہ آپ نے اپنے لیے کچھ نہیں کیا اور اب اس غلطی کی سزا کاٹ رہی ہیں' یہ بڑے تو اپنی پسند' اپنے خوابوں اور معیار کے چکر میں اولاد کا وقت کھو دیتے ہیں اور میں تو کم از کم آپ کی طرح اپنی زندگی ضائع نہیں کر سکتا۔''

اپنے چھوٹے بھائی کی یہ باتیں سن کر میرا دل و دماغ شل ہو گیا تھا' ایک شور کے سوا وہاں کچھ نہیں رہا تھا۔

•......•......•......•

بیٹوں کی بداخلاقی' بدتمیزی والا صدمہ اماں زیادہ عرصے برداشت نہ کر سکی تھیں۔ اُن کی وفات کے بعد سب کے راستے جدا جدا تھے' ایک گھر میں سب اجنبی تھے اور میں اسی اجنبیت سے ڈر کے' گھبرا کر گھر سے نکل آئی تھی اور اَب نجانے گردشِ دوراں مجھے کہاں لے جائے؟''

فیکٹری میں گونجنے والی لنچ بیل کی آواز نے گلشن آپا اور فائزہ کو چونکا دیا تھا۔ وہ دونوں حال میں لوٹ تو آئی تھیں مگر بہت خاموش اور بوجھل بوجھل سی......



عذرا فردوس

مکافاتِ عمل

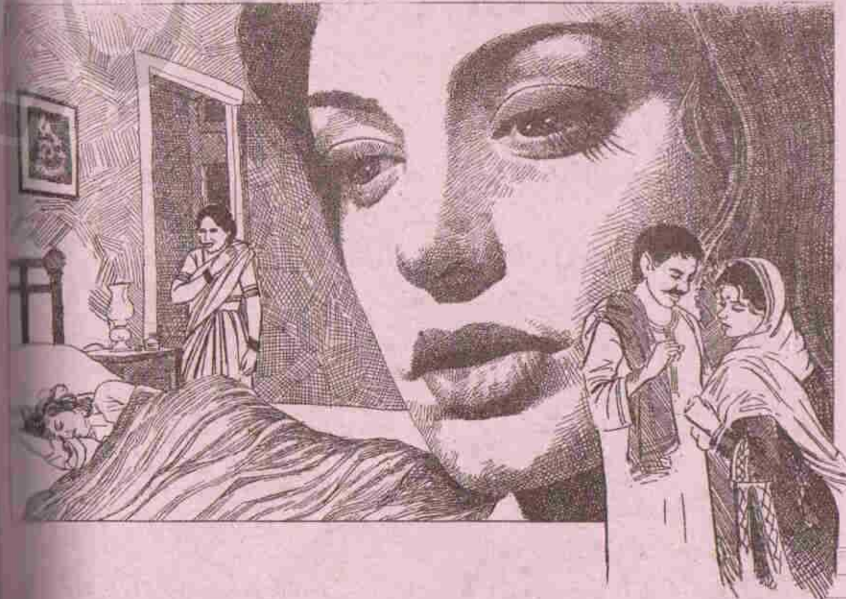
شاداب صدیقی کا خیال

تجربے سے تو یہی بات ہوئی ہے ثابت
آگ بونے سے تو شعلے ہی اُگا کرتے ہیں

حرص، ہوس اور حسد کی فتنہ انگیزیاں اجاگر کرتی عبرت اثر کہانی

دسمبر کے مہینے کا آخری ہفتہ تھا‘ سردی یکلخت بڑھ گئی تھی۔ شائستہ بانو لحاف میں دبکی بیٹھی سوچوں میں گم تھیں۔ ذہن مختلف خیالات کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی سوچ کا محور صفدر حیات اور اس کی جائیداد تھی۔

’صفدر حیات کی ساری زمینیں اور جائیداد روحیل حیات کے حوالے کر دوں...... نہیں‘ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ آخر صفدر حیات کی منظورِ نظر ساجدہ ہی ٹھہری اور میں جس نے اپنی پوری زندگی اس کی محبت پر نچھاور کر دی‘ اسے میرا اور میری بیٹیوں کا



وجود دکھائی نہ دیا۔ چند سال کا ساتھ دینے والی ساجدہ اور اس کا بیٹا مجھ سے زیادہ اہم ہو گئے۔‘ وہ جتنا اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتی‘ اتنا ہی الجھتی جاتی۔ آخر سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ آ گیا۔

پتہ نہیں‘ یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا تھا؟ زندگی اس کے لیے پھولوں کی سیج نہ سہی تو ایسی مشکل بھی نہ تھی کہ یوں اس کو صدمے سے گزرنا پڑتا۔ شائستہ بانو کم عمر تھی‘ تب اس کی شادی پھوپھی زاد صفدر حیات سے ہو گئی تھی جسے وہ بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی اور اس کے ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئی تھی۔

شائستہ بانو کے بھائی شہر میں پڑھ رہے تھے۔ صفدر حیات بھی ان کے ساتھ وہیں کالج میں پڑھ رہا تھا۔ بی اے کرتے ہی صفدر کی شادی کر دی گئی۔ اکلوتا ہونے کے ناتے اسے باپ‘ دادا کی زمینیں ورثے میں ملی تھیں۔

صفدر حیات کی بیوی بن کر شائستہ کو ہر وہ خوشی ملی جس کی اس نے تمنا کی تھی۔ اس کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات تھی۔ زندگی اس قدر خوبصورت ہو گی‘ اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ وقت اپنی پرواز میں محو تھا اور وہ تین بیٹیوں کی ماں بن گئی۔ اگرچہ بار بار بیٹیاں ہونے سے وہ بے حد پریشان تھی لیکن صفدر اپنی بیٹیوں کو اپنا بخت کہتا تھا اور یہ سچ بھی تھا کیونکہ ہر بیٹی کی پیدائش پر اس کی فصل مزید اچھی ہوتی تھی مگر شائستہ تیسری بیٹی کی پیدائش پر فکرمند ہو گئی تھی۔

”مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں آپ کو بیٹا نہ دے سکی۔“ اس نے غم زدہ لہجے میں کہا تھا۔

”آخر آپ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں۔ نسل بیٹی سے تھوڑی چلتی ہے۔ آج نہیں تو کل آپ کو اس کمی کا احساس ہو گا۔“

”دیکھو شائستہ......! بیٹی کی خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اولاد تو عطا کی ہے‘ کم از کم بے اولاد تو نہیں رکھا۔“

”صفدر‘ آپ کہیں بیٹے کی خواہش میں دوسری شادی تو نہیں کر لیں گے؟“ شائستہ بانو کے اندر کا خوف غالب آ گیا۔

”کیسی پاگلوں والی باتیں کر رہی ہو؟“ صفدر نے اسے پیار سے ڈانٹا۔

بیٹیاں‘ صفدر کے لیے واقعی خوش بخت ثابت ہوئی تھیں۔ چند سالوں میں ہی وہ اپنے قصبے کا بڑا زمیندار بن گیا تھا۔ اس کے پاس ٹریکٹر‘ ٹیوب ویل‘ تھریشر غرض کہ سارے زرعی آلات تھے۔ کھاد اور زرعی ادویات کی اس کی اپنی ایجنسی تھی۔ صفدر کی شادی چونکہ کم عمری میں ہی ہو گئی تھی اس لیے بیٹیوں کے جوان ہونے کے باوجود وہ اتنی عمر کا دکھائی نہ دیتا تھا۔

بڑی بیٹی فرسٹ ایئر میں تھی‘ تب اس کے اندر بیٹے کی خواہش جاگی۔

”شائستہ! پتہ نہیں کیوں میرے دل میں ایک بیٹے کی خواہش جاگنے لگی ہے۔ کاش میرا بھی بیٹا ہو جو میری جائیداد کا وارث بنے‘ میری زمینوں کو سنبھالے۔ تم شہر چل کر کسی لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کرواؤ‘ کیا پتہ‘ اس بار ہماری دُعائیں قبول ہوں اور بیٹا پیدا ہو۔“

”صفدر......! ہماری بیٹیاں بڑی ہو رہی ہیں‘ اتنے سالوں سے ہمارے یہاں مزید اولاد نہیں ہوئی‘ یقیناً اس میں خدا کی کوئی مصلحت ہو گی۔ خدا کو بیٹا دینا ہوتا تو پہلے ہی دے دیا ہوتا۔“ شوہر کی خواہش پر شائستہ بانو کا دل مستقبل کے اندیشوں سے دہل گیا تھا۔

”دیکھو‘ میں کوئی ناجائز خواہش تو نہیں کر رہا؟ تم ایک بار ڈاکٹر کے پاس تو چلو۔“ شائستہ بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اگلے دن صفدر حیات اسے علاج کے لیے شہر لے گیا' وہاں پر اس کے کچھ ٹیسٹ ہوئے' رپورٹیں دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے فیصلہ سنا دیا کہ چند طبی وجوہات کے باعث شائستہ آئندہ ماں نہیں بن سکے گی۔ لیڈی ڈاکٹر کے الفاظ ہتھوڑا بن کر اس کے کانوں پر برسے تھے۔ اس سے زیادہ صدمہ صفدر حیات کو پہنچا' اس کی ایک آس جو بیٹا پیدا ہونے کی تھی' وہ بھی ختم ہوگئی۔

''شائستہ......! میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔'' ایک دن اچانک صفدر حیات نے انکشاف کیا تھا۔

''کیا......؟ اب جبکہ آپ کی بیٹیاں جوان ہیں اور جلد ہی ان کی شادیاں ہونے والی ہیں' آپ کو اپنی شادی کی سوجھ رہی ہے؟''

''شائستہ' مجھے وارث چاہیے' میں جائز مقصد کے لیے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے نہیں روکو گی۔''

''آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے مقدر میں بیٹا لکھا ہے؟ دوسری بیوی سے بھی آپ کے بیٹیاں ہی ہوئیں تو......؟ آپ کو شادی کی اجازت دے کر میں خواہ مخواہ اپنی جنت اپنے گھر کو دوزخ بنانا نہیں چاہتی۔'' وہ قدرے غصے سے چلائی۔

''میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے' شادی تو مجھے کرنی ہی ہے' چاہے تم مجھے اجازت دو یا نہ دو' ویسے تو تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتی تھیں جبکہ محبت قربانی کا تقاضہ کرتی ہے۔ میں نے تمہاری محبت کے لیے اپنی دلی خواہش کا اظہار نہیں کیا ورنہ کون سا انسان ہے جو یہ چاہے گا کہ اس کی نسل اس کے ساتھ ختم ہو جائے؟ دوسری شادی میرا حق ہے اور مجھے مذہب کی طرف سے اس کی اجازت بھی ہے اور پھر مالی حیثیت بھی ایسی ہے کہ دو کیا' چار بیویوں کو بھی ٹھیک ٹھاک رکھ سکتا ہوں' سمجھیں؟'' صفدر نے اٹل لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ شائستہ بانو ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔ اس کے اندر عجیب کشمکش ہونے لگی۔ کئی راتوں کے رت جگے اور ذہنی کشمکش کے بعد آخر وہ ہار گئی۔

•......•......•

''صفدر' آپ دوسری شادی کر لیں' آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے جسے آپ اپنی دوسری بیوی بنانا چاہتے ہوں؟''

''میرا دوست سکندر جو شہر میں رہتا ہے' اس نے اپنی کزن کا ذکر کیا تھا۔ میں سوچ رہا ہوں' اس سے اس سلسلے میں بات کروں۔''

''آپ نے اس کی کزن کو دیکھا ہے؟ کیا وہ آپ کو پسند ہے؟''

''دیکھا تو ہے' پسند' ناپسند میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

''میں سمجھتی ہوں' شہری لڑکی یہاں کے ماحول میں سیٹ نہیں ہو پائے گی۔ آپ گاؤں کی کسی لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں' میں خود آپ کے لیے لڑکی ڈھونڈوں گی۔'' شائستہ بانو کے اندر کا خوف جاگا۔ اگر صفدر کسی شہری لڑکی سے شادی کر لیتا تو وہ اس پر حاوی ہو جاتی جو شائستہ بانو کو کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے' تم جلد سے جلد لڑکی ڈھونڈو' میں دوسری شادی فوراً کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ فیصلہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔'' ان الفاظ پر شائستہ بانو کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی مگر وہ کچھ نہ بولی۔ اسے صفدر سے محبت تھی' بے پناہ محبت......اور وہ اپنی محبت میں شراکت برداشت نہیں کر سکتی تھی مگر وہ مجبور تھی۔

اس نے لڑکی کی تلاش شروع کر دی' یہ شاید اس کی زندگی کا سب سے اذیت ناک مرحلہ تھا مگر وہ صفدر کی محبت میں اس اذیت کو برداشت کرنے پر مجبور تھی۔

ساجدہ گاؤں کے معمولی کسان کی بیٹی تھی' بہت

خاموش طبع اور خوبصورت' وہ اپنی تین بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس نے فضل دین اور اس کی بیوی سے رشتے کی بات کی۔

''میں دو تین روز بعد تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی۔''

فضل دین بہ خوشی یہ رشتہ کرنے پر تیار ہو گیا۔ صفدر حیات جیسا شریف اور دولت مند داماد تو قسمت والوں ہی کو ملتا ہے' ویسے بھی گاؤں میں تو کم عمر لڑکیوں کی شادیاں ستر سالہ بوڑھوں سے ہو جاتی تھیں جبکہ صفدر حیات تو محض بیالیس سال کا تھا اور اچھی شکل وصورت اور خوش حالی کی وجہ سے پینتیس سے زیادہ کا نہ لگتا تھا۔

وہ شوہر کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی مگر رات کی تنہائی میں اس کے دل سے بس یہی صدا نکلتی کہ کاش' صفدر دوسری شادی سے انکار کر دے۔ کاش' یہ شادی نہ ہونے پائے۔ اس نے ساجدہ کے لیے بَری کے زیور اور کپڑے خریدے۔ اس کے لاشعور میں کہیں تھا کہ وہ غریب گھر کی لڑکی کو اپنی سوکن اس لیے بنا رہی ہے تاکہ اس پر حاوی رہے۔

جس دن عروسی جوڑا تیار ہو کر آیا' سرخ جھلملاتے سوٹ کو دیکھ کر اس کی نظروں میں وہ دن گھوم گیا جب پھوپو اس کا عروسی جوڑا دکھانے کے لیے لائی تھیں۔ اس کے دل میں جیسے جلترنگ سے بج رہے تھے۔ عجیب سے مستقبل کے سہانے سپنوں میں وہ کھوئی جا رہی تھی۔ وہ اس خیال کے تحت رونے لگی کہ اب صفدر اس کا نہیں رہا۔

''کیا ہوا تمہیں؟'' صفدر اچانک کمرے میں آ گیا۔

''صفدر! پلیز' مجھے خود سے جدا نہ کریں' آپ دوسری شادی نہ کریں۔''

''کس نے کہہ دیا کہ میں تم سے جدا ہو رہا ہوں؟ تمہاری جگہ میں کسی اور کو نہیں دے سکتا' تم میری پہلی بیوی اور محبت ہو' ساجدہ تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔'' صفدر نے تسلی دی۔

''آپ محض میرا دل رکھنے کے لیے یہ کہہ رہے ہیں' شادی کے چند دن بعد ہی آپ مجھ سے بے زار ہو جائیں گے۔''

''تمہیں چھوڑنا ہوتا تو کب کا تم سے جان چھڑا چکا ہوتا۔ میں چار شادیاں بھی کر لوں پھر بھی تمہاری جگہ میرے دل میں رہے گی۔ چلو اب مسکرا دو۔'' صفدر نے محبت سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا اور وہ بے دلی سے مسکرا دی۔

صفدر حیات کی دوسری شادی والا دن اسے کل کی طرح یاد تھا' پوری رات وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی تھی اور اپنے مقدر کو موردِ الزام ٹھہراتی رہی تھی کہ اگر اس کے مقدر میں اولادِ نرینہ ہوتی تو آج یہ نہ ہوتا۔

پھر زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی۔ صفدر نے اسے پہلے والے مقام پر رکھا ہوا تھا جب روحیل پیدا ہوا تو خوشی سے صفدر کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس وقت شائستہ بانو کو ساجدہ سے شدید

آسرا

تری راہ تکتے تکتے
دھندلا گئی مری آنکھیں
اے بچھڑنے والی
اک بار تو آجا
اور نہیں آنا تو
بس وعدہ ہی کر لے
بس ترے انتظار میں
ساری زندگی، تنہا گزار دوں گا

وفا صدام حسین غازی

نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اب وہ آہستہ آہستہ ساجدہ سے متنفر ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں اس خیال نے جڑ پکڑلی تھی کہ روحیل کی شکل میں خاندان کا نام لیوا مل چکا ہے۔ اب صفدر کو ساجدہ کی کیا ضرورت ہے؟ ساجدہ اس کی دنیا میں ایک فالتو چیز سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ ساجدہ نے اسے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ اس کے ہر حکم پر سر جھکاتی اور ادب کرتی تھی مگر اس کا ہر عمل شائستہ کو ناگوار گزرتا تھا پھر جب اس نے سنا کہ ساجدہ پھر امید سے ہے تو غصے کے مارے اس کا برا حال ہو گیا' اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ وہ کیوں حسد کا شکار ہو رہی ہے؟ اس کے دل میں تو بس یہی خیال تھا کہ ساجدہ کو تو صرف اس گھر کی نسل بڑھانے والے کو پیدا کرنے کے لیے لایا گیا تھا' اب جبکہ یہ مقصد پورا ہو چکا تھا تو صفدر اس کی محبت کا دم کیوں بھرتا تھا؟ وہ اپنی محبت کے زعم میں بھول گئی تھی کہ وہ بھی اس کی منکوحہ تھی۔ کوئی رکھیل تو نہ تھی کہ جسے بیٹا پیدا کر کے وہ رخصت کر دیتا۔

''یہ میں شہر سے کپڑے لایا ہوں' پورے چھ سوٹ ہیں' ان میں سے تین تم پسند کر لو۔'' صفدر نے رنگ برنگے کپڑوں کا شاپر اسے تھمایا۔

''تین ہی کیوں؟ یہ سارے کپڑے میرے ہیں۔'' اس کی اندرونی نفرت غالب آ گئی۔

''تم یہ کیوں بھول جاتی ہو' میری لائی ہوئی ہر چیز میں ساجدہ برابر کی حصے دار ہے؟''

''کیسی حصے داری؟ آپ نے اس سے شادی بیٹے کے لیے کی تھی' اب آپ کا مقصد پورا ہو گیا ہے' اسے چلتا کریں۔'' وہ ایک دم پھٹ پڑی۔ صفدر حیات اس کے نئے روپ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں' بلاوجہ حسد کا شکار ہو رہی ہو؟ ساجدہ نے آج تک مجھ سے تمہاری کوئی برائی نہیں کی۔''

''جانتی ہوں اس کو...... کتنی گھنی ہے...... مجھے تم سے دور کر دیا...... اندر ہی اندر مجھ سے خار کھاتی ہے' اوپری دل سے مسکراہٹ سجا کر رکھتی ہے' میرا بس چلے تو اسے چوٹی پکڑ کر گھر سے باہر کر دوں۔''

''پلیز شائستہ' غصے کو کنٹرول کرو' تمہارے اس طرح لڑنے جھگڑنے سے گھر کا ماحول خراب ہو گا۔''

''ہونے دو...... ساجدہ کی منحوس شکل دیکھ کر ایک دن میں ذہنی مریضہ بن جاؤں گی۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ صفدر کمرے سے باہر نکل گیا۔

گھر کے ماحول میں عجیب سا تناؤ آ گیا تھا۔ صفدر نے گھر کے ماحول کو ٹھیک کرنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود......

ایک روز ساجدہ کی طبیعت اچانک بگڑ گئی' اس نے مردہ بیٹے کو جنم دیا۔ شائستہ بانو کے دل کو عجیب سی تسکین ملی۔ اس کی بددعاؤں نے اثر دکھایا تھا۔ اس دوران وہ اپنی بیٹیوں کی شادیوں میں مصروف ہو گئی۔ دونوں بڑی بیٹیوں کی شادیاں اس نے اپنے بھائی کے بیٹوں سے کر دیں۔ تیسری بیٹی کی منگنی اس نے اپنی بہن کے بیٹے سے کر دی پھر وہ قیامت کا دن آ ہی گیا جب صفدر فصل کی کٹائی کے لیے زمینوں پر گیا ہوا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑ گیا اور وہاں سے اس کا جسدِ خاکی لایا گیا۔ صفدر کی موت سے اسے سخت ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔ اسے تو ہوش اس وقت آیا جب کئی روز گزرنے کے بعد وکیل نے اس سے ملاقات کا وقت مانگا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' اتنی وسیع جائیداد میں میرا اور میری بیٹیوں کا برائے نام حصہ ہے' سب کچھ روحیل کا ہے؟''

''میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے وصیت نامہ آپ کو پڑھ کر سنا دیا ہے۔ مرحوم نے دو مہینے پہلے ہی یہ وصیت نامہ تیار کروایا تھا۔''

''ہونہہ...... میری محبت کے دعوے دار نے سب کچھ تو اس کلموہی کے بیٹے کو دے دیا۔ خیر' میں بھی اپنی بچیوں کا حق لے کر رہوں گی۔' شائستہ بانو نے دل میں سوچا۔

یہ ذرا سا لوتھڑا جسے دل کہتے ہیں' جب بدی پر آ جائے تو کچھ بھی نہیں بچتا' شیطانیت غالب آ جاتی ہے۔ شائستہ بانو نے اپنے بھائی کو بلوا لیا تھا' ان کی مدد سے اس نے ایک خطرناک منصوبہ بنایا' اس نے غنڈوں کے ذریعے ساجدہ اور روحیل کو اغوا کروا کر ان کا کام تمام کروا دیا۔ اب وہ اندر سے بے حد خوش اور مطمئن تھی کہ ساری جائیداد کی مالک وہ اور اس کی بیٹیاں ہیں مگر دنیا دکھاوے کے لیے اس نے ساجدہ اور روحیل کے مسخ شدہ جسدِ خاکی کو دیکھ کر آنسو بہائے تھے۔

''ہائے...... ہائے...... میرے شوہر کا وارث' نام لیوا اس دنیا سے چلا گیا۔ اسی کی خاطر تو میں نے یہ قربانی دی تھی' سوکن کا وجود خوشی خوشی برداشت کر لیا تھا۔ جانے کون ظالم لوگ تھے جنہوں نے دولت کے لیے میری کوکھ اجاڑ دی؟'' شائستہ بانو کے بین سن کر لوگ دہل گئے تھے۔ اسے تسلیاں دے رہے تھے مگر اسے تو غش پہ غش آ رہے تھے۔

دہرے قتل کے اس کیس کی تفتیش میں پولیس نے محض کاغذی کارروائی کی اور پھر کچھ دن بعد ہی کیس ٹھنڈا ہو گیا۔

•......•......•

شہداد پور میں شائستہ کے میکے کے قریبی رشتے داروں میں شادی تھی۔ اس کی دونوں شادی شدہ بیٹیاں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ شائستہ کے پاس آئی ہوئی تھیں' ان سب کا ارادہ اکٹھا ہو کر شادی میں

اپنی بہن کے لیے

اس عید پہ چھٹی مل جائے' اس بار جو ملنے میں آؤں
پیاری بہن! بتا دو نا' تمہارے لیے میں کیا لاؤں؟

کنگن جو میں نے لیے ہیں' رنگ برنگے نگ بھی جڑے ہیں
اک بھالو بھی لے رکھا ہے' کان بھی جس کے بہت بڑے ہیں

لو بھلا ناراض تم ہو گئیں' بھالو سے کیا کھیلو گی؟
تم ہو نازک کانچ کی گڑیا' گڑیا سے تو بہلو گی

بالآخر وہ وقت بھی آیا' اب تم کو رخصت ہونا ہے
دیکھو' میرے گلے سے لگ کر تھوڑا سا ہی رونا ہے

جاؤ میری پیاری بہنا! یونہی سدا آباد رہو
ہے یہ دعا اک بھائی کی' گھر میں اپنے شاد رہو

لیکن یہ تقدیر نے کیسا یکدم تم پہ وار کیا؟
تم تھیں بے حد نازک سی' تم کو کیوں بیمار کیا؟

اک تھی قیامت جو قیصر اس دل پر میرے بیت گئی
وہ پہلے مجھ سے چلی گئی' اس بار بھی یعنی جیت گئی

قیصر پرویز راجپوت

جانے کا تھا۔

"امی...... میرا تو بالکل موڈ نہیں ہو رہا، آپ اور باجیاں شادی میں شرکت کر رہی ہیں۔ اب کیا ضروری ہے کہ میں بھی چلوں؟" شائستہ بانو کی چھوٹی بیٹی فائزہ بولی۔

"ارے، یہی تو موقع ہوتا ہے کہ اس بہانے سب سے ملاقات ہو جاتی ہے ورنہ اب کہاں کوئی کسی سے ملنے جاتا ہے؟"

"امی...... میرا بالکل بھی موڈ نہیں بن رہا۔"

"تم بناؤ گی تو بن جائے گا، ویسے بھی میں یہاں تمہیں حویلی میں اکیلی نہیں چھوڑ سکتی، مجھے کسی ملازم پر اعتبار نہیں رہا، تمہارے باپ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا، اسے دیکھ کر مجھے کسی پر بھروسہ نہیں رہا۔" وہ بڑبڑائی۔

"اچھا بھئی، میں چلوں گی، آپ خواہ مخواہ ٹینشن لینے لگیں۔"

شادی سے دو دن پہلے وہ شہداد پور کے لیے ٹرین میں روانہ ہوئے تھے۔ گھر سے وہ خوشی خوشی نکلے تھے۔ اس شادی کے لیے انہوں نے بھرپور تیاریاں کی تھیں، بالکل اس طرح جیسے ان کے گھر کی شادی ہو مگر کسی کو کیا پتہ تھا کہ قدرت کو کیا منظور تھا؟ ان کا سفر جاری تھا کہ اچانک ٹرین حادثے کا شکار ہو گئی، بہت سے لوگوں کی طرح شائستہ بانو اور اس کا خاندان بھی ناگہانی موت کا شکار ہو گیا، کٹی پھٹی لاشیں اور ناقابل شناخت جسم لاوارثوں کی طرح ہر سو بکھرے ہوئے تھے۔

شائستہ بانو کے بھائی اور بہنوں کو جب اس حادثے کی اطلاع ملی تو وہ دھڑکتے دل کے ساتھ فوراً جائے حادثہ پر پہنچے تھے۔

دس لاشوں کو ایک ساتھ لے کر آنا جن میں بچے بھی شامل تھے، بڑے دل گردے کا کام تھا۔ بھائی اور بھاوج خود صدمے سے دوچار تھے۔ بیٹے، بہو کے ساتھ ان کے پوتا پوتی بھی اس دنیا سے گزر گئے تھے۔ پھول سے وہ معصوم بچے جو دادا دادی کی جان تھے، جب یہ سب جنازے اٹھے تو ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ ہر ایک تڑپ رہا تھا۔ دیکھنے والے بھی آہ و بکا کر رہے تھے۔

شائستہ بانو کا بھائی ایک طرف خاموش کھڑا پنڈال میں رکھی ہوئی لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ حویلی کا پھاٹک کھلا ہوا تھا، لوگ آ جا رہے تھے، آخری منزل کی تیاری تھی کہ اچانک اس نے کھڑے کھڑے قہقہہ لگانا شروع کر دیا۔

"اب یہ ساری جائیداد میری ہے...... میں ہی اس کا وارث ہوں...... میں نے سب کو مار دیا......"

اس نے اپنے بالوں کو نوچنا شروع کر دیا، سر کو دیوار میں مارنے لگا۔

"ارے پکڑو...... بے چارے کفیل بھائی کا دماغ اس صدمے سے بگڑ گیا ہے......" کوئی چلایا۔

"خدا کسی کو ایسا دن نہ دکھائے، بے چارے کا پورا خاندان ختم ہو گیا......" دوسری آواز ابھری۔

لوگ کفیل کو پکڑ کر کمرے میں لے گئے مگر وہ ہوش و حواس سے ہمیشہ کے لیے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اپنے بیٹوں کے روشن مستقبل کے لیے اس نے شائستہ بانو کے کہنے پر ساجدہ اور روحیل کو موت کے گھاٹ اتروایا تھا۔ آج وہ خود قدرت کے مکافات عمل کا شکار ہو گیا تھا۔

یہ کہانی اس غنڈے کی زبانی میرے علم میں آئی ہے جو ساجدہ اور اس کے بیٹے روحیل کے قتل میں شریک تھا۔ وہ غنڈہ بھی آج مکافات عمل کا شکار ہو کر ایسی عجیب و غریب بیماری میں مبتلا ہے کہ زندہ لاش بن گیا ہے۔ وہ قدرت سے موت مانگتا ہے مگر اسے موت نہیں ملتی......

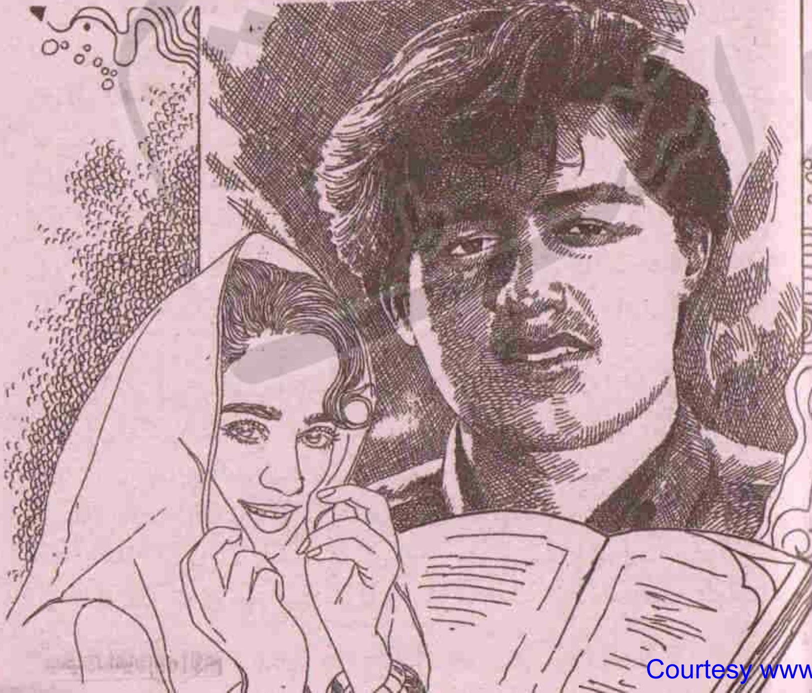
سدرہ انور علی

یہ فتنہ ہے

سعدیہ حریم کا خیال

اک عجیب سا احساس ذہن و دل پہ طاری ہے
مثلِ پارۂ بے تاب کیفیت ہماری ہے

موبائل خانہ خراب سے پھوٹتی ایک لڑکی کی جاں گسل عبرت ناک کہانی



جس تیزی سے دور بدلا ہے' اسی طرح محبت کرنے کے طور بھی تبدیل ہوتے جا رہے ہیں' اب کسی نوجوان کو کسی لڑکی کا پیچھا کرنے کی نوبت نہیں آتی نہ ہی اب گرلز کالج یا اسکول کے باہر کسی لڑکی کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور نہ محبت نامے لکھنا پڑتے ہیں۔ اب تو موبائل فون نے گھر کی تمام حدود و قیود تہہ و بالا کر کے رکھ دی ہیں۔ ایک وہ بھی دور تھا جب لڑکیوں کو گھر کا فون اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی اور آج ہر لڑکی اور لڑکے کے پاس موبائل فون دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس پر مستزاد' موبائل کمپنیوں کے سستے کال پیکیجز نے نوجوانوں کو ایسی راہ کا مسافر بنا دیا ہے جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں رات بھر جاگ کر اپنے سفلی جذبات کی تسکین کرتے ہیں اور اسے محبت کا نام دیتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب لڑکی کی نگاہیں حیا کے بوجھ سے جھکی ہوتی تھیں لیکن آج ان کی آنکھوں میں بے حیائی کے رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان موبائل فون محبتوں کے بطن سے ایسی ایسی کہانیاں جنم لے رہی ہیں کہ الامان الحفیظ! دل لرز کر رہ جاتا ہے کہ ہمارے اردگرد کیا ہو رہا ہے؟ زیرِ نظر کہانی بھی ایک ایسی ہی لڑکی کی بربادی کی کہانی ہے جو موبائل فون ٹائپ محبت کے ہاتھوں تباہ ہو کر پچھتاوے کی آگ میں جل رہی ہے۔ اس کہانی کو اسی حرماں نصیب کی زبانی سنیے اور عبرت حاصل کیجیے۔

............*

میرا نام شیرین ہے۔ میرے ابو عبدالرحمان نے دو شادیاں کی تھیں اور میں اپنے ابو کی پہلی بیوی کی پہلی اولاد تھی۔ میں اس وقت دس برس کی تھی جب میرے ابو نے دوسری شادی کی تھی' تب تک میرے دو بھائی اور دو بہنیں بھی اس دنیا میں آ چکے تھے۔ ابو کی دوسری بیوی سے چھ بچے ہوئے تھے' یوں ہم گیارہ بہن بھائی تھے' تاہم سوتیلے ہونے کے باوجود ہماری آپس میں بہت محبت تھی۔ تمام بچے دونوں ماؤں کی عزت کرتے تھے اور انہیں ماں کہتے تھے۔ میرے ابو کٹر مذہبی تھے' شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ دونوں بیویوں کو یکساں توجہ دیتے' یوں ہمارا گھر جنت کا نمونہ تھا۔ لوگ ہمارے گھر کی مثال دیا کرتے تھے۔ میں ان دنوں میٹرک میں پڑھتی تھی لیکن مجھے لکھنے پڑھنے کا اتنا شوق نہیں تھا جتنا دلہن بننے کا تھا۔ میں ہر وقت ان ہی خیالوں میں گم رہتی کہ میری زندگی میں بھی کوئی ایسا ہو جو مجھے ٹوٹ کر چاہے حالانکہ میری پرورش ایسے مذہبی ماحول میں ہوئی تھی جہاں اس قسم کی باتوں کا تصور ہی گناہ تھا پھر بھی نہ جانے کیوں میرا دل ایک اَن دیکھے شخص سے محبت کرتا تھا۔ میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی چنانچہ اب مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی سوائے پڑھائی کے' میں بلاوجہ باہر نہیں جا سکتی تھی مگر میں اپنے تصور میں کھوئی رہتی تھی۔ دل کی دنیا بہت خوبصورت ہوتی ہے اور میرے دل میں تو ایک انجانا' نا آشنا چہرہ بسا ہوا تھا اور میں اسی کے خیالوں میں کھوئی رہتی۔ گرمیوں کی راتوں میں چاند کا خاموش سفر مجھے بے چین کر دیتا تھا اور میں تکیے کو اپنے آنسوؤں سے بھگو دیتی تھی۔ گھر میں دس بہن بھائیوں' دو ماؤں اور باپ کی موجودگی کے باوجود میں خود کو تنہا' اکیلا اکیلا سا محسوس کرتی تھی۔

ایک روز میں اسکول سے واپس آ رہی تھی' میرے ساتھ دو اور لڑکیاں بھی تھیں۔ چلتے چلتے مجھے لگا جیسے کوئی ہمارے تعاقب میں ہے۔ بار بار مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ضرور کوئی ہے جو ہمارے پیچھے ہے۔ میں نے اچانک پلٹ کر دیکھا تو ایک بہت ہی خوبصورت' سجیلا نوجوان ہمارے پیچھے تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ مسلسل ہمارے پیچھے تھا' دوسری دونوں لڑکیوں نے تو کوئی نوٹس نہ لیا تھا پھر وہ میرے برابر سے گزر کر آگے چلا گیا۔ وہ کئی دن تک میرے پیچھے آتا رہا' اس کا پیچھا کرنا مجھے ناگوار نہیں گزرتا تھا بلکہ مجھے تو اس کا انتظار رہتا تھا۔ اگر کسی روز وہ نظر نہ آتا تو دل بہت بے چین ہو جاتا۔

ایک روز میں اکیلی ہی کالج سے نکلی تھی۔ وہ لڑکیاں میرے ساتھ نہیں تھیں۔ جیسے ہی چھٹی کی بیل ہوئی' میں جلدی سے باہر آ گئی تھی۔ وہ گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ مجھے اکیلا دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں پھر وہ میرے پیچھے چل پڑا۔ تھوڑا آگے جا کر جب میں ایک گلی میں مڑی تو اس نے مجھے موبائل فون دکھایا اور پھر میرے قریب آ گیا۔

''سنیے' یہ موبائل آپ رکھ لیں' اس سے ہم بات کریں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے موبائل پکڑا دیا۔ ''رات کو کال کروں گا۔''

میں نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے موبائل لیا تو وہ چلا گیا اور میں کھڑی رہ گئی۔ مجھے تو موبائل استعمال کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ گھر آ کر میں نے موبائل چھپا کر رکھ دیا۔ شام چار بجے اٹھایا تو کال آ رہی تھی۔ میں نے بدحواسی میں کال اٹینڈ کی۔

''السلام علیکم! میرا نام عدنان ہے۔'' ایک خوبصورت آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ ''میں نے کہا تھا کہ رات کو کال کروں گا لیکن مجھے تو ایک پل بھی چین سکون نہیں ہے۔ جب سے آپ کو دیکھا ہے' بس آپ کا دیوانہ سا ہو گیا ہوں' دل چاہتا ہے' ہمیشہ آپ سے بات کرتا رہوں اسی لیے رات تک کا انتظار نہ کر سکا اور آپ کو کال کر دی۔ آپ ڈسٹرب تو نہیں ہوئیں؟''

اس کی باتوں پر میں ایسی گھبرائی کہ میرے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔

''آپ بول کیوں نہیں رہیں؟ پلیز' کوئی بات تو کریں۔''

''جج...... جی......'' میں بمشکل اتنا ہی کہہ پائی۔

''شکر ہے' آپ نے کچھ بولا تو سہی۔ دیکھیے' میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں' میرا دل آپ کی طرف مائل ہے۔'' وہ باتیں کر رہا تھا اور میں اس کی باتوں کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے دل کی مراد یوں پوری ہو گی۔ اس طرح ہماری محبت کا آغاز ہو گیا' ہم روزانہ گھنٹوں بات کرتے تھے' اس دوران اس نے مجھے موبائل کے استعمال کا طریقہ بھی سمجھا دیا تھا اور میں موبائل کو سائلنٹ پر رکھتی تھی اسی لیے میرے پاس موبائل کی موجودگی کا گھر والوں کو علم نہیں ہوا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتی کہ کوئی ہے جو مجھے اس قدر چاہتا ہے' میرے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا اور میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ ابو مجھے کالج بھیجنا نہیں چاہتے تھے جبکہ عدنان کا اصرار تھا کہ میں کالج میں ایڈمیشن لوں لہٰذا میں نے ضد کرنا شروع کر دی کہ مجھے کالج جانا ہے مگر ابو کسی طور راضی نہیں تھے چنانچہ دونوں ماؤں سے سفارش کروائی بالآخر ابو نے اجازت دے دی۔

انہوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ''بیٹی! جتنا پڑھنا چاہتی ہو' پڑھو لیکن اتنا یاد رکھنا کہ تمہارے نام کے ساتھ میرا نام آتا ہے' تم میری بڑی بیٹی ہو' میرے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچانا۔'' میں نظریں جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی اور سر ہلاتی رہی لیکن میرے دل میں جو ایک چاہنے والا بس چکا تھا' میں اس کا کیا کرتی؟ پھر میں نے کالج جانا شروع کر دیا۔ عدنان سے باتیں تو روز ہی ہوتی تھیں لیکن

اب وہ مجھ سے ملنے کا اصرار کرنے لگا تھا جس پر میں انکار کر دیتی حالانکہ دل تو میرا بھی بہت چاہتا تھا اس سے ملنے کو مگر ابو کا خوف آڑے آ جاتا تھا۔ عدنان نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھ سے ہی شادی کرے گا۔

''شہرین' میں تمہیں ہی اپنی شریکِ حیات بناؤں گا۔'' اس کی باتیں بڑی سحر انگیز ہوتیں۔

''تمہارے سوا نہ کوئی میرے دل میں بسا ہے نہ بسے گا۔''

میں اس کی باتوں سے نہال ہو جاتی اور میرا دل خوشی سے جھوم اٹھتا۔ کھوئی کھوئی تو میں بچپن سے ہی تھی لیکن جوانی نے مجھے بولا کر رکھ دیا تھا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ابو میری بدلتی ہوئی حالت کا بغور جائزہ لے رہے ہیں۔

ایک رات جب سب سو گئے تھے' میں جاگ رہی تھی کیونکہ عدنان کی کال آنی تھی' تب ہی ابو کی آواز میرے کانوں میں آئی تھی۔ وہ امی سے مخاطب تھے۔

''بیگم صاحبہ' ہمیں آپ کی صاحب زادی کچھ بدلی بدلی لگتی ہیں' اس پر نظر رکھا کریں۔''

''حضور' میں کچھ نہیں جانتی۔'' امی کی لرزتی آواز سنائی دی تھی۔

''میں سوچتا ہوں' اب اس کے لیے یہ آنگن پردیس ہو رہا ہے۔''

''آپ مجاز ہیں' جو چاہیں' سو کریں۔''

''بیٹی پر نظر رکھا کرو' یہ عمر بہت نازک ہوتی ہے۔'' ابو کی بات پر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ باپ کی کھاگ نظریں بھانپ گئی تھیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اب ابو اٹھتے بیٹھتے مجھ پر نظر رکھتے تھے اور میں ان کی نظروں کی تاب نہ لا کر بدحواس سی ہو جاتی تھی۔ دوسری طرف مجھ سے ملنے کے لیے عدنان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔

''دیکھو شہرین' مجھ سے مل لو ورنہ میں مر جاؤں گا' صرف ایک بار مل لو۔'' فون پر اس کی بس یہی رٹ ہوتی۔

''یہ ممکن نہیں ہے عدنان' میں تم سے نہیں مل سکتی۔ میرے ابو بہت سخت ہیں۔ مجھے مجبور نہ کرو۔''

رات کو اس کی کال آئی تو پھر اس نے ملنے کا اصرار کیا۔ میرے انکار پر وہ رونے لگا۔ آخر میں نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور اس سے ملنے پر راضی ہو گئی۔

اگلی صبح میں کالج کے لیے نکلی ضرور تھی مگر کالج جانے کے بجائے عدنان کی بتائی ہوئی جگہ پر چلی گئی جہاں وہ پہلے ہی میرا منتظر تھا۔ یہ سب کرتے ہوئے میرا دل لرز رہا تھا' قدم ڈگمگا رہے تھے مگر عدنان کی محبت سے مجبور تھی' عدنان مجھے ایک عمدہ سے ریسٹورنٹ میں لے گیا جہاں چھٹی ٹائم تک ہم نے وقت گزارا۔ تمام وقت اس کا رویہ میرے ساتھ شائستہ رہا' اس نے مجھے چھوا تک نہیں۔ ہم نے جی بھر کے باتیں کیں پھر وہ مجھے کالج کے گیٹ پر چھوڑ کر چلا گیا۔ گھر پہنچتے ہی عدنان کی کال آ گئی۔

''شہرین' تم تو ملاقات سے یونہی ڈرتی تھیں' دیکھو' کچھ ہوا؟ میں اس ملاقات کو زندگی بھر نہیں بھلا سکتا' تم بہت اچھی ہو۔''

اسی طرح دن گزرتے رہے۔ اس اثناء میں ابو نے کچھ لوگوں کو میرے رشتے کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔ جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں پریشان ہو گئی۔

رات کو عدنان کی کال آئی تو میں نے فکر مندی سے کہا۔ ''عدنان...... کچھ کرو ورنہ کوئی اور مجھے لے جائے گا۔''

''میری جان' تم بالکل پریشان مت ہو' تم صرف میری ہو' تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ آج ہی میں امی سے بات کرتا ہوں۔ میں نے نیا گھر بنوایا ہے' چند دن بعد چل کر دیکھنا' وہ گھر تمہارا ہے' وہاں تم رہو گی اور مما سے بھی ملواؤں گا تمہیں' آؤ گی نا؟'' عدنان کی اس طرح کی مسحور کن باتوں میں کھو کر میں اپنی پریشانی بھول گئی۔ وہ باتیں ہی ایسی کرتا کہ میرا دل موہ لیتا تھا۔ تین دن بعد جب میں اس سے ملی تو اس نے مجھے اپنے گھر چلنے کے لیے کہا اور میں بنا سوچے سمجھے اس کے ساتھ چل پڑی۔ موبائل میرے پاس ہی تھا۔ اس کا گھر واقعی بہت شاندار تھا۔ میں اس کے گھر کی شان و شوکت میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ مجھے گھر کے ایک کمرے میں لے آیا۔

''شہرین' تم میرے روم میں بیٹھو' میں امی کو بلا کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر عدنان چلا گیا تو مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ ابھی چند منٹ ہوئے تھے کہ ایک چھوٹا سا لڑکا کوک لے کر اندر آیا اور ٹیبل پر رکھ کر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد عدنان اندر آیا' مجھے یونہی بیٹھا دیکھ کر کہا۔

''ارے...... کوک تو پیو' گرم ہو جائے گی۔ میں امی کے پاس گیا تھا' وہ سوئی ہوئی ہیں' ابھی کچھ دیر میں اٹھ جائیں گی۔'' اس نے کوک اٹھا کر مجھے پکڑائی۔

''عدنان...... آپ بھی پئیں۔''

''او جانی...... میں ابھی پی کر آیا ہوں۔'' اس نے مجھے کوک پلائی پھر ہم باتیں کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے مجھ پر خمار چڑھ رہا ہے' مجھے نیند آ رہی تھی' میرا سر ڈولنے لگا تھا۔ عدنان میری طرف ہی دیکھ رہا تھا' اس نے آگے بڑھ کر مجھے سہارے سے کھڑا کیا اور اپنا ہاتھ میری کمر میں حائل کر کے مجھے بیڈ پر لٹا دیا۔ اس کے بعد میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میرے ہوش اڑ گئے تھے کیونکہ میرا سب کچھ برباد ہو چکا تھا' میں برہنہ بستر پر لیٹی تھی اور میرے جسم پر جگہ جگہ نشان تھے' میں لٹ چکی تھی اور اپنا گوہر نایاب کھو چکی تھی۔ کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا' میں نے اٹھ کر فوراً لباس پہنا اور اپنی بربادی پر آنسو بہانے لگی۔ اب میں اپنے والدین کو کیا منہ دکھاتی؟ میری امی اکثر کہتی تھیں کہ کنواری لڑکی سے حیا کی خوشبو آتی ہے لیکن میں تو حیا باختہ ہو چکی تھی۔ ہائے میرے ابو......! ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ وہ خبیث عدنان جس نے مجھے برباد کیا تھا' اندر آیا۔

''کھانا کھا لو۔''

میں نے کھانا پرے پھینک دیا اور ہاتھ میں پکڑا موبائل اتنی شدت سے اس کے چہرے پر مارا کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔

''کمینے...... خبیث انسان...... میں تجھے چھوڑوں گی نہیں......''

میں نے شیشے کا گلدان اس کے سر پر جڑ دیا جس پر اس نے اتنی زور سے مجھے دھکا دیا کہ میں دیوار سے ٹکرائی۔

''کان کھول کر سن لے...... اب تجھے وہی کرنا ہوگا جو میں چاہوں گا...... اب ہر تیسرے روز تجھے یہاں آنا ہوگا ورنہ میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ تا قیامت یاد رکھے گی۔''

''ذلیل...... میں تیری شکل بھی دیکھنے کی روادار نہیں......''

''تو ضرور آئے گی' نہیں تو یہ دیکھ رہی ہے' یہ کیا ہے؟'' اس کے ہاتھ میں ویڈیو کیمرہ تھا۔ ''اس میں وہ سب کچھ محفوظ ہو چکا ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے ہوا ہے۔ یہ میں تیرے باپ مولوی عبدالرحمان کو

دکھاؤں گا کہ یہ سب تمہاری اس بیٹی کے کرتوت ہیں جسے تم گھر چھپا کر رکھتے ہو۔" اس نے خباثت سے ہنستے ہوئے کہا۔ میرے تو ہوش اڑ گئے اور میں لڑکھڑاتی ہوئی گر گئی۔ وہ میرے نزدیک بیٹھ گیا۔

"ہر تیسرے روز آ جانا' کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اگر نہ آئی تو میں وہی کروں گا جو کہا ہے۔"

"دیکھو خدا کا واسطہ' مجھے چھوڑ دو' میرے ساتھ ایسا نہ کرو۔"

"بس اب رونا دھونا بند کرو اور جیسا کہا ہے' وہی کرنا۔ تین دن بعد آ جانا' تمہیں اس کا معاوضہ بھی ملے گا۔" اس نے غراتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی بہت منتیں کیں لیکن اس نے میری کوئی بات نہ سنی اور میں گھر آ گئی۔ گھر میں سب کچھ ویسا ہی تھا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہر نظر مجھ پر ہے' سب مجھے غور سے دیکھ رہے ہوں۔ تین دن گزر گئے' میں اس کے پاس نہ گئی' چوتھے دن میں کالج جا رہی تھی کہ وہ خبیث میرے سامنے آ گیا۔

"یہ تمہارے ابو کو دینے جا رہا ہوں۔" اس نے ویڈیو فلم دکھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ڈرانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ میں کالج چلی گئی مگر کالج میں میرا دل بے کل سا رہا' یوں لگتا تھا جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہے۔ کالج سے چھٹی ہوئی تو میں نے ایک PCO سے پڑوسی کے نمبر پر کال کی اور کہا کہ رحمان صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟ دوسری طرف کا جواب مجھے مار دینے کے لیے کافی تھا۔

"رحمان صاحب کی ڈیتھ ہوئے دو گھنٹے ہو چکے ہیں' کسی صدمے سے انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" یہ الفاظ تھے یا بم کے گولے' میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اپنے باپ کی موت کی ذمہ دار میں تھی۔ ہائے میری ماں جس نے کبھی دروازے سے جھانکا تک نہیں' مجھ ناخلف نے اپنے باپ کو مار دیا تھا' اپنا گھر اجاڑ دیا تھا۔ اب میری ماں بھی نہیں جی سکے گی۔ اب میں کہاں جاؤں گی؟ گھر میں تو مجھے کوئی نہیں گھسنے دے گا۔ میں کس طرح اپنوں سے نظریں ملا پاؤں گی؟ میری دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اس سوچ میں' میں وہیں کھڑے کھڑے گر گئی۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو ایک عورت میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔

"بیٹا......! کیا ہوا؟ کون ہو تم؟" مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر اس نے پوچھا مگر میں جواب دینے کی بجائے یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ اس نے سمجھا' میں گونگی بہری ہوں چنانچہ وہ مجھے ایک مزار پر لے گئی اور اب میں اِسی مزار پر رہتی ہوں اور پل پل اس شیطان کو بددعائیں دیتی ہوں جس نے مجھے اجاڑا۔

"سدرہ باجی......! یہ تھی میری کہانی...... پلیز' آپ پڑھنے والوں سے التجا کریں کہ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو موبائل فون نہ لے کر دیں۔ یہ جدید دور کا ایسا فتنہ ہے جس نے جانے کتنے گھرانے تباہ کر دیئے ہیں اور کتنی ہی باعصمت بیٹیوں کو حیاباختہ بنا دیا ہے۔"

شہرین اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور میں حسرت و یاس سے اسے دیکھ رہی تھی اور میں کر بھی کیا سکتی تھی؟ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جن سے اس کے دل کو تسلی ملے؟ میں بے چارگی کے سے انداز میں وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تمام پڑھنے والی لڑکیوں سے بس اتنا ہی کہنا ہے کہ شریف صورت اور شیطان سیرت نوجوانوں سے ہوشیار رہیں۔ یہ نہ ہو کہ پھر کسی شہرین کی کہانی دہرائی جائے۔

پراسرار کہانیاں — عقل کو گُند کر دینے والی ایسی کہانیاں جن پر دل اور ذہن یقین نہیں کرتا

جاوید عثمان زندانی

زندگی سے گزر کر......

بشیر بدر کا خیال

وہ بجھے گھروں کا چراغ تھا یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو
اسے لے گئی ہے کہاں ہوا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

ایک معصوم بچی کی روح کا قصہ جو باپ کی تلاش میں بھٹک رہی تھی



ساحل کی سنسناتی ہوئی مست ہوائیں میرے بدن کو چھو رہی تھیں۔ ساحل سے ٹکراتیں سمندر کی موج در موج لہروں کا شور مجھے بے خود سا کر رہا تھا۔ ساحلی ہوا اور موجوں کا شور مجھے بچپن سے ہی پسند تھا، نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ سمندر مجھے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ جب بھی مجھے موقع ملتا، میں اکیلا ہی سمندر پر آ جاتا تھا اور گھنٹوں دنیا کے ہنگاموں اور تفکرات سے بے نیاز ہو کر شور مچاتے سمندر اور اس کی پراسرار لہروں میں گم ہو کر دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی میں ساحل کے نزدیک ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رات کے تقریباً دس بجے کا وقت تھا، چاندنی میں ڈوبا ہوا ملگجا سا اندھیرا سمندر کو اور دلکش بنا رہا تھا اور ساتھ ہی سن سن کرتی ہوئی ہوائیں ماحول کی دلکشی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور سمندر کی پراسراریت میں گم ہو گیا۔

''انکل، آپ نے میرے ابو کو دیکھا ہے؟''

اچانک ہی میرے کانوں سے ایک مدہم سی آواز ٹکرائی جو اس ماحول میں کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ میں بری طرح چونک گیا۔ وہ معصوم سی بچی اچانک ہی میرے سامنے آ گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دماغ سن ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے ہی میں نے دیکھا تھا، ساحل پر دور دور تک سناٹا تھا اور کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا مگر وہ اچانک ہی کسی آسیب کی طرح میرے سامنے آ گئی تھی۔ میں نے فوراً اپنے حواس پر قابو پایا اور اس بچی کی طرف دیکھا۔

وہ بہت ہی پیارے خدوخال کی معصوم سی لڑکی تھی جس کی عمر تقریباً سات، آٹھ سال کے درمیان ہو گی۔ وہ بالکل میرے عین سامنے کھڑی تھی۔ شکل سے وہ کافی تھکی ہوئی اور بیمار لگ رہی تھی۔ اس کی معصوم سی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کا جسم بھی کافی کمزور اور لاغر سا تھا۔

''نہیں بیٹا! میں نے تو تمہارے ابو کو نہیں دیکھا۔ تم کب سے انہیں ڈھونڈ رہی ہو؟'' میں نے اس کے معصوم سے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''انکل، مجھے یاد نہیں کتنا وقت ہو گیا؟ بس میں انہیں بہت دنوں سے ڈھونڈ رہی ہوں مگر میرے ابو مجھے مل ہی نہیں رہے۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''اچھا بیٹا! تم ایسا کرو، یہاں میرے پاس بیٹھ کر مجھے ساری بات بتاؤ پھر ہم دونوں مل کر تمہارے ابو کو ڈھونڈتے ہیں۔''

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھایا مگر...... میرا ہاتھ اس کے ہاتھ کو چھوئے بغیر اس طرح گزر گیا جیسے میں نے کسی سائے کو پکڑنے کی کوشش کی ہو۔ لمحے بھر کے لیے تو میں ہکا بکا رہ گیا اور اگلے ہی لمحے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایسا لگا جیسے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا ہو۔ میرے دل میں عجیب و غریب خیال آنے لگے۔

'جن، آسیب یا پھر کوئی بھٹکی ہوئی روح......' میرے ذہن میں الفاظ گڈمڈ ہونے لگے۔ میں ایک جست میں ٹیلے سے اترا اور گرتا پڑتا اپنی موٹر سائیکل تک پہنچا تھا حالانکہ میں خود کو بہت بہادر سمجھتا تھا اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی تھی۔ چھوٹی موٹی چیزوں کو میں خاطر میں نہ لاتا تھا لیکن یہ تو معاملہ ہی کچھ اور لگ رہا تھا، وہ کوئی غیر مرئی مخلوق تھی یا پھر کوئی جن کی شریر بیٹی تھی جو مجھے تنگ کر رہی تھی۔ ظاہر ہے، میں انسان تھا اور ڈر، خوف انسان کی [illegible] ہے، یوں میرا اس طرح خوفزدہ ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ بچی مجھے اس طرح بھاگتے دیکھ کر رونے لگی۔

''انکل، نہ جائیں، پلیز...... میری بات سنیں...... میرے ابو کو بلا دیں...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' بچی کی التجا بھری آواز ہچکیوں میں بدل گئی تھی اور میرے قدم وہیں جم گئے تھے۔ ظاہر ہے، میں انسان تھا، جس طرح خوف انسان کی فطرت میں شامل ہے، اسی طرح ہمدردی اور انسانیت کا جذبہ بھی انسان کی فطرت میں موجود ہوتا ہے۔ بچی کی آواز میں بڑا کرب تھا۔

'اتنی سی بچی بھلا میرا کیا بگاڑے گی؟' میں نے سوچا۔ 'ہو سکتا ہے، یہ واقعی کسی مصیبت میں ہو لیکن...... لیکن...... میرے ہاتھوں نے اسے چھوا کیوں نہیں؟' میرے دماغ میں سرگوشی ابھری۔ میں لاحول پڑھ کر پھر بھاگنے کی سوچنے لگا۔

''انکل، مجھے چھوڑ کر نہ جائیں، یہاں بہت اندھیرا ہے، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پلیز، میرے ابو کو بلا دیں۔''

بچی مسلسل مجھے رو رو کر پکار رہی تھی، اس کی آواز میں ایسا دکھ اور کرب تھا کہ میں نے اپنی بہادری پر لعنت بھیجی اور واپس پلٹ گیا۔ وہ بدستور اسی جگہ کھڑی ہچکیاں لے رہی تھی۔ میرا دل پسیج گیا۔

''اچھا بیٹا......! رو مت، میں کہیں نہیں جا رہا۔ آؤ، یہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' میں نے پھر غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن پہلے ہی کی طرح میرا ہاتھ اسے چھوئے بغیر گزر گیا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو اور میں نے ہوا کو پکڑنے کی کوشش کی ہو۔ میرے جسم میں پھر سنسناہٹ پھیل گئی لیکن میں نے اپنا دل مضبوط کیا اور اس [illegible] کو غور سے دیکھتا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''بیٹا......! پہلے تم مجھے اپنا نام بتاؤ؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ وہ مجھے اپنے قریب بیٹھتے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

''انکل، میرا نام رمشا ہے۔ ابو مجھے پیار سے رمشی کہتے ہیں۔ انکل، میرے ابو بہت اچھے ہیں، وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔'' وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ چاندنی میں اس کا وجود بہت ہی پیارا اور کسی گڑیا کی طرح لگ رہا تھا۔ میں اسے بغور دیکھ رہا تھا، میرے اندر اب بھی ہلکا سا خوف موجود تھا۔

''اچھا تو بیٹا! اب مجھے شروع سے بتاؤ، تم یہاں تک کیسے پہنچیں؟ اور تمہارے ابو کون ہیں؟''

''انکل، بہت سارے دن ہو گئے جب ابو مجھے یہاں گھمانے لائے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''رمشی، چلو، میں آج تمہیں سمندر کی سیر کرواتا ہوں۔ تمہاری طبیعت صحیح ہو جائے گی۔ انکل، میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی نا، سب کہتے ہیں، مجھے تھیما تھیما کی بیماری ہے۔''

''تھیما تھیما...... یہ کون سی بیماری ہے؟'' میں نے چونک کر بے خیالی میں اس سے پوچھا۔

''پتا نہیں انکل، بس سب یہی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی یہی کہتے تھے۔ انکل، اس میں مجھے بہت خون لگتا ہے، مجھے تکلیف بھی بہت ہوتی ہے اور چکر بھی آتے ہیں لیکن جب بھی مجھے خون لگتا تو میرے ابو میرے سرہانے کھڑے رہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرتے رہتے تھے۔ انکل، میرے ابو بہت اچھے ہیں۔ وہ مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔''

''اچھا بیٹا! آگے بتاؤ، کیا ہوا؟'' میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''انکل، جب ابو نے مجھے سمندر کی سیر کا کہا تو میں بہت خوش ہوئی اور خوشی سے ابو کے سینے سے

لگ گئی۔ ابو نے مجھے زور سے اپنے سینے سے لگالیا لیکن نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں آنسو تھے' وہ رو رہے تھے۔ میں نے ان کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ ''ابو......! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ ہم تو گھومنے جارہے ہیں' لوگ تو خوشی خوشی گھومنے جاتے ہیں۔ اچھا' آپ کو امی یاد آرہی ہوں گی۔'' انکل' جب میں بہت چھوٹی تھی نا تو میری امی کا انتقال ہوگیا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ امی کیسی ہوتی ہیں؟ جب میری سہیلیاں اپنی امی کا ذکر کرتیں تو میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میری امی بھی زندہ ہوتیں' وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے ناشتا کرواتیں' میرے ساتھ کھیلتیں لیکن اب ابو ہی میری امی اور بہت اچھے دوست ہیں' وہ میرا ہر طرح خیال رکھتے ہیں۔ رات کو مجھے اپنے سینے سے لگا کر سوتے ہیں۔ انکل' میرے ابو بہت اچھے ہیں۔''

بچی کی باتیں لمبی ہونے لگی تھیں اور رات گہری ہوتی جارہی تھی چنانچہ میں بے تابی سے بول پڑا۔

''بیٹا......! اب آگے بتاؤ' کیا ہوا؟''

''انکل' جب میں نے ابو کو کہا کہ آپ کو امی کی یاد آرہی ہوں گی تو وہ بولے۔ ''نہیں رمشا' ایسی کوئی بات نہیں' مجھے تمہارے ساتھ گھومنے میں بہت مزا آئے گا۔'' ابو نے میرے ماتھے کو پیار کیا پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ابو مجھے رات کے وقت گھمانے کیوں لے جارہے ہیں؟ لیکن میں اپنے ابو کی گود میں ان کے سینے سے لپٹی بہت خوش تھی۔ میرے ابو بہت اچھے ہیں' میری ہر فرمائش پوری کرتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی ایک فرمائش جو پوری نہیں کی تو کیا ہوا' سب بچوں کے ابو کے پاس اتنے پیسے تھوڑی ہوتے ہیں کہ وہ ہر فرمائش پوری کریں۔ میں بالکل ناراض نہیں ہوتی تھی کیونکہ میرے ابو بہت اچھے ہیں اور مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔'' بچی پھر اصل موضوع سے ہٹ گئی۔

''ہاں' ہاں بیٹا......! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو مگر اب مجھے جلدی سے بتاؤ کہ آگے کیا ہوا؟ تم یہاں تک کیسے پہنچیں؟''

''انکل' پھر ابو نے مجھے اپنی موٹر سائیکل کی ٹنکی پر بٹھایا۔ میں بہت چھوٹی اور بیمار تھی نا' اس لیے ابو مجھے ٹنکی پر بٹھاتے تھے پھر ہم چل پڑے۔ راستے میں اچانک مجھے چکر آنے لگے' میری طبیعت خراب ہونے لگی اور ناک سے خون بھی نکلنے لگا۔ میں جیسے ہی ٹنکی سے گرنے لگی' ابو نے موٹر سائیکل روک دی۔ انہوں نے مجھے دیکھا' اُن کی آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے زور سے سینے سے لگالیا۔ وہ زور زور سے روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''میری رمشی......! میری گڑیا......! مجھے معاف کردینا بیٹا......! مجھے معاف کردینا۔'' وہ بار بار یہی کہے جارہے تھے اور روتے جارہے تھے۔ میں نے پھر ان کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور بولی۔ ''ابو......! آپ مت روئیں' مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ فکر نہ کریں' میں بالکل ٹھیک ہوجاؤں گی۔'' انہوں نے رومال سے میرے چہرے سے خون صاف کیا اور ہم پھر چل پڑے۔ جلد ہی سمندر آگیا' سمندر کے نزدیک کچھ کشتیاں بھی کھڑی تھیں' وہاں بہت اندھیرا تھا اور کوئی بھی نہیں تھا......''

''ابو......! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے' ہم گھومیں گے کیسے؟ اندھیرا ابھی بہت ہے۔'' میں نے ابو سے پوچھا۔

''بیٹا......! میں ہوں نا' ہم دونوں گھومیں گے' میں تمہیں کشتی کی سواری بھی کراؤں گا۔'' ابو نے پھر مجھے سینے سے لگالیا اور ساحل پر بندھی ایک کشتی کے اندر مجھے بٹھا دیا اور کشتی کی رسی کو کھول کر اسے آہستہ آہستہ سمندر میں دھکیل دیا اور خود بھی کشتی میں بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا پتھر اور رسی بھی تھی۔ کشتی آہستہ آہستہ لہروں پر کافی آگے نکل گئی۔ ابو نے پھر مجھے گود میں اٹھالیا اور مجھے بے تحاشا پیار کرنے لگے۔ انہوں نے اس پتھر کو رسی سے میری کمر پر باندھ دیا۔ میرے ابو میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح میں محفوظ رہوں گی اور سمندر میں نہیں گروں گی۔ مجھے نیند آرہی تھی' میں ابو کی گود میں ہی سوگئی' اچانک مجھے نیند میں بہت تکلیف ہونے لگی' ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا دم گھٹ رہا ہو' میں بہت دیر تک نیند میں تکلیف محسوس کرتی رہی پھر جب میری آنکھ کھلی تو ابو پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے؟ میں وہاں سمندر کے کنارے اکیلی کھڑی تھی۔ جب سے میں ابو کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ مجھے پتا ہے' وہ بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ میرے ابو بہت اچھے ہیں' وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں' وہ بہت پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' رمشا خاموش ہوگئی مگر اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

میں اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کی کہانی کچھ پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ سمندر میں اس کے ابو اچانک کہاں غائب ہوگئے اور وہ ایک دم ساحل پر کیسے آگئی؟ عقل یہ باتیں تسلیم نہیں کر رہی تھی۔

''بیٹا......! تم یاد کرو' کچھ بھول تو نہیں رہیں کوئی اور بات؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''نہیں انکل' میں نے آپ سے جو کہا ہے' یہی ہوا تھا اور کچھ بھی نہیں اور میں جھوٹ کبھی نہیں بولتی۔''

میں ذہن میں اس کی کہانی کی کڑیاں ملانے لگا مگر جتنا سوچتا' اتنا ہی ذہن الجھ رہا تھا' عجیب پراسرار اور الجھی ہوئی کہانی تھی جو عقل قبول نہیں کر رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال کوندا' اس کے باپ نے اس کی کمر سے پتھر کیوں باندھا تھا؟ کہیں اس کے باپ نے اسے سمندر میں تو نہیں پھینک دیا تھا؟ لیکن......لیکن......ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ رمشا بار بار یہی کہہ رہی ہے کہ اس کے ابو بہت اچھے ہیں' اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا مگر......مگر میں اسے چھو بھی تو نہیں سکا تھا۔ میرا ہاتھ تو اس کے وجود سے اس طرح آر پار ہوگیا تھا جیسے وہ کوئی سایہ ہو'

میرے رگ و پے میں ایک بار پھر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ سمندر کی لہروں کا شور جو کچھ دیر پہلے تک مجھے خوبصورت لگ رہا تھا' اب یکا یک یہ شور خوفناک اور پراسرار لگنے لگا۔ لہروں کا شور اب ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سی چڑیلیں مل کر بین کر رہی ہوں۔ میں دل ہی دل میں آیت الکرسی پڑھ کر اپنے آپ پر دم کر رہا تھا۔ میرے سامنے کوئی جیتا جاگتا وجود نہیں' یقیناً کوئی روح وغیرہ تھی۔ میں نے خوف زدہ نظروں سے رمشا کی طرف دیکھا' وہ اسی طرح بیٹھی معصوم نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''انکل' آپ میرے ابو کو ڈھونڈ دیں گے نا؟''

''ہاں بیٹا......! ضرور۔'' مجھے خود اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''لیکن ابھی یہاں سے میرے ساتھ میرے گھر چلو' رات بہت ہوگئی ہے' ہم صبح تمہارے ابو کو ڈھونڈیں گے۔ آؤ میرے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے انکل' آپ بیٹھیں' میں آپ کے پیچھے پیچھے آؤں گی۔''

''پیچھے پیچھے......؟'' میں چونک گیا۔ ''پیچھے پیچھے کیسے آؤ گی؟''

''انکل' میں آجاؤں گی' میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا' میں موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھ سکتی' مجھے چکر آجائیں گے۔ میں آپ کے پیچھے پیچھے آجاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں بولا اور وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بدستور معصومیت سے مجھے دیکھے جارہی تھی۔

مجھے بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ وہ تھی بہت پیاری بچی......! پتا نہیں اس کے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی۔

میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور پلٹ کر رمشا کی طرف دیکھا کہ شاید وہ مجھ سے مذاق کر رہی ہو اور موٹر سائیکل پر بیٹھ جائے مگر مڑ کر دیکھتے ہی میرا دماغ چکرا کر رہ گیا' رمشا غائب تھی اور دور دور تک اس کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے خوف کے عالم میں موٹر سائیکل کا گیئر ڈالا اور بدحواسی میں گاڑی چلاتا ہوا وہاں سے بھاگا۔ راستے میں سوچتا جا رہا تھا کہ چلو اچھا ہوا' زندگی میں کسی روح یا آسیب کا سامنا کرنے کا بھی تجربہ ہو گیا۔ ویسے یہ بہتر ہی ہوا کہ آسیب کسی معصوم بچی کے روپ میں میرے سامنے آیا۔ اگر وہ کسی خوفناک شکل میں میرے سامنے آتا تو میرا جانے کیا حشر ہوتا اور مجھے تنہا ایسی سنسان جگہ پر آنے کا سبق مل جاتا۔ ویسے رمشا نے کہانی بڑی اچھی سنائی تھی۔

رمشا......نام بھی کتنا پیارا تھا مگر کہانی میں جگہ جگہ جھول تھے۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے' یہ کسی روح یا آسیب کا معاملہ ہے۔ رمشا نے میرے ساتھ اچھا مذاق کیا۔ میں سوچتا ہوا بائیک چلا رہا تھا۔ مجھے راستے میں کئی دفعہ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی سفید سی شے میرے سر کے اوپر فضا میں معلق ہو اور میرے ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہو مگر میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

میرا فلیٹ ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا۔ میری شادی ہوئے ابھی آٹھ مہینے ہوئے تھے اور میری بیوی کچھ دنوں کے لیے اپنی والدہ کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ میں نے بائیک بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں کھڑی کی اور زینے چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ دروازے کا لاک کھول کر میں اندر داخل ہوا اور واپس پلٹ کر دروازہ لاک کر دیا اور جیسے ہی گھوما' مجھے ایک شدید جھٹکا لگا' میرے ہاتھ پاؤں بری طرح لرزنے لگے' میرے سامنے وہی معصوم سی رمشا کھڑی تھی' اس کے وجود کے گرد بالکل ہلکا سا روشنی کا ہالہ تھا جیسے چاند کے گرد چاندنی۔

''انکل' میں نے کہا تھا نا کہ میں آپ کے پیچھے پیچھے آؤں گی۔ دیکھیے میں آ گئی۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

میں لرزتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں بری طرح خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میرا دل ایسے کبوتر کی طرح کانپ رہا تھا جس نے اچانک اپنے سامنے کسی بلی کو دیکھ لیا ہو۔

''انکل' کیا ہوا' آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' رمشا میرے قریب آ گئی تھی۔

''ہاں' ہاں' بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''لیکن...... لیکن تم یہاں تک پہنچیں کیسے؟''

''انکل' آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں نا' دیکھیے' میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں' میں نے آپ کو ساری باتیں سچ سچ بتائی ہیں' بس آپ میرے ابو کو بلا دیں' وہ مجھے بہت یاد آ رہے ہیں' نیند بھی بہت آ رہی ہے' مجھے ان کی گود میں سر رکھ کر سونا ہے۔'' وہ پھر رونے لگی۔ وہ کمزور سی لڑکی روتے ہوئے بہت ہی بے بس اور لاچار لگ رہی تھی۔ اسے روتا دیکھ کر آسیب' بدروح کی باتیں میرے دل سے نکل گئیں اور میرے دل میں پھر رحم کا جذبہ جاگ اٹھا۔

''نہیں' نہیں بیٹا' روتے نہیں۔'' میں اسے چپ کرانے کے لیے بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ' ہم تمہارے ابو کی باتیں کرتے ہیں۔'' میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر وہی ہوا' پہلے ہی کی طرح میرا ہاتھ اسے چھوئے بغیر گزر گیا' تاہم میرے دل سے خوف اب تقریباً نکل چکا تھا۔ میں اسے اشارہ کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ رمشا میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی تھی۔

میرے ذہن میں بہت سے سوال اٹھنے لگے تھے۔ 'یہ یہاں تک کیسے پہنچی؟ کیا واقعی یہ کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے؟ کیا یہ سچ کہہ رہی ہے؟' اس بات کا تو مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ کوئی غیر مرئی قوت ہے ورنہ جس طرح وہ یہاں تک پہنچی تھی' وہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں بیڈ پر بیٹھ گیا' رمشا میرے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

''بیٹا......! تمہارے ابو کا کیا نام ہے؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''انکل' میرے ابو کا نام عظیم ہے' وہ ہیں بھی بہت عظیم' وہ بہت اچھے ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' وہ پہلے کی طرح پھر اپنے ابو کی تعریف کرنے لگی۔

''اچھا' اچھا' تمہیں اپنے گھر کا پتا وغیرہ معلوم ہے؟'' میں جلدی سے بولا۔

''نہیں انکل' یہی تو بات ہے' مجھے اپنے گھر کا پتہ نہیں معلوم۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''تو پھر بیٹا......! کوئی ایسی نشانی' کوئی ایسی چیز جس سے تمہارے گھر تک پہنچنے میں آسانی ہو؟''

''ہاں انکل' مجھے ان کا موبائل نمبر یاد ہے۔''

''لو قصہ ہی ختم۔' میں نے خوش ہو کر دل میں سوچا۔ 'اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔'

''مجھے نمبر بتاؤ۔'' میں نے جیب سے فون نکالتے ہوئے بے تابی سے کہا۔ رمشا نے اٹک اٹک کر مجھے موبائل نمبر بتایا۔ میں نے نمبر ڈائل کیا لیکن دوسری طرف سے ''آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا۔'' کی ریکارڈنگ بج رہی تھی۔ میں نے کئی بار ٹرائی کی مگر ہر بار یہی جواب آیا۔ مایوس ہو کر میں نے موبائل بند کیا اور رمشا کی طرف دیکھ کر بولا۔

''رمشا! آپ کے ابو نے موبائل آف کیا ہوا ہے۔ ایسا کرو' ابھی سو جاؤ' رات بہت ہو گئی ہے' ہم صبح آپ کے ابو سے بات کریں گے۔''

''انکل' مجھے نیند بالکل نہیں آتی۔'' رمشا بے چارگی سے بولی۔

''کوشش کرو' انشاء اللہ' آ جائے گی' ویسے بھی اتنی رات کو ہم باہر نہیں جا سکتے' صبح اطمینان سے آپ کے ابو کو ڈھونڈیں گے' ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے انکل' میں بھی سو جاتی ہوں' آپ بھی سو جائیں۔'' وہ اٹھ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

''رمشا! نیچے کیوں بیٹھ گئی ہو' بستر پر سو جاؤ۔''

''نہیں انکل' میں یہیں نیچے سو جاؤں گی' آپ اپنی جگہ پر سو جائیں۔'' مجھے اس چھوٹی سی بچی پر بے اختیار پیار آ گیا۔

''نہیں بیٹا! ابھی تم بہت چھوٹی ہو اور پھر تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ تم پلنگ پر ہی لیٹ جاؤ' میں صوفے پر لیٹ جاتا ہوں۔''

وہ نانا کرتی رہی پھر میرے بے حد سمجھانے پر راضی ہو گئی اور پلنگ پر ایک کونے میں سکڑ کر لیٹ گئی۔ میں بھی صوفے پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن میں اس معصوم بچی کے بارے میں طرح طرح کے سوالات اٹھ رہے تھے اور پھر میرے کانوں میں اچانک دھیمی دھیمی' بہت ہی میٹھی آواز میں سورۃ الناس پڑھنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے آنکھوں سے جھری بنا کر رمشا کی طرف دیکھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ دُعائیہ انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ وہ دُعا پڑھ رہی تھی پھر آیت الکرسی پڑھ کر اس نے اپنے آپ پر دَم کیا اور مجھے بھی دَم کر دیا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا اور

میرے دل و دماغ میں جو وسوسے اور غبار چھایا ہوا تھا' آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔

''رمشا! نیند نہیں آ رہی کیا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''بس انکل' سو رہی ہوں۔ ابو کہتے ہیں' سونے سے پہلے سب کے لیے دُعا کرنی چاہیے اور دُعا پڑھ کر سونا چاہیے۔'' میں سوچ میں پڑ گیا' وہ خود کوئی غیر مرئی قوت تھی اور شیطانی وسوسوں اور جن بھوتوں سے پناہ کی دُعا مانگ رہی تھی۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اس رات میں ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکا اور رمشا کو بھی میں نے کبھی پلنگ پر کروٹیں بدلتے اور کبھی بیٹھے ہوئے دیکھا' وہ بھی میری طرح ساری رات جاگتی رہی تھی۔

صبح صادق کا سپیدہ نمودار ہوا تو فضا میں اذانوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کچھ دیر بعد چڑیوں نے چہچہانا شروع کردیا تھا۔ رمشا اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔

''انکل' ابو بھی اٹھ گئے ہوں گے' فون کریں نا ابو کو۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے بیٹا......!'' میں نے موبائل پر نمبر ملایا مگر دوسری طرف پھر وہی ریکارڈنگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔

''رمشا......! تمہارے ابو کا فون ابھی بھی بند جا رہا ہے۔ ہم بعد میں ٹرائی کریں گے۔'' میں نے آخری بار نمبر ڈائل کر کے موبائل کو کانوں سے لگاتے ہوئے رمشا سے کہا۔ میری بات سن کر رمشا بالکل روہانسی ہوگئی تھی' ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گی۔

اچانک میرے کان کھڑے ہوگئے' دوسری طرف بیل بجی تھی۔ دوسری' تیسری پھر چوتھی بیل پر کسی نے فون اٹھالیا۔

''ہیلو' السلام علیکم! کون بات کر رہا ہے؟'' ایک تھکی تھکی' کمزور سی آواز آئی۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا اور میں اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔

''جی...... مجھے عظیم صاحب سے بات کرنی ہے۔'' میں نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''جی' میں عظیم بات کر رہا ہوں۔''

''عظیم صاحب! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

''میں سن رہا ہوں' کہیے' کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''کچھ ایسی باتیں ہیں جو فون پر نہیں ہوسکتیں۔ مجھے آپ سے ملاقات کرنی ہوگی۔'' میں بولا۔

''ایسی کیا بات ہے جو فون پر نہیں کرسکتے؟ ویسے آپ ہیں کون' میں آپ کو پہچانا نہیں؟''

''بس آپ اتنا جان لیں کہ مجھے آپ سے رمشا کے بارے میں بات کرنی ہے۔ گفتگو ذرا لمبی ہے اس لیے آپ سے ملاقات ضروری ہے۔'' میں دبے دبے لہجے میں بولا۔ رمشا کا نام سن کر دوسری طرف ایک سناٹا چھا گیا۔ میں ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا مگر فون کاٹ دیا گیا تھا۔ میں نے دوبارہ ٹرائی کی مگر فون پھر کاٹ دیا گیا۔ میں بھی ڈھیٹ بنا ٹرائی کرتا رہا مگر پھر دوسری طرف وہی ریکارڈنگ بجنے لگی کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا' شاید عظیم صاحب نے پھر فون آف کردیا تھا۔ میں نے مایوس ہو کر رمشا کی طرف دیکھا۔ رمشا بغور مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نہ اس کے پاس کوئی الفاظ تھے نہ میرے پاس کہنے کو کچھ تھا جس سے اسے میں کوئی تسلی دے سکتا۔

کچھ دیر بعد غیر ارادی طور پر میں نے پھر عظیم صاحب کو فون لگایا۔ اس دفعہ فون آن تھا اور پہلی ہی بیل پر عظیم صاحب نے فون اٹھالیا تھا۔

''کون ہو تم اور مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو؟'' عظیم صاحب کی آواز میں غصہ اور جھنجھلاہٹ تھی۔

''دیکھیے عظیم صاحب! میں آپ کو پریشان نہیں کر رہا بلکہ آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی بیٹی رمشا اس وقت میرے پاس ہے۔ آپ مجھے اپنا پتا بتائیں' مجھے آپ سے ملنا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو...... رمشا مر چکی ہے......'' عظیم صاحب چیخ کر بولے۔

''جی نہیں' وہ زندہ ہے اور اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہے۔''

''تم مجھے پاگل لگتے ہو یا پھر کوئی بلیک میلر...... سنو مسٹر' تم جو کوئی بھی ہو' اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ میں ابھی پولیس کو فون کر کے تمہاری کال کے بارے میں بتاتا ہوں۔'' عظیم صاحب نے دھمکی دی۔

''دیکھیے عظیم صاحب! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' اس میں سو فیصد صداقت ہے۔ میں بس آپ کی بیٹی کو آپ سے ملانا چاہتا ہوں پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔''

''لیکن وہ تمہیں ملی کہاں سے؟'' عظیم صاحب نے سوال کیا۔

اس پر میں نے انہیں مختصراً ساری کہانی بتادی۔ صرف رمشا کے روح ہونے کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ اس پر یقین نہیں کرتے۔ یہ ساری باتیں تو ان کے سامنے جا کر کرنے کی تھیں۔

''اچھا ٹھیک ہے' میں تمہاری باتوں پر اعتبار کرتا ہوں لیکن دیکھو' میرے ساتھ کوئی دھوکہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔ اس وقت تو میں کام پر جا رہا ہوں' تم ایسا کرو کہ رات آٹھ بجے تک رمشا کو لے کر میرے گھر آ جاؤ۔'' عظیم صاحب نے اپنے گھر کا پتا بتایا جسے میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔

''مبارک ہو رمشا! تمہارے ابو سے بات ہوگئی ہے۔ ہم رات کو تمہارے ابو کے پاس چلیں گے۔''

''انکل' ابھی چلیں نا؟'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''بیٹا......! تمہارے ابو کو کام پر جانا تھا اس لیے انہوں نے رات کو بلایا ہے۔ کام پر تو مجھے بھی جانا ہے مگر تم اکیلی کیسے رہو گی؟''

''انکل' میں رہ لوں گی۔ آپ جائیں' مجھے ڈر تھوڑی لگتا ہے۔'' مجھے اس کے لہجے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے رمشا نہیں چاہتی کہ میں جاؤں کیونکہ اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو میں نے دیکھ لیے تھے۔

کتنی معصوم تھی یہ بچی جو اتنی سی عمر میں موت کی آغوش میں پہنچ گئی تھی اور اپنے باپ کی تلاش میں ایک ننھی روح کی صورت بھٹک رہی تھی۔ ہاں' وہ ایک ننھی روح ہی تھی کیونکہ میں اسے چھو نہیں سکتا تھا' وہ ہواؤں پر سفر کرتی تھی اور اس کے وجود سے جو ہلکی ہلکی نورانی روشنی پھوٹتی تھی' وہ بھی کسی غیر معمولی قوت کی ہی ہوسکتی تھی۔

''اچھا تو رمشا! میں ایسا کرتا ہوں' آج آپ کے ساتھ ہی رہتا ہوں اور دکان پر فون کر کے کہہ دیتا ہوں کہ میں آج نہیں آؤں گا۔'' میری بات پر رمشا مسکرادی۔

''انکل' آپ بہت اچھے ہیں' میرے ابو کی طرح۔'' میں بھی مسکرادیا۔

میری ایک چھوٹی سی دکان تھی جہاں میں نے ایک آدمی کو رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے فون کر کے کہہ دیا کہ مجھے کچھ ضروری کام ہے اس لیے آج میں

نہیں آ سکتا۔ وہ دکان کھول لے۔

''رمشا! میں نیچے سے کچھ ناشتا وغیرہ لے کر آتا ہوں، بس یوں گیا اور یوں آیا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے انکل......!'' رمشا سر ہلا کر بولی۔ اس کے لاغر سے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔

میں نیچے گیا اور پندرہ سے بیس منٹ میں ناشتہ لے کر آ گیا تھا۔ ''رمشا......! آؤ، ناشتہ کر لو۔''

''نہیں انکل، مجھے بھوک ہی نہیں لگتی، آپ کھائیں۔''

'عجیب لڑکی ہے، نہ سوتی ہے نہ کھاتی ہے، زندہ کیسے ہے؟ اوہ...... یہ زندہ ہی کب ہے، یہ تو ایک روح ہے، روحیں کھاتی بھی نہیں ہوں گی، سوتی بھی نہیں ہوں گی، ہاں، ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے سر ہلا کر خود سے کہا۔

پھر بھی میں نے اسے بہت زور دیا کہ وہ ناشتہ کر لے مگر وہ نہ مانی۔ ظاہر ہے، میں روح نہیں تھا، ایک جیتا جاگتا گوشت پوست کا انسان تھا اس لیے میں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا پھر میں اور رمشا تمام دن باتیں کرتے رہے، کبھی وہ ہنستی تو کبھی رونے لگتی، کبھی میں ہنستا تو کبھی خوفزدہ ہو جاتا۔ بہرحال اسی طرح دن کٹ گیا۔

سات بجے کے قریب اچانک میرا موبائل بجنے لگا۔ میں نے ڈسپلے پر نظر ڈالی، یہ رمشا کے ابو کا نمبر تھا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کی۔ ''ہیلو......''

''تم ابھی میرے گھر آ جاؤ، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' عظیم صاحب کی آواز میں بے چینی اور اضطراب نمایاں تھا۔

''ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔''

''بس جتنی جلدی ہو سکے، آ جاؤ، مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا۔'' فون کٹ گیا۔

''رمشا......! تمہارے ابو کا فون تھا، انہوں نے ہمیں ابھی بلایا ہے۔''

''سچ انکل! تو پھر چلیں نا پلیز......'' اس کی آواز سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ رمشا میرے ساتھ ساتھ میری بائیک تک آ گئی۔

''بیٹھو رمشا......! اور مجھے اچھی طرح پکڑ لینا۔''

''نہیں انکل، آپ جائیں، میں آپ کے پیچھے پیچھے آؤں گی۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''پیچھے پیچھے......؟ اوہ...... سمجھ گیا۔'' ظاہر ہے، وہ ایک روح تھی اور ہواؤں پر سفر کرتی تھی۔ میں مسکرا دیا اور بائیک آگے بڑھا دی۔

ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا پھر تھوڑی دیر میں ہی اندھیرے نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ رات ہو گئی تھی، میں اپنی موٹر سائیکل چالیس کی اسپیڈ سے چلا رہا تھا۔ اس بار بھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میرے سر کے اوپر کوئی سفید سی چیز فضا میں تیر رہی ہو جیسے کوئی ننھی سی پری۔ پہلی بار تو میں اسے وہم سمجھا تھا مگر اس بار مجھے یقین تھا کہ یہ رمشا ہے جو میرے ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہے۔ عظیم صاحب نے مجھے جو پتہ بتایا تھا، وہ میرے گھر سے کافی دور تھا، تاہم ان کا گھر ڈھونڈنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ ایک پلازہ کی چھٹی منزل پر رہتے تھے۔ میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا مطلوبہ منزل پر پہنچ گیا۔ سامنے ہی ایک دروازے کے اوپر 'عظیم ہمایوں' کی نیم پلیٹ لگی تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، مجھے رمشا کہیں نظر نہیں آئی۔

دستک پر دروازہ فوراً کھل گیا۔ میرے سامنے ایک کمزور سا آدمی جس کی عمر تقریباً 40 یا 45 کے درمیان ہوگی، کھڑا تھا۔ چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی، وہ کافی خوفزدہ اور بیمار لگ رہا تھا۔

''کہاں ہے رمشا؟'' وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بولا۔ میں نے سوچا، یہی وقت ہے کہ انہیں حقیقت بتا دینی چاہیے۔

''وہ مر چکی ہے عظیم صاحب......!'' میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

''کیا!! مگر...... مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ زندہ ہے؟'' عظیم صاحب چیخ پڑے مگر آواز دھیمی تھی۔

''آپ مجھے اندر تو آنے دیں، میں آپ کو ساری حقیقت بتاتا ہوں۔''

عظیم صاحب غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ''دیکھو، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں، کہیں تم مجھے کوئی دھوکہ تو نہیں دے رہے؟'' ان آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

''عظیم صاحب، جو سچائی ہے، میں وہ آپ کو بتانے آیا ہوں۔ مطمئن رہیں، میں آپ کو دھوکہ نہیں دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، اندر آ جاؤ۔'' وہ ایک طرف ہوتے ہوئے بولے۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ انہوں نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دوسری پر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو نظر آ رہے تھے اور چہرے پر ایسا دکھ تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

''تم نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا کہ وہ زندہ ہے مگر تم نے یہ بات کیسے کہی؟ نہ تم مجھے جانتے ہو نہ رمشا کو پھر تمہیں رمشا کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''عظیم صاحب......! میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا مگر آپ مجھے پہلے یہ بتائیں کہ رمشا کے ساتھ کیا ہوا؟''

''نہیں...... پہلے تم بتاؤ، رمشا کو کیسے جانتے ہو؟'' وہ اپنی بات پر بضد تھے۔

''ٹھیک ہے تو سنیے، رمشا مر چکی ہے مگر مرنے کے بعد بھی اسے آپ کی محبت نے ایک روح کی شکل میں دربدر کیا ہوا ہے، وہ آپ سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔'' اس کے بعد میں نے شروع سے آخر تک ساری کہانی عظیم صاحب کے گوش گزار کر دی۔

عظیم صاحب حیرت سے آنکھیں پھاڑے تمام کہانی سنتے رہے تھے۔ اس کے بعد وہ بے ساختہ رونے لگے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''میری بچی......! میری رمشی......! ہاں، وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی، میری گڑیا جیسی بچی میرے بغیر نہیں رہ سکتی تھی مگر...... مگر وہ مجھے نظر کیوں نہیں آ رہی؟ رمشا......! رمشا......!'' وہ بے قراری سے پکارنے لگے۔

''اس وقت وہ مجھے بھی نظر نہیں آ رہی۔'' میں نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے آپ سے ناراض ہے۔ آپ ذرا تفصیل سے بتائیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا تاکہ میں رمشا کو بلا کر آپ سے ملاؤں۔'' میں نے ساری حقیقت جاننے کے لیے عظیم صاحب سے چھوٹا سا جھوٹ بولا کیونکہ رمشا میرے سامنے کھڑی تھی۔

''پہلے تم مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ یہ باتیں کسی کو نہیں بتاؤ گے؟ کھاؤ، اپنے سر کی قسم......'' عظیم صاحب بولے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے عظیم صاحب کبھی کبھی بالکل دیوانوں سی اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ واقعی جس کی معصوم بچی موت کی آغوش میں چلی جائے، اس کے دل کا حال وہی جانتا ہے۔

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔'' میری یقین دہانی پر وہ کرسی سے پشت لگا کر بیٹھ گئے۔

''میں بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا جب جوان ہوا تو والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ چھوٹی بہن کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو کر میں نے اپنی شادی کے

بارے میں سوچا۔ بچپن سے ہی میں نے دکھوں اور تکلیفوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا۔ عذرا میری زندگی میں بہار بن کر آئی' ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور پھر ہمارے گھر میں ایک ننھی سی کلی نے جنم لیا۔ اس روز ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا' ہم دونوں کے لیے رمشا قدرت کی طرف سے ایک انمول تحفہ تھی۔ وہ ہماری جان تھی' ہم دونوں میاں بیوی اس سے بے تحاشہ محبت کرتے تھے' اس کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے' میرا گھر ذاتی تھا اور گزر بسر کے لیے ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ ہم اپنی اس چھوٹی سی جنت میں بہت خوش تھے۔

مگر پھر ہماری زندگی میں وہ بھونچال آیا کہ جس کا ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پیدائش کے کچھ عرصے بعد رمشا بیمار رہنے لگی' وہ دن بہ دن کمزور اور لاغر ہوتی جارہی تھی۔ میں نے اسے ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے رمشا کے کچھ ٹیسٹ وغیرہ لکھ کر دیئے اور ساتھ ہی میرا اور عذرا کا بھی ٹیسٹ لکھا۔ رپورٹ آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے اور عذرا کو جو بتایا' وہ ہمارے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔

''مسٹر عظیم......! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ دونوں میاں بیوی تھیلے سیمیا مائنر ہیں۔ شاید شادی سے پہلے آپ دونوں نے اپنا بلڈ ٹیسٹ نہیں کروایا اور اس لاپروائی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ اگر آپ دونوں میں سے ایک بھی تھیلے سیمیا مائنر ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ تھیلے سیمیا مائنر خود کوئی بیماری نہیں مگر بدقسمتی یہ ہے کہ آپ دونوں ہی تھیلے سیمیا کے مریض ہیں اور اگر تھیلے سیمیا مائنر کے دو افراد آپس میں شادی کرتے ہیں تو پیدا ہونے والے بچے کو تھیلے سیمیا میجر ہوتا ہے اور آپ کی بچی کو تھیلے سیمیا میجر ہے جو کہ ایک مہلک مرض ہے اور اس کا مکمل علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ میڈیکل سائنس صرف اور صرف اس مرض کے شکار کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے ہاں پھر جس کا واحد علاج مریض کو زندہ رکھنے کے لیے ہر مہینے خون کی بوتل چڑھانا ہے۔'' عظیم صاحب کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

میرے ذہن میں رمشا کا کہا ہوا جملہ گونجنے لگا۔ ''انکل...... مجھے تھیما تھیما کی بیماری ہے......'' اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ تھیلے سیمیا کو تھیما تھیما کہہ رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن کر ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ عذرا کو چکر آنے لگے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ میری حالت خود غیر ہو گئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کاٹو تو خون نہیں۔ ہم دونوں بوجھل قدموں سے اپنے گھر واپس آئے تھے۔ اس دن کے بعد سے عذرا بھی بیمار رہنے لگی' اس نے رمشا کی بیماری کو دل پر لے لیا تھا۔ مجھ سے اُن دونوں کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی' کبھی میں عذرا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس بھاگتا تو کبھی اپنی گڑیا جیسی رمشا کو خون چڑھانے کی تگ و دو کرتا۔ بعض دفعہ ڈاکٹرز کو خون چڑھانے کے لیے رمشا کی نس بڑی مشکل سے ملتی' کبھی پاؤں کی نس' کبھی سر کی نس تو کبھی کہیں اور کسی نس سے کام چلانا پڑتا۔ میری معصوم رمشی اس تکلیف سے تڑپ تڑپ کر رہ جاتی۔ ہمارے ہنستے بستے گھر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔ وہ گھر جو رمشا کی کلکاریوں اور عذرا کی محبت بھری باتوں سے گونجتا تھا' اب بالکل کسی قبرستان کی طرح ویران لگنے لگا تھا۔ عذرا دن بہ دن مزید بیمار ہوتی چلی گئی۔ ننھی رمشا کی تکلیف اس سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ وہ ہر لمحے دل ہی دل میں کڑھتی رہتی اور بالآخر وہ ہمت ہار گئی اور مجھے' رمشا کو اس دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ اس وقت رمشا دو سال کی تھی۔ اب میری کل کائنات رمشا تھی۔ میں نے اس کے علاج کے لیے دن رات ایک کر دیا اور اپنا فلیٹ بیچ کر یہ فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ روپیہ میں نے پانی کی طرح بہایا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا بلکہ رمشا جوں جوں بڑی ہوتی گئی' خون کی ضرورت اور بڑھنے لگی۔ کبھی پندرہ دن میں کبھی بیس دن میں۔ جب اسے خون چڑھتا تو وہ بہت تکلیف محسوس کرتی۔ میں اس کے سرہانے کھڑا رہ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہتا اور اسے حوصلہ دیتا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ جب میں حالات سے گھبرا کر رونے لگتا تو وہ میری ہمت بڑھاتی اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھ کر کہتی۔

''ابو......! نہ روئیں' آپ روتے ہیں تو مجھے اور تکلیف ہوتی ہے۔ اللہ میاں مجھ سے ناراض ہیں' کبھی تو ان کی ناراضگی دور ہوگی۔ میں آج دُعا پڑھ کر اللہ میاں کو منانے کی کوشش کروں گی۔ جب وہ مان جائیں گے تو میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گی اور آپ بھی مسکرائیں گے پھر ہم خوب کھیلیں گے' باہر گھومنے جائیں گے۔'' میں اس کی معصوم باتوں پر اسے سینے سے لگا لیتا۔ اب یہ نوبت آ گئی تھی کہ رمشا کو بار بار خون چڑھانے کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ مجھے خون کے حصول کے لیے بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پیسہ بھی بے دریغ خرچ ہو رہا تھا۔ آخر میرے فلیٹ کی رقم ختم ہو گئی اور مجھے دکان بھی بیچنی پڑی۔ رمشا کے لیے مجھے اپنی جان بھی دینی پڑتی تو میں دے دیتا مگر ایسا ممکن نہ تھا۔ میری رمشا نے اتنی سی عمر میں بڑی تکالیف اٹھائی تھیں۔ وہ بہت پیاری بچی اور بالکل کسی ننھی پری جیسی تھی۔'' عظیم صاحب رونے لگے۔ میری آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ واقعی عظیم صاحب بہت دکھی تھے۔

''حوصلہ کیجیے عظیم صاحب......!'' میں نے انہیں دلاسہ دیا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''پھر ایک رات رمشا میرے سینے سے لگ کر سو رہی تھی' اچانک اس کو ہچکیاں آنے لگیں' میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور رمشا کی طرف دیکھا' وہ بہت تکلیف میں تھی اور یہ دیکھ کر تو میرے ہوش اڑ گئے کہ اس کی ناک سے خون کی دھار پھوٹ رہی تھی اور آنکھیں بھی لال سرخ ہو رہی تھیں جیسے ان سے خون ٹپک رہا ہو۔

''رمشا......! رمشا......! کیا ہوا بیٹا؟'' میں نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''ابو......! مجھے بہت درد ہو رہا ہے' سینے میں بھی بہت درد ہے۔'' میری معصوم سی بچی بہت تکلیف میں تھی۔

''بیٹا......! تمہیں کچھ نہیں ہوگا' تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' میں اسے حوصلہ دینے لگا مگر خود اپنے آنسو نہ روک سکا۔

''نہیں ابو......! آپ روئیں مت' میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' اس کی ہچکیاں اور بڑھ گئیں۔ میں نے گھبرا کر اپنا موبائل نکالا اور اسی ڈاکٹر کو فون کیا جس سے رمشا کا علاج جاری تھا۔ ڈاکٹر صاحب میری بات سن کر بولے۔

''تم فوراً اسپتال پہنچو' میں تمہارے ساتھ ہی پہنچتا ہوں۔''

میں گرتا پڑتا رمشا کو لے کر فلیٹ سے نیچے اترا' میری آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ رمشا اس حالت میں بھی میرے آنسو پونچھتی جا رہی تھی اور مجھے پیار کرتی جا رہی تھی حالانکہ وہ خود بہت تکلیف میں تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ

ابھی سو جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب نے اسی وقت ایمرجنسی میں رمشا کے ٹیسٹ کروائے' ٹیسٹ دیکھتے وقت میں نے ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر مایوسی کے سائے دیکھ لیے تھے۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور دل میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے بیل بجا کر نرس کو بلایا اور بولے۔ ''رمشا کو ذرا باہر لے جائیں اور ان کی صفائی وغیرہ کر دیں۔ میں ابھی آپ کو بلاتا ہوں۔'' رمشا بدستور غنودگی میں تھی۔ نرس اسے اپنی گود میں اٹھا کر باہر لے گئی۔

''دیکھیے عظیم صاحب......! اب میں جو آپ کو بتا رہا ہوں' ذرا حوصلے اور تحمل سے سنیے گا۔ آپ کی بچی کا کیس کافی پیچیدہ ہو گیا ہے' اس کا جسم اب بالکل بھی خون قبول نہیں کر رہا۔ یہ آخری اسٹیج ہے' اس میں ناک اور آنکھوں سے خون آنے لگتا ہے۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی بچی کچھ دنوں کی مہمان ہے بلکہ کبھی بھی......''

مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی نے مجھے بلندی سے اٹھا کر نیچے پٹخ دیا ہو۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی' اگر ڈاکٹر صاحب مجھے سہارا دے کر دوبارہ کرسی پر نہ ٹھاتے تو میں غش کھا کر گر جاتا۔

ڈاکٹر صاحب بغور مجھے دیکھ رہے تھے' وہ ولے۔ ''دیکھیے عظیم صاحب......! میں آپ کے دکھ ور کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں لیکن اللہ کی مرضی کے آگے کیا کر سکتے ہیں۔ آپ نے ایک باپ ہونے کا فرض خوبی ادا کیا ہے اور آپ کے بس میں جو تھا' وہ آپ نے کیا مگر قدرت کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ اب صرف اور صرف امید کی ایک کرن ہے مگر ں جانتا ہوں' آپ کے لیے وہ بہت مشکل ہے' پ افورڈ نہیں کر سکیں گے۔''

''نہیں......نہیں......ڈاکٹر صاحب......! مجھے بتائیں' مجھے کیا کرنا ہوگا؟ میں رمشا کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔'' ڈاکٹر صاحب کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے میری جان میں جان آئی تھی۔

''اس اسٹیج پر آخری حل یہ ہوتا ہے کہ بون میرو ٹرانسپلانٹ کیا جاتا ہے جس کی سہولت پاکستان میں موجود نہیں۔ اٹلی اور لندن میں یہ علاج ہو رہا ہے لیکن اس میں بھی مریض کے بچنے کا چانس ففٹی پرسنٹ ہوتا ہے اور اس کے لیے ایک خطیر رقم بھی چاہیے جو آپ افورڈ نہیں کر سکتے۔''

''پھر بھی ڈاکٹر صاحب......! پتا تو چلے کتنی رقم چاہیے؟'' میں کرسی پر پہلو بدلتا ہوا بولا۔

''تقریباً 90 لاکھ یا پھر ایک کروڑ......'' یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دماغ بھک سے اڑ گیا۔ 'ایک کروڑ......' میرے اندر کسی نے چیخ کر کہا۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب......! میرے پاس تو لندن یا اٹلی کے ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں' میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں گا؟''

''دیکھیے عظیم صاحب......! میں آپ کے لیے اتنا کر سکتا ہوں کہ رمشا کے تمام ٹیسٹ اور رپورٹس اپنے اسپتال کی معرفت اٹلی بھجواتا ہوں۔ اگر وہاں سے کوئی مثبت جواب آیا تو آپ کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب......! یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔''

''تو پھر میں فوراً رپورٹس بھجواتا ہوں اور جواب آنے پر آپ کو فون کرتا ہوں۔''

میں رمشا کو لے کر گھر آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے رمشا کو کوئی انجکشن لگایا تھا جس کی وجہ سے وہ غنودگی میں تھی۔ گھر آ کر میں نے رمشا کو ٹ

دیا اور خود خدا کے حضور سجدے میں گر گیا اور ساری رات اپنے رَب سے گڑگڑا کر رمشا کی زندگی کے لیے دُعائیں مانگتا رہا۔ رو رو کر میری ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب رمشا اٹھ کر میرے سینے سے لگ کر سو گئی۔ میں اپنی بیٹی کے معصوم چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ''یا اللہ! میرا کیا گناہ تھا جس کی سزا میری معصوم بیٹی کو مل رہی ہے؟ اس کے تو ابھی گڑیوں سے کھیلنے کے دن ہیں۔ یا اللہ! میں کمزور سا بندہ ہوں' تیری آزمائش پر پورا نہیں اتر سکتا۔ مجھے معاف فرما اور مجھے اس آزمائش سے نکال۔ یا اللہ! میری مدد فرما۔ میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں گا؟ تو رحیم ہے تو کریم ہے' غیب سے کوئی وسیلہ کوئی سبب بنا دے' میری بچی کو اس تکلیف سے نجات دلا' اسے ٹھیک کر دے میرے مالک!'' میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ رمشا کے رخسار پر گر رہے تھے۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی' مجھے روتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ ہل سکے پھر بھی وہ اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو صاف کر رہی تھی اور والہانہ مجھے پیار کرتی جا رہی تھی۔''

عظیم صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس دفعہ تو میں بھی اپنے آنسو نہیں روک سکا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی تھی۔ کس قدر بے بس' لاچار اور مظلوم تھا یہ شخص' زندگی میں مسلسل تکلیفوں اور دکھوں کے سوا اس نے دیکھا کیا تھا؟

''اگر میری رمشا زندہ ہوتی تو وہ مجھے کبھی بھی رونے نہ دیتی......'' عظیم صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''وہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔'' عظیم صاحب کی گفتگو جاری تھی مگر اچانک فلیٹ میں اندھیرا ہو گیا' شاید لائٹ چلی گئی تھی۔

''لائٹ گئی ہے۔'' عظیم صاحب کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر میں کمرے میں مدہم سی روشنی پھیل گئی۔ عظیم صاحب نے چارجر لائٹ جلالی تھی۔

''آؤ چھت پر چلتے ہیں' یہاں بہت گرمی ہے۔'' عظیم صاحب نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں چارجر لائٹ کی روشنی میں چھت پر آ گئے۔ مجھے تشویش ہو رہی تھی' رمشا اب غائب ہو گئی تھی۔ ہم دونوں چھت پر اینٹوں سے بنے ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ مجھے باقی باتیں سننے کی بڑی بے چینی ہو رہی تھی۔

''پھر کیا ہوا عظیم صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''اگلے دن شام کو ڈاکٹر صاحب کا میرے پاس فون آیا' وہ بولے کہ رمشا کی رپورٹس کا جواب گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ رمشا کے بچنے کا کوئی چانس نہیں۔ بار بار خون دینے کی وجہ سے اس کے جسم میں آئرن کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے اور اس کا بون میرو ٹرانسپلانٹ نہیں ہو سکتا۔ بس اِسے اب دُعاؤں کی ضرورت ہے۔ میرے اوپر بار بار بم گر رہے تھے۔ کبھی میں امید کے گلشن میں زندہ ہو جاتا اور کبھی ناامیدی کے سمندر میں غرق ہو جاتا تھا اور اس شام کو ڈاکٹر صاحب کے فون نے مجھے ہمیشہ کے لیے مار دیا تھا۔ میں ایک زندہ لاش بن کر رہ گیا تھا اور رمشا کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی تکلیف دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آتا تھا' میں بھی کتنا بے بس تھا' اپنی بیٹی کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سسک سسک کر مر رہی تھی اور میں اسے پل پل مرتا دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی' کبھی کبھی اس کی ناک اور آنکھوں سے خون آنے لگتا لیکن اس حالت میں بھی میری بچی مجھے مسکرا کر دیکھتی تھی۔ اس کی عادت تھی سونے سے پہلے سب کے لیے دُعا کرنے کی۔ وہ دُعا پڑھ کر مجھ پر ضرور دم کرتی تھی۔

اُس دن بھی وہ دُعا پڑھ کر سو گئی لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بہت تکلیف میں ہے مگر ظاہر نہیں کر رہی ہے کہ میں پریشان نہ ہو جاؤں۔ رمشا کو اس طرح لحہ لحہ مرتا دیکھنا میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ میں اپنی بچی کو سسک سسک کر بے بسی کی موت مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اُس رات میں اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ رمشا میرے سینے سے لگی غنودگی میں تکلیف سے کراہ رہی تھی' اس کی ناک اور آنکھوں سے پھر خون بہنے لگا تھا۔ میری بیٹی شدید تکلیف میں تھی۔

''میں کیا کروں......؟ میں کیا کروں؟'' میں بے بس ہو کر اپنے بال نوچنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا دماغ ابھی پھٹ جائے گا اور پھر اچانک...... میرے دماغ میں......ایک خوفناک خیال آیا' کیوں نا میں رمشا کو اپنے ہاتھوں سے مار دوں؟ میں نے اس خیال کو اپنے دماغ میں دہرایا۔

''نہیں......نہیں...... میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اپنی گڑیا کو نہیں مار سکتا۔''

''لیکن اس طرح روز روز مرنے سے تو بہتر ہے کہ یہ ایک ہی دفعہ مر جائے' اس طرح اسے ان تمام تکالیف سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔'' میرے اندر کوئی ظالم بولنے لگا تھا۔

''نہیں......نہیں......ایسا کبھی نہیں ہو سکتا' میں بھلا اپنی جان' اپنی زندگی کو کیسے مار سکتا ہوں؟'' میں نے رمشا کو سینے سے بھینچ لیا۔

رمشا کسمسا کر اٹھ گئی تھی۔ ''کیا ہوا ابو......! آپ رو تو نہیں رہے؟ میں نے آج اللہ میاں سے بہت ساری دُعائیں مانگی ہیں' اللہ میاں مجھے ضرور ٹھیک کر دیں گے۔''

''ہاں بیٹا......!انشاءاللہ!'' میں اُسے پیار کرتا ہوا بولا اور رومال سے اس کے چہرے سے خون صاف کیا۔ وہ دوبارہ نیم بے ہوشی کی حالت میں چلی گئی تھی۔

اگلے دن میرے ذہن میں نیکی اور بدی کے درمیان جنگ چلتی رہی' ہاں' نا' ہاں' نا' کی تکرار ہوتی رہی۔ رمشا نے کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا' بس میرا ہاتھ پکڑے مجھے یک ٹک دیکھے جاتی۔ آخر میرے اندر کا ظالم جیت گیا اور میں نے رمشا کو موت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بھی کتنا خود غرض تھا' اپنے آپ کو مارنے کا نہیں سوچا لیکن میں زندہ ہی کب تھا' میں تو اسی دن مر گیا تھا جب ڈاکٹر کا آخری فون آیا تھا۔

''اچھا ہے' میری بچی اس روز روز کی اذیت سے نجات پا لے گی اور ہمیشہ کے لیے سکون پا لے گی۔'' میں نے دیوانگی کے عالم میں سوچا تھا۔

اگلے دن رات کو میں نے رمشا کو زبردستی اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا اور اس سے بولا۔ ''چلو رمشا......! میں آج تمہیں سمندر کی سیر کروا کر لاتا ہوں۔''

رمشا خوش ہو گئی اور نقاہت سے بولی۔ ''ابو......! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ مجھے اٹھا اٹھا کر تھک جائیں گے۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

''نہیں بیٹا......! مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں افسردگی سے مسکرا کر بولا۔ وہ خوشی سے میرے سینے سے لگ گئی۔ بے ساختہ میرے آنسو نکل پڑے تھے۔ وہ پگلی سمجھی کہ مجھے اس کی ماں یاد آ رہی ہے پھر میں نے رمشا کو موٹر سائیکل کی ٹنکی پر بٹھایا اور ہم دونوں چل پڑے۔ راستے میں رمشا کی طبیعت پھر خراب ہو گئی اور اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ میری بچی جسے مجھے حوصلہ دینا چاہیے تھا' وہ مجھے حوصلہ دے رہی تھی۔ آخر میں اسے لے کر سمندر کے ایک ایسے حصے میں آ گیا جہاں اکثر دو چار کشتیاں بندھی رہتی تھیں' وہاں کافی اندھیرا تھا۔

''ابو......! یہاں تو بہت اندھیرا ہے۔ ہم کیسے گھومیں گے؟'' وہ معصومیت سے بولی۔

''میں ہوں نا بیٹی......! تم گھبراؤ مت' میں تمہیں گھماؤں گا اور کشتی کی سیر بھی کراؤں گا۔''

ساحل پر ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا' ایسے میں مجھے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا' رمشا تو پھر بچی تھی۔ میں اسے سینے سے لگائے لگائے ایک چھوٹی سی کشتی تک پہنچ گیا' وہاں دور دور تک کسی کا نام و نشان نہیں تھا جو ہمیں دیکھتا۔ میں نے رمشا کو کشتی میں بٹھا دیا اور کشتی کی رسی کھول کر اسے سمندر میں دھکیل دیا۔ ساحل پر سے میں نے ایک وزنی پتھر اٹھا کر کشتی میں پہلے ہی رکھ لیا تھا۔ رسی بھی میرے پاس موجود تھی۔ کشتی سمندر میں کافی آگے نکل آئی تھی۔ میں نے اپنے جگر کے ٹکڑے کی کمر کے ساتھ رسی باندھی اور دوسرے کونے پر پتھر باندھ دیا۔ رمشا میرے سینے سے لگی جا رہی تھی۔ وہ بار بار مجھے پیار کر رہی تھی' اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟

''ابو......! آپ یہ کیوں کر رہے ہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''بیٹا......! اس لیے کہ تم کہیں نیچے پانی میں گر نہ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے ابو......!'' اس پر غنودگی کا دورہ پڑ رہا تھا' اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے تھپکنا شروع کر دیا۔ آخر وہ میرے سینے پر سر رکھ کر گہری نیند سو گئی۔ میری بچی بہت دنوں بعد سوئی تھی۔ میں کافی دیر تک اسے سینے سے لگائے روتا رہا پھر میں نے آخری بار اپنے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے الگ کیا' ماتھے پر بوسہ دیا اور پھر......اور پھر......''

عظیم صاحب بے تحاشہ رونے لگے۔ ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ ان کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے بھی سکتہ ہو گیا ہو۔ میں چبوترے سے اٹھ کھڑا ہوا' میرے اندر سنسنی سی دوڑ رہی تھی' میں چپ چاپ کھڑا عظیم صاحب کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔

''پھر......پھر میں نے اپنی رمشی' اپنی گڑیا کو اپنے ہاتھوں سے سمندر کے حوالے کر دیا......وہ میری معصوم پری جیسی بچی جس نے دنیا میں تکلیفوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا' چپ چاپ پانی میں غرق ہو گئی...... میں نے اُسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا' موت کی آغوش میں شاید اسے سکون مل جاتا' میں اپنی بچی کا قاتل ہوں مگر میں کیا کرتا' میں بہت بے بس ہو گیا تھا۔ اس کی بیماری سے لڑتے لڑتے ہار گیا تھا' جس اذیت اور تکلیف میں وہ مبتلا تھی' مجھ سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ میں نے اپنی پھول سی بچی کو قتل کیا مگر میرے پاس اس کے سوا کوئی چارا بھی نہیں تھا۔ میں اپنی رمشی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا' نہیں دیکھ سکتا تھا۔'' عظیم صاحب فرش پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگے۔ میں بھی انسان تھا اور حساس دل رکھتا تھا' میرا دل بھی بھر آیا تھا اور آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ میں عظیم کو کیا کہتا' رمشا کا قاتل یا پھر ایک دردمند دل رکھنے والا باپ؟ میں نے رمشا کی اذیت کو دیکھ کر یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اچانک چھت پر پانی کی ٹنکی کے قریب ہلکی سی روشنی ہوئی اور رمشا کا ہیولہ نظر آنے لگا۔

''ابو......! آپ نہ روئیں' میں نے آپ کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ میں نے آپ کو دکھ بھی تو بہت دیئے ہیں۔ میں جب سے پیدا ہوئی ہوں' آپ کو پریشان ہی کیا

ہے مگر ابو......! میں کیا کروں، آپ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی، مجھے آپ کے پاس آنا ہے، آپ کے سینے سے لگ کر سونا ہے۔ ابو......! میں کئی راتوں سے نہیں سوئی، مجھے رات کو اکیلے بہت ڈر لگتا ہے۔ ابو......! مجھے آپ کی گود میں سونا ہے۔" رمشا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

عظیم صاحب اپنی بیٹی کو سامنے دیکھ کر اور زیادہ جذباتی ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ میں انہیں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ رمشا مر چکی ہے اور اس کی روح انہیں تلاش کر رہی ہے۔

"بیٹا......! میں خود تیرے بغیر مر گیا ہوں......" انہوں نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ "گڑیا......! تیرے بغیر بھی کوئی زندگی ہے، کوئی جینا ہے لیکن...... لیکن میری جان......! میں تجھے اپنے پاس واپس کیسے لاؤں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے جو کچھ کیا، اس کے لیے میرا اللہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا لیکن بیٹا......! تو اپنے مجبور باپ کو معاف کر دینا میری رمشی......! میری جان......! میں تجھے واپس نہیں بلا سکتا، نہیں بلا سکتا۔" عظیم صاحب زار و قطار روتے ہوئے فرش پر بیٹھ گئے۔

اور پھر میں نے دیکھا، عظیم صاحب ایک دم چپ ہو گئے، اُن کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور اُن کے چہرے پر ایک کرب ناک مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ اچانک وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑانے لگے۔ "میں تجھے واپس تو نہیں بلا سکتا اگر...... اگر تو میرے پاس نہیں آ سکتی...... نہیں آ سکتی تو کیا ہوا، میں تو تیرے پاس آ سکتا ہوں۔ ہاں، ہاں، میں تیرے پاس آ سکتا ہوں پھر ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا......" یہ کہہ کر عظیم صاحب تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھے اور بلڈنگ کی چھت سے چھلانگ لگا دی۔

یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ میں ہکا بکا رہ گیا، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عظیم صاحب اتنا بڑا فیصلہ کر کے اس پر فوری عمل بھی کر دیں گے۔ لائٹ اچانک آ گئی تھی، میں نے چھت سے نیچے جھانک کر دیکھا، عظیم صاحب کا خون میں لت پت وجود زمین پر پڑا نظر آ رہا تھا، لوگوں کی بھیڑ آہستہ آہستہ ان کے گرد جمع ہو رہی تھی، اتنی اونچائی سے گرنے کے بعد کسی کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، چھت بالکل سنسان تھی، رمشا کا دور دور تک پتا نہیں تھا......

اس واقعے کو بہت سے دن گزر گئے۔ میں اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا اور پھر ایک دن زندگی کے جھمیلوں سے گھبرا کر سکون حاصل کرنے کے لیے میں سمندر کے اسی پوائنٹ پر پہنچ گیا۔ میرا ذہن پژمردہ سا تھا، رات کی تاریکی میں اسی ٹیلے پر بیٹھا میں سگریٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ میری سوچ کے دریا میں جوار تعاش سا اٹھ رہا تھا، اچانک اس پر سکوت چھا گیا۔ میری نظریں ساحل پر دوڑتے ہوئے دو ہیولوں پر پڑی تھیں۔ ایک ہیولہ کسی بچی کا تھا اور دوسرا کسی مرد کا۔ بچی، مرد کے ہیولے کے پیچھے مٹی کا گولہ لے کر بھاگ رہی تھی اور مرد اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک مرد کے ہیولے نے پلٹ کر بچی کو گود میں اٹھا لیا اور ہوا میں اچھال کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

میرے دماغ میں ایک چھناکا سا ہوا، یہ یقیناً عظیم اور رمشا تھے۔ میں انہیں کیسے بھول سکتا تھا؟ ممکن ہے، آپ میں سے بہت سے لوگ کہیں کہ یہ نظر کا دھوکہ ہو گا لیکن میں جانتا ہوں، یہ فریب نظر نہیں تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا، وہ سب ایک حقیقت تھی، زندہ اور سچی حقیقت۔

نسرین رانا

شجرِ ممنوعہ

رسا چغتائی کا خیال

زندگی کس شجر کا سایہ ہے
موت کس دشت کی مسافت ہے

اُس عجیب درخت کے پُراسرار واقعات جو تنہائی پسند تھا

"آپ نے کبھی پریاں دیکھی ہیں؟" اس سوال کے جواب میں یقیناً آپ سب ہی نفی میں سر ہلائیں گے۔ میں نے بھی کبھی پریاں نہیں دیکھی ہیں پر مجھے پریاں دیکھنے کا بے حد شوق تھا اور ہے۔ میں نے اپنی دادی، نانی سے پریوں کے حوالے سے کئی واقعات سنے ہیں بلکہ دوسرے لوگوں سے بھی پریوں سے متعلق باتیں سنی ہیں۔

کہتے ہیں، پریاں پرستان میں ہوتی ہیں اور



پرستان کہاں ہے؟ کوئی کہتا ہے' زمین پر' کوئی کہتا ہے آسمان پر......

بچپن سے مختلف قصے سنتی آئی ہوں۔ ان قصوں میں کہاں تک سچ ہے' یہ تو معلوم نہیں البتہ وہ واقعات جو لوگوں کو پیش آئے ہیں اور جس کے وہ خود گواہ ہیں' ان میں سے کچھ آپ کے گوش گزار کرتی ہوں۔

کہتے ہیں کہ انار کا درخت گھر میں نہیں لگانا چاہیے' اس پر پریوں کا سایہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں' انار کا درخت باغ میں لگانا چاہیے کیونکہ یہ تنہائی پسند ہوتا ہے یعنی اکیلے رہنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اب یہ بات کس حد تک درست ہے لیکن اس حوالے سے چند ایک واقعات ہیں جنہیں پڑھ کر شاید آپ کچھ اندازہ لگا سکیں کہ انار کے درخت کے متعلق یہ بات کس حد تک درست ہے۔

میں آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ سناتی ہوں جس سے آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ انار کا درخت گھر میں لگانا چاہیے یا نہیں؟

ہماری گلی میں حکیم صاحب رہتے تھے' وہ حکیم تھے یا نہیں' یہ تو بڑے جانتے تھے۔ سنا تھا' کسی زمانے میں حکمت کرتے تھے اسی لیے محلے بھر میں حکیم صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ حکیم صاحب کے گھر میں انار کا درخت تھا' وہ درخت زیادہ بڑا تو نہیں تھا۔ محلے کے اکثر لوگ انہیں کہتے تھے کہ یہ درخت کٹوا دو مگر وہ نہیں مانتے تھے۔

ایک دفعہ گلی کے ایک صاحب نے حکیم صاحب کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ''حکیم صاحب! آپ کے گھر میں انار کا درخت ہے؟''

''جی ہاں ہے تو پھر؟'' حکیم صاحب چشمے میں سے گھورتے ہوئے بولے۔

''بڑے کہتے ہیں' انار کا درخت گھر میں نہیں لگانا چاہیے' یہ تنہائی پسند ہوتا ہے یعنی اکیلا رہنے کا عادی ہے۔''

''میاں! پڑھ لکھ کر ایسی فضول باتیں کرتے ہو۔ پھل دار درخت تو اچھا ہوتا ہے۔'' حکیم صاحب نے برا مانتے ہوئے کہا۔

''حکیم صاحب! انار کا درخت گھر میں لگانے سے پریشانیاں آتی ہیں۔ میری مانیں تو اسے کٹوا دیں۔''

''عجیب بات کر رہے ہو' اچھے بھلے درخت کو خواہ مخواہ کٹوا دوں؟ یہ فضول مشورے اپنے پاس ہی رکھو میاں......!'' حکیم صاحب بڑبڑاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ کئی دوسرے لوگوں نے بھی اسی طرح انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر جب وہ نہ مانے تو سب خاموش ہو گئے تھے۔

کچھ عرصے بعد اچانک حکیم صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کی اس طرح ایکا یک موت پر سب کو حیرانگی تھی کیونکہ وہ پوری طرح صحت مند تھے اور انہیں کوئی مرض بھی نہیں تھا۔ چنانچہ محلے والوں نے ان کی موت کا سبب انار کے درخت کو ہی گردانا تھا۔ حکیم صاحب کی فیملی خاصی بڑی تھی۔ کئی رشتے دار ان کے ساتھ رہتے تھے۔ محلے والوں نے حکیم صاحب کی فیملی کو سمجھایا کہ وہ درخت کٹوا دیں مگر انہوں نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔

دن یونہی گزرتے رہے' ابھی حکیم صاحب کو گزرے سال بھر بھی نہ ہوا تھا کہ اُن کی بیگم بھی چل بسیں۔ ان کی موت بھی اچانک ہوئی تھی لہٰذا لوگوں کا تشویش میں مبتلا ہونا فطری تھا۔ لوگوں نے حکیم صاحب کے بچوں کو سمجھایا کہ انار کا درخت کٹوا دو' یہ اکیلا پن مانگتا ہے مگر بچوں نے بھی ان باتوں پر دھیان نہیں دیا اور یہ کہہ کر کہ یہ سب اللہ کی مرضی ہے اور اس قسم کی باتیں جہالت کی نشانی ہوتی ہیں' ان باتوں پر مذاق اڑایا تھا۔ محلے والے خاموش ہو گئے تھے۔

دن گزرتے رہے' سال بھر بعد حکیم صاحب کے گھر میں پھر ایک موت ہو گئی۔ ان کا جوان بیٹا چلا گیا۔ جوان موت پر تو گھر والوں کا جو حال تھا' وہ اپنی جگہ مگر محلے والے بھی بے حد دکھی تھے۔ ساتھ ہی انہیں افسوس تھا کہ اگر انار کا درخت کٹوا دیا جاتا تو جوان بچہ ہاتھوں سے نہ جاتا۔ حکیم صاحب کے بیٹے کی تجہیز و تدفین کے بعد لوگوں نے پھر سمجھایا کہ انار کا درخت آپ کے گھر کے لیے صحیح نہیں ہے' یہ باغ میں لگاتے ہیں جہاں انسان نہیں' صرف پیڑ پودے ہوتے ہیں۔ گھر میں تین اموات ہو چکی ہیں' اب تو خیال کرو۔ اس بار وہ لوگ چپ ہو گئے تھے لیکن اب بھی فیملی کے اکثر افراد اس درخت کو کٹوانے کے حق میں نہیں تھے لہٰذا ان ہی کی وجہ سے انار کا درخت نہیں کٹ سکا تھا۔

دن یونہی گزرتے رہے' وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ جوان موت کو بھی گھر والے بھول گئے اور اس صدمے سے سنبھل گئے۔

قریباً ڈیڑھ سال بعد حکیم صاحب کے گھر میں پھر ایک موت ہو گئی۔ اس بار حکیم صاحب کی بہن تھیں۔ وہ بیوہ تھیں اور بیوگی کے بعد سے حکیم صاحب کے گھر میں رہ رہی تھیں۔ لوگوں نے پھر سمجھایا' کچھ نے تو یہ تک کہہ دیا۔ ''کیا گھر کو قبرستان بنانا چاہتے ہو؟ گھر عزیزوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے اور تم لوگ اپنی ضد پر اڑے ہو۔ آج ہم آخری بار سمجھا رہے ہیں پھر نہ سمجھائیں گے۔ تمہاری مرضی' چاہے انار کا پیڑ کٹواؤ یا نہ کٹواؤ' ہماری بلا سے۔''

لوگ واقعی ان سے ناراض ہو گئے تھے۔ حکیم صاحب کی فیملی پڑھی لکھی مشہور تھی مگر اس بار محلے والوں کی باتوں سے وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ واقعی محلے والے صحیح کہہ رہے ہیں کہ انار کا پیڑ منحوس ہے' اسے کٹوانا ہی بہتر ہے۔ آخر کار سب ہی اس بات پر متفق ہو گئے کہ انار کا درخت کٹوا دینا چاہیے اور پھر ایک روز حکیم صاحب کے گھر کا وہ انار کا درخت کٹ گیا تو محلے والوں نے سکون کا سانس لیا۔ اب لوگوں کو یقین تھا کہ ہر سال حکیم صاحب کے گھر میں جو کسی نہ کسی کی موت ہوتی ہے' وہ اب نہیں ہو گی اور حیرت انگیز طور پر ہوا بھی ایسا ہی۔

کئی سال گزر گئے' اللہ کا شکر کہ حکیم صاحب کے گھر میں کوئی موت واقع نہیں ہوئی ہے۔ گھر والے خوش ہیں' سکون سے ہیں اور ساتھ محلے والوں کو بھی اطمینان ہے۔

انار کے درخت کے حوالے سے ایک اور بھی کہانی ہے۔ وہ واقعہ بھی سچا ہے۔ یہ واقعہ پریوں کے متعلق ہے' جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا تھا۔

میری چھوٹی بہن افشاں کی ایک دوست رضوانہ ہے' اس کی والدہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس قصے کو ان کی زبانی سنیے۔

''میرا نام جمیلہ ہے۔ میرا گھر اچھا خاصہ بڑا ہے۔ محبوب خان سے میری دوسری شادی ہے۔ پہلے شوہر سے دو بچے ہیں ایک لڑکا' ایک لڑکی۔ لڑکے کا نام عمر اور لڑکی کا نام شمع ہے۔ محبوب خان کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہے یعنی میری اور میرے شوہر دونوں کی دوسری شادی تھی۔

میں اپنے ساتھ دو بچوں کو لے کر آئی تھی جنہیں

اجنبیت

اِس بھرے پُرے شہر میں
آج اُس سے مل کر
یہ جانا
کہ اجنبیت کے چہرے پر
آنکھوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا

سحر علی

میرے شوہر نے باپ کا پیار دیا اور ہماری زندگی ہنسی خوشی گزرنے لگی۔

محبوب خان سے میرے آٹھ بچے پیدا ہوئے ہیں۔ چار لڑکیاں اور چار لڑکے۔ یہ سارے بچے رنگ کے معاملے میں اپنے باپ پر گئے ہیں یعنی سارے کے سارے کالے ہیں۔ میں بہت گوری چٹی ہوں اور پہلے شوہر سے ہونے والے میرے دونوں بچے شمع اور عمر بھی گورے ہیں' یوں گھر میں ہم تین افراد بہت گورے ہیں اور میرے دوسرے شوہر سمیت سارے بچے کالے ہیں۔

میں جو واقعہ سنانے جا رہی ہوں' یہ اُس وقت پیش آیا جب میرا بیٹا سعید ہونے والا تھا۔ محبوب خاں سے پہلا بیٹا سعید ہے جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ شمع اور عمر پہلے شوہر سے ہیں اور بچوں میں سب سے بڑے ہیں۔ سعید کے بعد صفیہ' ریحانہ' اصغر پھر عاشی' شبیر' رضوانہ اور سب سے آخر میں آصف ہے۔

میرا گھر کافی بڑا ہے۔ ہم نے اپنے گھر میں ہر قسم کے پھول پودے لگائے ہیں۔ ہمارے گھر میں انار کا درخت بھی ہے جس پر خوب انار آتے ہیں' یوں کہنا چاہیے کہ وہ درخت انار سے لدا ہوا ہوتا ہے۔

میرے شوہر رات کو دیر سے آتے تھے۔ ایک روز جب محبوب نے مجھ سے کہا کہ میری نائٹ ڈیوٹی لگ گئی ہے تو میں پریشان ہوگئی کیونکہ مجھے رات کے وقت صحن کی طرف جانے سے ڈر لگتا تھا۔ چنانچہ میں سوچنے لگی کہ میں اکیلے کیسے رہوں گی؟ دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا اور اُن دنوں میں امید سے بھی تھی۔ سعید کی ولادت ہونے والی تھی' تب میں نے سوچا کہ جب تک محبوب کی نائٹ ڈیوٹی رہے گی' تب تک اپنے بڑے بھائی کو بلوا لینا چاہیے۔ بھائی میرے پاس رک جائیں گے' اس طرح مجھے ڈر نہیں لگے گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے بھائی کو بلوا لیا۔ محبوب نائٹ ڈیوٹی کے لیے چلے جاتے تھے اور بھائی گھر میں ہوتے تھے۔ بھائی کے آنے سے مجھے حوصلہ مل گیا تھا۔

....

ایک رات میں سو رہی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ وہ تقریباً دو ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ آنکھ کھلنے پر مجھے پیاس لگی تھی' پیاس کا احساس ہوتے ہی میں پلنگ سے اٹھی اور صحن کی طرف جانے لگی۔ ابھی صحن میں پہنچی ہی تھی کہ میری نظر انار کے درخت پر پڑی۔ اُن دنوں انار کا درخت انار کے پھولوں سے لدا ہوا تھا اور بہت گھنا لگ رہا تھا۔ جوں ہی درخت پر میری نظر پڑی تو میں پلکیں جھپکنا بھول گئی۔

وہ بے حد حسین لڑکی تھی اور انار کے درخت کے پاس کھڑی تھی۔ اس کی توجہ درخت کی طرف تھی اور وہ بڑی محویت سے اسے گھور رہی تھی۔

میں حیرت سے گم صم کھڑی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس حسین لڑکی کا حسن تو بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کا گول چہرہ تھا' ناک نقشہ بے حد حسین تھا' اس کی آنکھیں بہت بڑی اور بے حد خوبصورت تھیں' آنکھوں کی خوبصورتی ایسی تھی جیسے پریوں کی کہانیوں میں بتائی جاتی ہے۔ آنکھوں کی بناوٹ گولائی میں تھی اور باہر کو نکلی ہوئی تھیں' ہونٹ بہت خوب صورت گلابی تھے' ناک پتلی اور لمبی تھی اور اس کے بال کمر تک لمبے' سنہری اور گھنے تھے۔

میں اس کے حسن میں ایسے کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ یقیناً کوئی پری ہی تھی' تاہم اس کے پر میں نے نہیں دیکھے تھے۔ میں ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

اس حسین لڑکی کے چہرے سے شعاعیں نکل رہی تھیں جس سے اس کے چہرے کے اردگرد روشنی کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا۔ اس کا گول چہرہ روشنی میں بے حد حسین لگ رہا تھا' جس طرح چاند کے گرد روشنی کا ہالہ ہوتا ہے' اسی طرح اس حسین پری کا چہرہ اس ہالے میں چمک رہا تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اس قدر حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا ملکوتی حسن ایسا تھا کہ میں عورت ہوتے ہوئے بھی اسے دیکھ کر مدہوش سی ہوگئی تھی۔ اگر کوئی مرد اسے دیکھ لیتا تو یقیناً پاگل ہی ہو جاتا۔ میں اس لڑکی کو دیکھنے میں محو تھی' اُدھر میرے بڑے بھائی نے میرا پلنگ خالی دیکھا تو وہ مجھے تلاش کرتے صحن میں آ گئے۔

''زرینہ......!'' انہوں نے مجھے صحن میں یوں گم صم کھڑا دیکھا تو پکارا۔ اُن کی آواز پر میں اس طرح چونکی تھی جیسے اچانک ہوش میں آئی ہوں۔ میں نے ہڑبڑا کر بھائی کی طرف دیکھا۔

''یہاں صحن میں اکیلی کھڑی کیا کر رہی ہو؟'' بھائی نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بھائی......! دیکھیں' کتنی حسین لڑکی ہے۔'' میں نے انار کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کہاں؟ وہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' بھائی نے انار کے درخت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گئی' وہاں واقعی کوئی نہیں تھا یعنی بھائی کے آتے ہی وہ حسین لڑکی غائب ہوگئی تھی۔

میں مضطرب سی بار بار انار کے درخت کو دیکھ رہی تھی' وہ ایک دم سے غائب ہوگئی تھی۔

''چلو' اندر چلو' بھائی مجھے اندر لے آئے اور خود پانی لا کر مجھے پلایا۔ ''پانی پیو اور سونے کی کوشش کرو۔''

غزل

کسی دن ترے غم بھلا ہی تو دیں گے
مگر داغ ان کی گواہی تو دیں گے

نکلتے ہیں شعلے جو باتوں سے تیری
وہ ہستی کو میری جلا ہی تو دیں گے

سرِ شام بہتے ہیں آنکھوں سے آنسو
یہ اک روز تجھ کو بہا ہی تو دیں گے

کسی کی دعاؤں کے بادل گھنیرے
سرِ دشت لو سے بچا ہی تو دیں گے

غریب وطن ہوں' ترے شہر والے
نشانہ ستم کا بنا ہی تو دیں گے

سرِ بام تو نے دیا جو رکھا ہے
یہ طوفان کسی پل بجھا ہی تو دیں گے

پہاڑوں سے اونچے مرے دکھ ہیں راجا
مجھے یہ خدا سے ملا ہی تو دیں گے

ایم اے راجا

"بھائی......! میں سچ کہہ رہی ہوں، وہاں انار کے پیڑ کے پاس ایک بے حد حسین لڑکی کھڑی تھی، وہ انار کی کلی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے خود دیکھا ہے۔"
میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمہارا وہم ہے۔ پانی پیو اور سو جاؤ۔"

میں نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا، پانی پیتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ میں پانی پینے کے لیے ہی تو اٹھی تھی مگر پھر وہ لڑکی...... جانے کون تھی؟ یہاں ہمارے گھر کیوں آئی تھی اور اس قدر حسین کہ آج تک میں نے اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ پانی پی کر میں گلاس ہاتھ میں لیے سوچوں میں گم تھی۔ بھائی نے پھر پکارا۔

"زرینہ......!"

"جی......!" میں ایک بار پھر چونک کر سوچوں سے نکل آئی۔

"گلاس رکھو اور سو جاؤ۔" وہ گلاس مجھ سے لیتے ہوئے بولے۔

میں سونے کے لیے لیٹ گئی مگر نیند تو لگتا تھا، اس حسین لڑکی کے ساتھ ہی چلی گئی ہے۔ اس اپسرا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے بار بار آ رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی۔ 'کاش، بھائی مجھے آواز نہ دیتے تو میں اسے جی بھر کر دیکھ سکتی یا اس سے بات کر لیتی۔'

میرا خیال ہے کہ وہ انار کی کلی لینے آئی تھی کیونکہ میں نے سنا ہے، پریاں انار کی کلی لینے آتی ہیں۔ وہ رات کے اس پہر انار کی کلی لینے آئی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ میں کھڑی اس حسینہ کو دیکھ رہی ہوں۔ جب بھائی نے مجھے آواز دی تو اسے احساس ہوا اور وہ غائب ہو گئی......

"کاش، وہ پھر سے آ جائے......" میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

بچپن میں پریوں کے بہت سے قصے، کہانیاں میں نے اپنی نانی، دادی سے سنے ہیں اسی لیے مجھے پریاں دیکھنے کا شوق تھا۔ میری طرح اوروں کو بھی بچپن سے اشتیاق ہوگا کہ پری دیکھیں، پریوں سے ملیں، پرستان دیکھیں۔

میں نے پرستان تو نہیں دیکھا لیکن اس رات پری کو ضرور دیکھ لیا۔ ہاں، وہ یقیناً پری ہی تھی لیکن پر تو میں نے دیکھے نہیں تھے مگر بے شک وہ پری ہی تھی۔ وہ انار کی کلی لینے آئی تھی کیونکہ ہماری نانی، دادی بھی کہتی تھیں کہ پریاں انار کے درخت کے پاس ضرور آتی ہیں، وہ انار کی کلی کی دیوانی ہوتی ہیں۔

آج اس بات کو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ اس واقعے کے بعد ہی محبوب سے میرا پہلا بیٹا سعید ہوا تھا اور اب سب ہی بچے جوان ہیں بلکہ میں چار بیٹوں اور بچیوں کی شادی کے فرض سے بھی سبکدوش ہو چکی ہوں۔ یہ واقعہ میرے ذہن کی اسکرین پر اب تک نقش ہے۔"

......✦......

جمیلہ آپا کی کہانی آپ نے پڑھی، آپ سوچ رہے ہوں گے، اس کہانی میں تو کوئی موت نہیں ہوئی حالانکہ جمیلہ آپا کے گھر میں بھی انار کا درخت تھا۔ آپ کی طرح میں بھی یہی سوچتی ہوں مگر اس حوالے سے ہم ایک بات اور بھی کہہ سکتے ہیں چونکہ ان کے گھر میں کئی پودے اور درخت اور بھی تھے یعنی ایک چھوٹا سا باغ سا تھا، شاید اسی لیے انار کے درخت نے گھر کے کسی فرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہو۔ بہرحال حقیقت کیا ہے، اللہ بہتر جانتا ہے۔

میں نے انار کے درخت کے حوالے سے دو مختلف سچے واقعات آپ کے گوش گزار کر دیے ہیں۔ اب آپ اس پر یقین کریں یا نہ کریں، آپ کی مرضی البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ جن کے ساتھ یہ واقعات پیش آئے ہیں، وہ کردار جیتے جاگتے اور حقیقی ہیں۔

میرے شہر کی کہانی — شہر کراچی میں جنم لینے والی کہانیوں کا نیا خاص سلسلہ

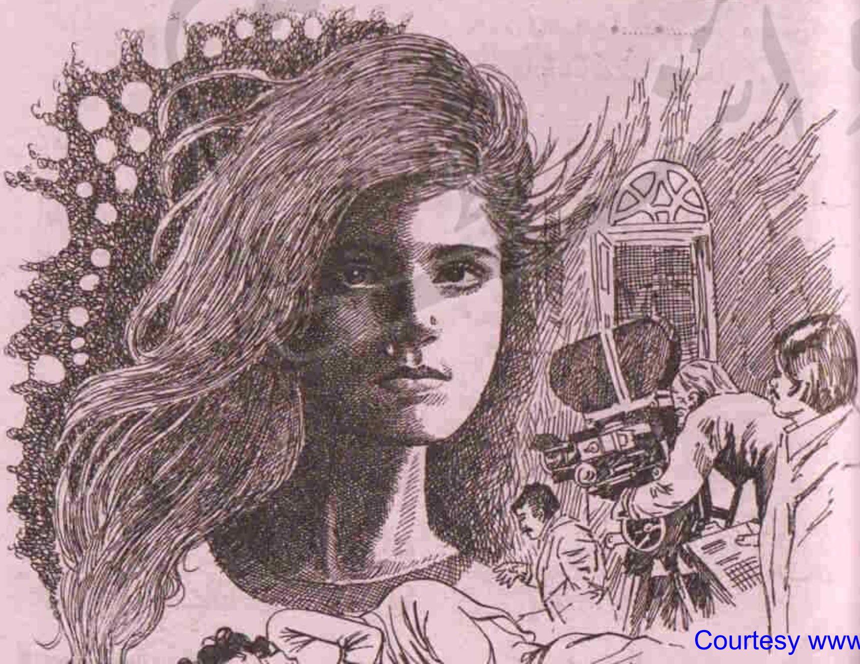
ارم زہرا

ہاں! میں قاتل ہوں

مہناز بٹ ناز کا خیال

میں بظاہر ہوں چپ چاپ لیکن
میرے باطن میں محشر بپا ہے

شوبز کی رنگین دنیا میں چھپی ایک مکروہ حقیقت آشکار کرتی جرم کہانی



"اوہ ہو' آج تو غضب ڈھا رہی ہو' سچ' یہ بلیک کلر تم پر بہت جچتا ہے۔" ریحان نے سامنے بیٹھی جیسمین کو مخاطب کیا تو وہ جواباً مسکرا دی۔

"یار' آج بہت تھک گئی ہوں' ریمپ پر چلنا اتنا آسان نہیں۔" جیسمین نے اونچی ہیل کا سینڈل ہوا میں لہراتے ہوئے دوسری طرف اچھالا۔

"کیسی رہی ریہرسل؟" ریحان اب جیسمین کے قریب آ گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"آج کی کیٹ زبردست رہی' ارے' اس اجالا کے چہرے کی تو رنگت ہی بدل گئی' جب انسٹرکٹر نے میرے اسٹائل سے چلنے کی تعریف کی۔ یو نو' شی لو ہائی فگر۔"

"اوہ یس مائی بے بی ڈارلنگ' یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے' تمہاری خوبصورتی اور فگر کے آگے وہ اجالا کچھ بھی نہیں۔" ریحان نے شوخی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ' تمہارا شوٹ کیسا رہا؟" جیسمین اپنے شولڈر کٹ بالوں کو سنوارتے ہوئے بولی۔

"اوئے ہوئے' نہ پوچھو' آج تو میں نے ڈائریکٹر کو لاجواب کر دیا' کہہ رہا تھا' اگلے ڈرامے میں تم ہی میرے ہیرو ہو گے۔" ریحان نے ڈریسنگ ٹیبل پر نظریں گاڑتے ہوئے جیسمین کی شبیہہ کو آنکھ ماری تو جواباً وہ بھی مسکرا دی۔

"ویسے سائیڈ رول کرنے سے امیج خراب ہوتا ہے' تم بھی فول ہو' ڈائریکٹ ہیرو آنا تھا ناں۔" جیسمین' ریحان کے کان کھینچتے کھینچتے اس کے کندھے پر اب سر رکھ چکی تھی۔

"اگلی بار ڈائریکٹر سے پہلے ہی سیٹنگ بنا لوں گا' ویسے یہ تو سنگل پلے ہے' ذرا مکمل ہونے دو پھر دیکھنا' اگلے پلے میں ہم دونوں ہی ہیرو اور ہیروئن ہوں گے۔"

"ہم دونوں؟" جیسمین نے حیرت سے ریحان کو کن انکھیوں سے دیکھا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"ریئل لائف کے ہیرو' ہیروئن' ڈرامے میں اپنی پرفارمنس دیتے ہوئے اور بھی نیچرل لگیں گے۔"

"یہ تو ہے۔" جیسمین نے ریحان کا کان تقریباً کھینچتے ہوئے کہا تو وہ چلا اٹھا۔

"اتنے نازک سے بدن میں اتنی جان کہاں سے آ جاتی ہے؟ کم آن یار' عاشق ہوں تمہارا' تم سے محبت کرنے کی ایسی سزا مجھے ملے گی' یہ تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔" مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجائے ریحان' جیسمین سے اپنا کان چھڑوانے کی تگ و دو میں تھا جبکہ وہ شوخی میں اپنے عروج کو چھو رہی تھی اور کان کی لو کو اور مضبوطی سے کھینچتی اس کے سرخ پڑتے چہرے کو خوب انجوائے کر رہی تھی۔

"محبت میں شدت پسندی کی قائل ہوں' تمہاری طرح سرد جذبے نہیں رکھتی۔" کان میں سرگوشی کرتی اب وہ کھڑی ہو چکی تھی۔

"اچھا بی سیریس' یہ بتاؤ' کل میرے ساتھ شوٹ پر چلو گی؟ میں تمہیں اپنے ڈائریکٹر صاحب سے بھی ملوا دوں گا۔" ریحان نے پرشوق نظریں اس کے سراپے پر ڈالیں تو وہ اترا گئی۔

"پہلے یہاں سے تو پک اپ ہو جائے پھر جو حکم سرکار کا' آپ جدھر لے چلیں گے' ہم بھی اُدھر ہی چلیں گے۔" جیسمین نے بیگ شولڈر پر ہینگ کیا اور دور پڑی ہوئی سینڈل میں اپنا پیر پھنسایا۔ اب وہ چلنے کے لیے مکمل تیار تھی۔

"تم نے بھی مجھے ڈرائیور بنا ڈالا ہے۔" ڈریسنگ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ انگلی پر گھما رہا تھا۔

"تمہاری ماڈلنگ' ایکٹنگ سے اچھی میری جاب ہے' یہاں کم از کم تمہیں فرضی باتیں تو نہیں کرنی پڑتیں' جیسے ہو' جو ہو' اس سمیت مجھے قبول ہو' آئی مین' ڈرائیونگ کے لیے' میرا مطلب ہے' تم ایک اچھے ڈرائیور ثابت ہوئے ہو۔"

"کیا میں تمہاری نظر میں صرف ایک اچھا ڈرائیور ہوں؟ اور وہ......"

جیسمین کے برجستہ قہقہے نے ریحان کی بات کاٹی تھی۔ "یہ تو وقت بتائے گا کہ تم لائف ٹائم کے لیے ڈرائیور بنتے ہو یا اگلے کچھ گھنٹوں تک۔" جیسمین نے سیٹی کے انداز میں لب سکیڑے تھے اور رقص کرنے والے انداز میں گھوم گئی تھی۔

"تم کبھی نہیں بدلو گی' تمہاری یہی ادائیں تو مجھے بے چین رکھتی ہیں۔" ریحان نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا تھا تو وہ خوش دلی سے مسکرا دی تھی اور پھر دونوں ہی پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔

•......•......•......•

"کہاں ہے تمہارے ڈائریکٹر صاحب؟" جیسمین نے سیٹ پر چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ارے' وہ صرف نام ہی کے نہیں' کام کے بھی راجہ ہیں۔" ریحان نے طنزیہ جواب دیا تھا۔

"یہ بھلا کیا بات ہوئی؟" جیسمین نے منہ بسورتے ہوئے سامنے بیٹھی لڑکی کو کڑی نظروں سے دیکھا تھا جو اسکرپٹ رٹنے میں مشغول تھی۔

"یہ بھی کوئی خوبصورتی ہے' اس سے لاکھ درجے اچھی [illegible]" جیسمین' ریحان کے کان میں سرگوشی کرتی اسے سرتاپا حقارت کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔

"جبھی تو تمہیں یہاں لایا ہوں' دیکھنا' تمہیں ایک ہی نظر میں پسند کر لیا جائے گا۔" ریحان نے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

"ماڈل ہوں میں' ماڈل' ریجیکٹ ہونے کا تو سوال ہی نہیں' فٹنس کا خیال رکھنا آسان نہیں ہوتا' خیر' یہ ساری باتیں تو انڈر اسٹوڈ ہیں۔"

"ارے ریحان' کیسے ہو؟" ہال میں داخل ہوتے ہی راجہ مغل نے معنی خیز نظروں سے جیسمین کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"جی سر' بالکل ٹھیک' زبردست' آپ ان سے ملیے' یہ میری منگیتر ہیں' جیسمین نام ہے ان کا' بہت اچھی ماڈل بھی ہیں۔" ایک ہی سانس میں تعارف کراتے ریحان نے جیسمین کے سراپے پر طائرانہ نظر ڈالی تھی۔

"حیرت ہے' یہ ماڈل ہیں لیکن میری نظروں سے کیوں نہیں گزریں؟ کب آئی ہیں اس فیلڈ میں؟" راجہ مغل نے جیسمین سے سوال کیا تھا۔

"کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا' ایک مشہور ڈیزائنر ہیں' آج کل اُن کے ویڈنگ ملبوسات کی نمائش جاری ہے۔ اس میں دیگر نامور ماڈلز کے ساتھ مجھے بھی موقع ملا۔" جیسمین نے معلومات مفصل طریقے سے بہم پہنچائی تھی۔

"اوہ او کے' او کے' اچھا' چلو ریحان' ڈریس اپ ہو' میک اپ کرواؤ اور جلدی سیٹ پر آ جاؤ' ٹائم جا رہا ہے۔" راجہ مغل اب ریحان سے مخاطب تھا۔

"آپ چلیے' بس میں آیا۔" ریحان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"تم اس فضول سی لڑکی کے ساتھ کام کر رہے ہو؟" جیسمین نے اسکرپٹ کا بغور جائزہ لیتی لڑکی کی

جانب اشارہ کر کے ریحان سے سوال کیا تھا۔
"اب اتنی بری بھی نہیں ہے۔" ریحان نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا تھا۔
"تو ٹھیک ہے، تم اس کے ساتھ مزے کرو اور ہاں اس قدر احتیاط رکھنا، میں تمہاری منگیتر نہیں ہوں، ہم صرف اچھے دوست ہیں۔" سخت لہجے میں جملے ادا کرتی جیسمین اب نخوت سے کبھی اس لڑکی کو تو کبھی ریحان کو تک رہی تھی۔
"یار، سمجھا کرو ناں۔" ریحان منمنایا تھا۔
"ہاں، میں بھی تو تمہیں یہی سمجھا رہی ہوں کہ پلیز، سمجھا کرو۔" وہ دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑتی جارحانہ انداز میں بولی تھی۔
"مس عینی، ان کا میک اپ ابھی باقی ہے۔" ڈائریکٹر راجہ مغل ایک خوبصورت سی لڑکی کے ساتھ ہال میں داخل ہوا تھا تو ریحان اور جیسمین سنبھل کر بیٹھ گئے تھے۔ "ریحان، فوراً میک اپ روم میں چلو۔" راجہ مغل، ریحان کو آرڈر دینے کے بعد اب سیٹ پر دوسری چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا جبکہ جلتی کڑھتی جیسمین اسے نخوت سے دیکھ رہی تھی، اس کے وجود کو نظرانداز کرنا اتنا آسان نہیں تھا لیکن ڈائریکٹر راجہ مغل شاید جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا۔
"اونہہ، میں اپنی اور انسلٹ برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اب وہ ریحان کا نمبر ڈائل کیے اسے انفارم کر رہی تھی کہ ہاں ریحان، او کے، آئی ایم بیک، تم مزے کرو۔" اور پھر ریحان کی کچھ بھی سنے بنا اس نے کال کاٹی تھی اور موبائل پرس میں ڈالتی اس پروڈکشن ہاؤس سے باہر نکل گئی تھی۔

•......•......•

"اپنے آپ کو منوانے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ دوسروں کو کم تر گردان کر ان کی تذلیل کر کے ہم خود کو بہتر ثابت کریں؟" دوسرے دن ریحان، جیسمین کے پاس بیٹھا اسے سمجھانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔
"بند کرو اپنا لیکچر...... ٹو دی پوائنٹ بات کرو مجھ سے۔ تمہارا سنگل پلے کچھ زیادہ ہی طویل نہیں ہو گیا؟" جیسمین اب اپنے غصے پر قابو پاتی پوچھ رہی تھی۔
"بس کل لاسٹ کے سین ہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ تم ڈائریکٹر صاحب کی نظروں میں آ گئیں، اگلے پلے کی کاسٹ اور سلیکشن میں، میں انہیں تمہارے لیے راضی کر لوں گا۔" ریحان جذباتی انداز میں بولتا اسے قائل کرنے کی کوششوں میں تھا۔
"ہاں ہاں، جب کی جب دیکھی جائے گی، بس آج کل میں فری ہوں تو دماغ خراب رہنے لگا ہے، سوچ رہی ہوں، کہیں جاب کے لیے اپلائی کر دوں؟" وہ آہستگی سے بولی تھی۔
"نو...... ضرورت نہیں، بس آرام کرو، تمہارے لیے اچھا سا رول میں ڈھونڈ کر لاؤں گا، ویسے تم اپنی ماڈلنگ جاری رکھو، کوئی کمرشل وغیرہ پکڑو یار......" ریحان نے اسے دونوں کندھوں سے جھنجھوڑا تھا۔
"ایک تو ہر جگہ پی آر چلتی ہے، کب تک میں اپنے مفادات کی قربانی دیتی رہوں گی؟ ویسے بھی اتنی ماڈلز میں سے خود کو منوانا مشکل امر تو ہے؟" جیسمین نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا۔
"ارے، مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے اور تمہاری کامیابی کا یقین بھی ہے۔" ریحان نے آہستگی سے اس کے گال کھینچتے ہوئے کہا تھا۔
"بائی دا وے وہ اداکارہ ...... کیا نام ہے اس کا؟" جیسمین نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے سوال کیا۔
"نور......" ریحان نے بلا تامل جواب دیا تھا۔
"ہاں نور، جب اس کے لیے تمہارا ڈائریکٹر راضی ہے تو پھر میں تو کسی سے کم نہیں ہوں ناں؟" وہ بڑے انداز میں خود کو سراہتے ہوئے کہہ رہی تھی جبکہ ریحان اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

•......•......•

ہوٹل کی لابی میں وہ دونوں رات کا کھانا تقریباً کھا چکے تھے، اب آخری شغل چائے کا ہو رہا تھا، ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی نوک جھونک بھی جاری تھی۔
"آج سردی کچھ زیادہ نہیں ہے؟" جیسمین نے شال کو شانوں سے لپیٹتے ہوئے کہا تھا۔
"بھئی، مجھے تو سردی کا موسم بہت پسند ہے، خاص کر سردی سے سرخ پڑتے تمہارے یہ رخسار جن پر شریر لٹیں مسلسل اٹکھیلیاں کر رہی ہیں۔" ریحان نے نادانستگی میں اپنا ہاتھ اس کے رخسار سے ٹچ کیا تھا۔ "کچھ تو خیال کر لیا کرو؟" وہ ریحان کی اس حرکت سے بوکھلا کر بولی تھی۔
"ارے بھئی، دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہوں۔"
"اف......" جیسمین نے یکدم ایک گہری سانس بھری تھی۔ "پتا ہے ریحان، میری بچپن سے خواہش تھی کہ میں ایک نامور ماڈل اور ایکٹر بنوں، میں امی کے دوپٹے کو ساڑی کے انداز میں لپیٹ کر خوب ڈانس کرتی، کمرہ بند کر کے ماڈلز کو ریمپ پر چلتا دیکھ کر بالکل انہی کے انداز میں چلنے کی کوشش کرتی۔ مجھے یاد نہیں کہ کب سے میں اپنی یہ منزل تلاش کر رہی ہوں۔" جیسمین کی آنکھوں کی شفاف سطح امید کی روشنی سے منور نظر آ رہی تھی۔
"ہوں، سمجھ سکتا ہوں کیونکہ میرے اندر بھی یہ شوق جوانی کے ساتھ پنپتا چلا جا رہا ہے لیکن ایک بات سے میں اختلاف رکھتا ہوں۔" ریحان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تھا۔
"کس بات سے؟"
"ہم مصنوعی روشنیوں سے زیادہ دیر تک بہل نہیں سکتے، شوبز کی دنیا، چمک دمک، فلیش لائٹنگ، کٹ ٹو کٹ سین، کیو کی آواز کے پیچھے زندگی کتنی افسردہ ہے، یہ رنگینیاں وقتی ہیں، عروج کی خواہش یقیناً دل کو بڑا اور بہت بڑا کر دیتی ہے لیکن اس سچائی سے ہم بھی پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ ہر عروج کو زوال ہے۔"
"آہ...... ایک تو تم اور تمہارا فلسفہ...... بھئی، مجھے تو روشنیاں عزیز ہیں، ٹپ ٹاپ نظر آنا، میک اپ، نئے ڈیزائن کے کپڑے، واہ، کیا رنگینیاں ہیں، یہی تو زندگی ہے میرے یار، جب تک اپنے آپ کو ایکسپوز نہیں کریں گے، کوئی پیچھے نہیں بھاگے گا ہمارے۔"
"خیر، یہ تمہاری منطق ہے، میرا نظریہ ذرا مختلف ہے مگر جو حکم سرکار کا، جیسے آپ راضی۔" وہ بغیر حیل و حجت اس کی تائید میں سر ہلا رہا تھا۔
"ایک تو میں اس اجالا سے پریشان ہوں، پتا نہیں ایسا کیا جادو کیا ہوا ہے اس ماڈلنگ انسٹرکٹر پر کہ اسے اس کے علاوہ اور کوئی چہرہ بھاتا ہی نہیں رہا؟" جیسمین الجھتے ہوئے بولی تھی۔
"اوہ لیو اٹ، میں آج راجہ صاحب سے بات کرتا ہوں پھر اگر تمہیں مین رول مل جاتا ہے ناں تو تم دیکھنا، سارے کمرشل بنانے والے تمہارے آگے پیچھے ہوں گے، تمہاری خوبصورتی پر جو پردہ پڑا ہے، وہ جلدی ہٹ جائے گا، مجھے بس اپنی بات کرنے کا ڈھنگ بدلنا ہے۔" ریحان نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔
"مجھے اپنی لاحاصل خواہشات کی تکمیل کے

لیے اب آگے بڑھنا ہوگا ورنہ اگر دیر ہوگئی تو یہ جوانی پہلے ساتھ چھوڑے گی اور شوبز کی دنیا تو......" پرسوچ نظروں سے وہ گلاس میں سجے نیپکن کو ایک جھٹکے سے نکال چکی تھی۔

"کل پھر تیار رہنا' ایک نئے پلے کے اسکرپٹ پر راجہ صاحب مجھ سے بات کرنے والے ہیں' تم بھی ساتھ چلو گی۔" ریحان کھڑے ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"ہاں' ٹھیک ہے' اپنے آپ کو منوانے کی خواہش اندر ہی اندر جو تباہی مچا رہی ہے' اس کے خاتمے کے لیے جدوجہد تو کرنی پڑے گی۔" کھوکھلی سی ہنسی کے ساتھ وہ بھی کھڑی ہوگئی تھی۔

"تو اب میڈم کو گھر ڈراپ کرایا جائے؟" ریحان نے اس کے نرم گداز ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہا تھا تو جواباً اس نے ایک شاہانہ انداز میں ہاں کے اشارے کی صورت اثبات میں سر ہلایا تھا۔

٭......٭......٭

"بھئی راجہ صاحب' آپ اپنے نئے ڈرامے کی کاسٹ میں جیسمین کو نہیں بھول جایئے گا۔ مجھے تو حیرت ہے جبکہ اس کے پاس اسکرین بیوٹی ہے' فگر بھی ہے' گوری رنگت بھی ہے پھر نجانے کیوں آپ دیر کررہے ہیں؟" ریحان نے بلاجھجک اپنی بات راجہ صاحب تک پہنچائی تھی۔

"ارے' میں جانتا ہوں لیکن وقت لگتا ہے۔ تم لوگ تو جلد باز نظر آرہے ہو۔" شاطر سی مسکراہٹ آنکھوں میں لیے راجہ مغل' جیسمین کی جانب متوجہ ہوگیا تھا۔

"یہ میرا کارڈ رکھ لو اب تمہیں آنے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی' بس مجھ سے فون پر رابطہ رکھو' جیسے ہی تمہارے لائق کوئی رول نکلا' میں تمہیں انفارم کردوں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" جیسمین نے کارڈ فوراً ہی پرس میں رکھ لیا۔ "اچھا' آپ میرا نمبر بھی نوٹ کرلیں۔" پھر وہ اپنا موبائل نمبر بتانے لگی جو راجہ مغل برق رفتاری سے اپنے موبائل میں save کررہا تھا۔

"چلو میرا کام تو ختم ہوا' اب تم دونوں ڈائریکٹ ہوگئے ہو۔" ریحان نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جیسمین اور راجہ مغل کو دیکھا تھا۔

"اوکے' اب مجھے اجازت دیں۔" جیسمین نے دونوں کو نظر بھر کر دیکھا تھا اور راجہ مغل کا وزیٹنگ کارڈ کا بغور جائزہ لیتی باہر نکل آئی تھی۔

٭......٭......٭

ٹھیک پندرہ روز بعد جیسمین نے پہلی بیل پر ہی راجہ مغل کی کال ریسیو کرلی تھی۔

"اوہ راجہ صاحب' لگتا ہے' ہماری قسمت خوش نصیبی کی طرف گامزن ہوگئی ہے۔" جیسمین نے آواز میں ترنم پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔

"پندرہ روز پہلے آپ سے ہونے والی ملاقات نے مجھے بہت مرعوب کیا تھا۔ اصل میں' میں سچی اور کھری بات کرنے کا عادی ہوں' آپ جب پہلی بار میرے پروڈکشن ہاؤس آئی تھیں تو مجھے کچھ مغرور سی لگی تھیں اور مغرور لڑکیاں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں' صرف حسن ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا' کیمرے کی آنکھ ہر فن مولا شخصیت کی تابع ہوتی ہے۔" راجہ مغل نے جیسمین کو بہت اہم بات سمجھائی تھی۔

"جی' یہ تو ہے۔ اصل میں ماڈلز کی پہلی تربیت یہی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے انداز...... آئی مین' اداؤں سے' نخروں سے' حسن سے سامنے والے کو لبھائیں۔"

"واقعی ماڈلز کو ایسی ہی اداؤں کی ترغیب دی جاتی ہے؟" راجہ مغل نے جیسمین کی بات سن کر معنی خیز انداز میں سوال کیا تھا۔

"ارے راجہ صاحب' یہ ساری باتیں آپ سے کہاں پوشیدہ ہیں لیکن ہائے' یہ آپ کی معصومیت۔" پینترے بدلتی جیسمین ایک گہری سانس لیتی ہوئی بولی تھی۔

"اچھا جیسمین' اس روز تمہارے جانے کے بعد میری ملاقات میرے قریبی دوست فہیم سے ہوئی تھی' ہم دونوں مل کر ایک ٹیلی فلم بنانے کا سوچ رہے ہیں تو کیوں ناں' تم کل آکر مل لو یوں فہیم بھی تم سے مل لے گا اور ڈسکشن بھی ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہے' میں تیار ہوں' کب آنا ہے؟ اسی پروڈکشن ہاؤس میں ناں؟"

"نو' نو' تم یوں کرو' میرے ڈیفنس والے فلیٹ میں آجاؤ۔ اس ٹیلی فلم میں زیادہ تر سین indoor ہیں اس لیے مجھے اس کی لوکیشن کے لیے اپنا فلیٹ زیادہ بہتر لگ رہا ہے۔ خیر' تم بیٹھو' باقی باتیں پھر کرتے ہیں۔"

"اچھا جناب' بس آپ مجھے ایڈریس میسج کر دیں۔" جیسمین شوخی سے بولی تھی۔

"ہاں' ایک خاص بات' ریحان کو ساتھ مت لانا۔ دیکھو' سچی بات یہ ہے کہ ہر ڈائریکٹر کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بولڈ لڑکی کے ساتھ کام کرے' یہ دوستوں اور گھر والوں کے ساتھ آنے والی لڑکیاں ہمیں اپیل نہیں کرتیں۔" راجہ مغل نے انتہائی صفائی سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

جیسمین اتنی بے وقوف نہیں تھی' وہ معاملہ فہم تھی' سو فوراً ہی بات کی تہہ میں پہنچ گئی تھی۔ "sure' کیوں نہیں' ایسا ہی ہوگا۔" وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

"ٹھیک ہے' میں کل تین بجے سہ پہر میں تمہارا انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر راجہ مغل نے لائن کاٹ دی تھی مگر جیسمین کا دل بلیوں اچھل رہا تھا' وہ خود کو تصور میں بڑے بڑے پینا فلیکس پر مسکراتی دیکھ رہی تھی' یہ سب ہی تو اس کا خواب تھا اور اب وہ اپنے خواب و خیال کی منزل کی پہلی سیڑھی چڑھنے جارہی تھی۔ اس موقع پر نہ ہی اس کے دل میں کوئی خوف تھا اور نہ قدموں میں لرزش۔

'کیا میں ریحان سے اس بات کا ذکر کروں؟' اس نے اپنے دل اور ذہن سے یہ سوال ضرور کیا تھا لیکن نفی میں جواب آنے پر مطمئن ہوکر بیٹھ گئی تھی۔

٭......٭......٭

"ریحان' آج میں اپنے ایک ماڈلنگ اسائنمنٹ کے سلسلے میں بہت مصروف ہوں' تم اپنے کام جاری رکھو آج ہماری ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔" جیسمین نے ریحان کو یہ میسج کرتے ہوئے کال بیل پر انگلی رکھی تھی۔

قدرے توقف کے بعد دروازہ خود راجہ مغل نے کھولا تھا۔ "اوہ زہے نصیب...... آپ نے تو بالکل بھی انتظار نہیں کروایا۔" راجہ مغل ہاتھ کے اشارے سے اندر بلاتے ہوئے بولا تھا۔

"مجھے تو اس ملاقات کا بہت انتظار تھا' بے صبری تو خیر' میں سدا کی ہوں' یہ بتایئے' فہیم صاحب کہاں ہیں' وہ نہیں پہنچے؟" جیسمین خالی فلیٹ میں مختلف کمروں میں جھانکتی ہوئی صوفے پر نیم دراز ہوگئی تھی۔

"ارے سوری یار' بالکل عین ٹائم پر اس نے آنے سے انکار کردیا' کوئی ضروری کام اسے یاد آگیا' کہہ رہا تھا' کل کا ٹائم رکھ لو' میں تمہیں بتانے ہی والا تھا۔ مجھے لگا' تم مطلوبہ وقت سے ایک آدھ گھنٹے لیٹ ہی آؤ گی۔" راجہ مغل ٹھنڈے پانی کی بوتل جیسمین کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا تھا جسے وہ منہ سے لگا کر غٹاغٹ پینے لگی تھی۔

"چلیں' کوئی بات نہیں' آج پہلا موقع ہے کہ ہم فرصت سے ایک دوسرے سے بات کررہے ہیں

ورنہ ہماری ملاقات جلد بازی میں ہی ہوتی ہے۔" جیسمین پانی کی بوتل دوبارہ راجہ مغل کی جانب بڑھاتی ہوئی بولی تھی۔

"جیسمین' کیا واقعی ریحان تمہارا منگیتر ہے؟" راجہ مغل نے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ارے نہیں' وہ میرا بوائے فرینڈ ہے' بس یونہی ہر کسی سے کہتا پھرتا ہے' بے چارہ میری خوبصورتی پر مرتا ہے' ڈرتا ہے مجھے کھونے سے......" وہ استہزائیہ سی ہنسی کے ساتھ بولی تھی۔

"اچھا' یہ بات ہے۔" راجہ مغل نے بے ساختہ انداز میں جیسمین کے کاندھے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا تھا۔

"اچھا' ذرا یہ اسکرپٹ پڑھو اور اس پر ایکٹ کر کے دکھاؤ۔" راجہ مغل نے ذرا دیر بعد ایک اسکرپٹ جیسمین کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیوں نہیں' ضرور۔" راجہ مغل کے ہاتھ سے اسکرپٹ لے کر جیسمین بلند آواز میں پڑھنے لگی تھی۔

"اس میں ایک گانے پر ڈانس بھی کرنا ہے' تمہیں ڈانس کرنا آتا ہے؟" راجہ مغل نے بہت گہری نظروں سے اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"کیوں نہیں' یہ بھی کوئی مشکل کام ہے' پلیز' میوزک پلے کریں۔" وہ ایک ادا سے صوفے سے اٹھی تھی۔

"واہ بھئی واہ' خوب' بہت خوب۔" راجہ مغل نے ان تعریفی الفاظ کے ساتھ میوزک پلے کیا تھا۔ ایک بے ہودہ گانے کے بول اس کمرے میں گونجنے لگے تھے۔

"ارے...... آپ تو میرے ساتھ آیئے......" جیسمین نے راجہ مغل کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا تھا اور پھر اس بے ہودہ گانے پر تھرکتی جیسمین اور راجہ مغل کب جسمانی تسکین کا ڈرامہ پیش کرنے لگے تھے' یہ خود انہیں بھی پتا نہیں چلا تھا۔ جیسمین نے راجہ مغل کو خوب آئینے میں اتارا تھا' وہ جان گئی تھی' اگلے ڈرامے کی ہیروئن وہی ہوگی جبکہ راجہ بھی ذہنی طور پر یہی منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ وہ جیسمین کو ہیروئن کی حیثیت سے کاسٹ کر ہی لے گا' اس کی توقع کے برعکس آج کی اس چھوٹی ملاقات کا رزلٹ اسے بہت بڑا ملا تھا۔

•......•......•......•

"ارے یار' کمال ہوگیا' وہ راجہ مغل' سنگل پلے تو دور کی بات' تمہیں ایک ٹیلی فلم میں کاسٹ کرنے کا سوچ رہا ہے۔" ریحان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اچھا......" جیسمین کچھ گڑبڑاتی سی سر اٹھائے ریحان کو تکنے لگی تھی۔

"خیریت' تم کچھ ڈسٹرب سی کیوں ہو؟" ریحان اس کے قریب آتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں...... بس...... یونہی کچھ سر میں درد ہے' تم بتاؤ' کب بات ہوئی تمہاری؟ راجہ...... مغل...... سے......؟" وہ آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

"کل رات ہی یار' میں تو حیران ہوں اب تک لیکن تم خوش کیوں نظر نہیں آ رہیں؟" ریحان نے اسے ٹوکا تو وہ پل بھر میں جیسے چونک سی گئی تھی۔

"نہیں' کچھ خاص نہیں۔"

"اچھا جلدی سے تیاری پکڑو' ہمیں ابھی چلنا ہے پروڈکشن ہاؤس' وہ کیا ہے ناں کہ پوری رات میں تمہیں یہ خبر سنانے کے لیے بے تاب تھا مگر تمہارا نمبر بدستور بند مل رہا تھا اس لیے یہ خوشخبری سنانے میں گھر چلا آیا۔ ابھی تیاری پکڑو۔" وہ بے تابی سے بتا رہا تھا۔

"اتنی جلدی؟" وہ کچھ کنفیوز سی کھڑی ہوگئی تھی۔

"چلو یار' ٹائم نہیں ہے' کوئی فہیم صاحب ہیں' وہ بھی پہنچ رہے ہیں۔ یہ نا ہو کہ اتنا اچھا چانس ہم مس کر دیں۔" ریحان اسے سمجھا رہا تھا اور پھر وہ ریحان کے سامنے تو منہ بناتی ہوئی کھڑی ہوگئی تھی مگر دل خوشی سے بے حال تھا' شدید خواہش حقیقت کا روپ دھارنے جا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے' میں ڈریس اپ ہو کر آتی ہوں۔" وہ تیزی سے کہتی واش روم میں گھس گئی تھی جبکہ ریحان وہاں رکھے ایک میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا تھا۔

•......•......•......•

"تم سمجھ نہیں رہے' مل کر تو دیکھو لو' لڑکی واقعی بہت اچھی ہے' سچ کہہ رہا ہوں' خوبصورت ہے۔" راجہ مغل بھاری بھرکم صوفے پر بیٹھے فہیم سے مخاطب تھا۔

"میں نے تمہاری کبھی کوئی بات ٹالی ہے جو یہ بات ٹالوں گا؟ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس ٹیلی فلم کے لیے جو مجھے بڑی بڑی کمپنیوں کے اسپانسرز ملے ہیں' ان کی یہی خواہش ہے کہ اس ٹیلی فلم کی ہیروئن کوئی مشہور لڑکی ہو۔ یار' ہم ایک نئی لڑکی کو لے کر رسک نہیں لے سکتے' سارا پیسہ ڈوب جائے گا۔" فہیم اپنے دلائل پیش کر رہا تھا۔

"ارے' اچھا کام لینا میرے دائیں ہاتھ کا کام ہے۔ تم ان سے ایک بار رابطہ تو کرو' ان سے پوچھو نہیں بلکہ ان کو بتاؤ کہ ہم ایک نئی ماڈل کے ساتھ ٹیلی فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم جیسمین کا پورٹ فولیو انہیں بھیج دیتے ہیں' یقیناً وہ دیکھ کر مطمئن ہو جائیں گے۔" راجہ مغل اپنی دانست میں فہیم کو بہت سمجھا رہا تھا مگر وہ سمجھنے کے لیے راضی ہی نہیں تھا۔

گلاس ڈور کے پاس سانس روکے کھڑی جیسمین نے ان کی یہ گفتگو خاصی حد تک سن لی تھی' تب ہی ریحان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا تھا اور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"سر' ہاؤ آر یو؟ ہم آ گئے ہیں۔" اور پھر وہ دونوں بھی صوفوں پر براجمان ہو گئے تھے۔

"یہی جیسمین ہے جس کے بارے میں' میں آپ کو بتا رہا تھا۔" راجہ مغل نے قدرے برہم سے لہجے میں جیسمین کا فہیم سے تعارف کرایا تھا۔

"جی' ماشاءاللہ......!" فہیم' جیسمین پر ایک نظر ڈالتا پھر راجہ مغل کی طرف مڑ گیا تھا۔

"ارے بھئی' انہیں ہم اگلی بار موقع دے دیں گے' تم سمجھ کیوں نہیں رہے؟"

"ہاں' ہاں' خوب سمجھ رہا ہوں۔" راجہ مغل نے ترش لہجے میں کہا تھا۔

"ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی' اگر جیسمین کو ہی لینا ہے تو میری طرف سے یہ ڈیل ختم سمجھو۔" فہیم برہم سے لہجے میں یہ کہتا کھڑا ہو گیا تھا۔

"عینی......" فہیم میک اپ آرٹسٹ کو آوازیں دیتا ہوا میک اپ روم میں چلا گیا جبکہ راجہ مغل افسردہ سا' تاسف کے انداز میں جیسمین اور ریحان سے معذرت کر رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں سر' اس بار نہیں تو اگلی بار سہی۔" ریحان نے جیسمین کو زبردستی اٹھاتے ہوئے کہا تھا مگر جیسمین کی آنکھوں میں جو آنسو تھے' وہ اسے تڑپا گئے تھے۔

"کم آن یار' بزدل تو نا بنو' یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے پھر موقع مل جائے گا۔" وہ جیسمین کو گھسیٹتا ہوا سمجھا رہا تھا مگر جیسمین کے دل و دماغ میں اس وقت راجہ مغل اور فہیم کے لیے صرف اور صرف نفرت تھی۔

•......•......•......•

"اچھی بے عزتی کی ہے آپ نے میری۔" جیسمین موبائل پر ہونے والی گفتگو کے دوران میں تلخی سے بولی تھی۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"ارے یار' یہ فہیم کچھ سمجھ ہی نہیں رہا' تم ہی

بتاؤ' میں کیا کروں؟ کیسے اسے راضی کروں؟'' راجہ مغل نے موبائل دوسرے کان سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

'جب دم خم نہیں ہے تو پھر...... بے غیرت......' دل ہی دل میں راجہ مغل کو برا بھلا کہتی وہ خود کو بھی کوس رہی تھی۔

''ارے، خاموش کیوں ہو؟ کچھ تو بولو؟'' راجہ مغل نے جذباتی سے لہجے میں کہا تھا۔

''ہوں...... کچھ سوچ رہی ہوں......'' وہ آہستگی سے بولی تھی۔

''چھوڑو غصے کو، اگلی سیریل میں صرف تم ہی تم ہوگی، یقین کرو مجھ پر۔''

''یقین؟'' جیسمین بے ساختہ ہنسی تھی۔

''اچھا، ایک کام کریں، آپ اس فہیم کو اسی فلیٹ میں بلائیں، میں اور ریحان بھی پہنچتے ہیں۔ ایک آخری بار ٹرائی کرتے ہیں۔ اگر مان جائے تو زبردست ورنہ اپنی قسمت......'' جیسمین نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ چلو، یوں کرتا ہوں، فہیم کے ساتھ میں عینی کو بھی بلا لیتا ہوں بلکہ عینی بھی اسے راضی کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔'' راجہ مغل چہکتے ہوئے بولا تھا۔

''اب یہ عینی کون ہے؟'' جیسمین کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''ارے، میری میک اپ آرٹسٹ اور فہیم کی منگیتر۔''

''اوہ......'' جیسمین زیرلب بڑبڑائی تھی۔

''چلیں، ٹھیک ہے پھر آج ہی رات کا پروگرام رکھتے ہیں۔ اب مجھے فون کر کے کنفرم کریں، جب تک میں ریحان سے بھی بات کر لیتی ہوں۔'' جیسمین کی آواز اب قدرے نارمل تھی۔

''ٹھیک ہے ڈارلنگ، میں تمہیں بتا رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہی لائن ڈراپ ہوگئی تھی اور پھر اگلے آدھے گھنٹے میں آناً فاناً یہ پروگرام طے ہوگیا تھا کہ سارے کاموں سے فراغت پا کر یہ سارے ہی لوگ ڈیفنس والے فلیٹ میں جمع ہو جائیں گے اور اکٹھے ڈنر کریں گے۔

......•......•......•

''راجہ مغل...... تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا، اگر آج وہ فہیم راضی نہیں ہوا یا تم نے اسے منایا نہیں تو پھر تم میری نفرت کی آگ میں جھلس جاؤ گے، میں تمہیں ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ تم اٹھتے بیٹھتے خود کو گالیاں دو گے اور دیکھتی ہوں فہیم، تم یہ ٹیلی فلم کیسے بناتے ہو؟ جب میں نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں......'' جیسمین کے دل و دماغ میں انتقامی آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے جو ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھے۔

......•......•......•

7 ستمبر 2011ء کی شام ڈیفنس فیز ٹو کے رہائشیوں کی نشاندہی پر پولیس دوسری منزل پر قائم فلیٹ پر پہنچ گئی جہاں ٹی وی لاؤنج میں ایک نوجوان کی نعش پڑی تھی جبکہ دو نامعلوم افراد جن میں ایک لڑکی اور دوسرا نوجوان تھا، ان کی نعش بستر پر پڑی تھیں۔

پولیس نے قانونی کارروائی کے بعد تینوں مقتولین کی نعشیں ان کے لواحقین کے حوالے کر دیں، پولیس کا کہنا تھا کہ تینوں ملزمان کو شراب کے نشے میں دھت کر کے سفاک ملزمان نے باری باری گلا گھونٹ کر قتل کیا ہے۔ مقتول راجہ مغل کی نعش ٹی وی لاؤنج سے جبکہ فہیم الکریم ایڈووکیٹ اور عینی کی نعشیں بیڈروم سے ملی تھیں۔

قتل کی واردات کی تفتیش کے لیے مقتولین کے تعلق رکھنے والوں کے بیانات ریکارڈ کرنا شروع

ہوئے جس میں پولیس کو جیسمین اور ریحان نیازی پر شک ہوا اور اس شک کی بنا پر پولیس نے دونوں کو حراست میں لے لیا۔ جیسمین اور ریحان نیازی کو اگلے روز کراچی سٹی کورٹ کی ایک ماتحت عدالت میں پیش کیا گیا۔ پولیس نے عدالت سے درخواست کی کہ ملزمان سے مزید تفتیش اور آلہ قتل کی برآمدگی کے لیے دس روزہ جسمانی ریمانڈ دیا جائے مگر عدالت نے ملزمان کو تفتیش کی خاطر چار روز کے لیے پولیس کی تحویل میں دے دیا۔ چار روز کے بعد جب ایک بار پھر جیسمین اور ریحان نیازی کو کمرۂ عدالت میں پیش کیا گیا تو یہاں ایک عجیب ہی منظر تھا، جیسمین کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، وہ آپے سے باہر تھی اور اس نے ایک وکیل کے گریبان کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور اس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ تھے۔

''ہاں...... میں قاتل ہوں...... میں نے قتل کیا ہے...... ایک نہیں، تین افراد کی جان لی ہے...... میں کب تک ہوس کی بھینٹ چڑھتی؟ شوبز کے لٹیرے اور ان کی ہوس بھری نظریں مجھے اپنے جسم کے آر پار محسوس ہو رہی تھیں، لاکھ جتن کے باوجود میں پھر سے بھیڑیوں کی خواہشات کا شکار ہوگئی...... اور میں نے ...... انہیں مار دیا...... میں نے سب کا گلا گھونٹ دیا...... میرا بس چلے تو معصوم لڑکیوں سے زیادتی کرنے والے تمام افراد کو قتل کر دوں...... اپنی زندگی بنانے کے لیے گھر سے قدم نکالنے والی لڑکیوں کو میں یہ نصیحت کروں گی کہ وہ اگر کچھ کرنا چاہتی ہیں تو سب سے پہلے اپنے اندر مجھ جیسا حوصلہ پیدا کریں اور کسی لڑکی کی زندگی برباد کرنے والوں کو نشانِ عبرت بنا دیں......''

اس وقت جیسمین اور ریحان نیازی جیل میں ہیں اور اپنی قسمت کے فیصلے کے منتظر ہیں۔



غزل

میرا دل چاہتا ہے رونے کو
اور کاندھا تیرا بھگونے کو
تیرے آنے کا آج وعدہ ہے
میں سجاؤں گی کونے کونے کو
اس کا لہجہ بتا رہا ہے مجھے
کب ہے راضی وہ مجھ کو کھونے کو
دل سے کھیلو تو احتیاط رہے
ٹھیس لگ جائے نہ کھلونے کو
اک مرا خواب ہی ادھورا رہا
کیا نہیں ہوتا یوں تو ہونے کو
تیری یادوں کا ابر آتا ہے
روز تکیہ میرا بھگونے کو
جن کی الفت پہ ناز دل کو رہا
ساتھ آئے ہیں وہ ڈبونے کو
میرے اپنے تو ملنے آتے ہیں
لے کے نشتر مجھے چبھونے کو
اشک ہی رہ گئے ہیں آنکھوں میں
داغ محرومیوں کے دھونے کو
دے مجھے زندگی ذرا فرصت
یاد زنجیر میں پرونے کو
زندگی، تجھ سے تھک گئی ہوں بہت
اب تو جی چاہتا ہے سونے کو

شگفتہ شفیق

شگفتہ شفیق

کراچی سے کینیڈا تک

شاعر کا خیال

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

ہماری اپنی شاعرہ اور کہانی کار کا سفرِ کینیڈا لفظوں کی صورت نذرِ قارئین

میری کتاب ”میرا دل کہتا ہے“ کی اشاعت کے بعد پبلشر نے کتاب کئی جگہ تبصرے کے لیے بھیجی تھی، تقریباً ہر ایک جگہ سے خوبصورت تبصرے موصول ہوئے۔ کینیڈا سے تبصرے کے ساتھ "Urdu Society of Canada" کی طرف سے انٹرنیشنل مشاعرے میں شرکت کی دعوت بھی ملی۔ کچھ دنوں کے بعد جناب معراج جامی صاحب نے ہمیں ایک انتہائی دیدہ زیب اور بہترین کتاب ”مغربی دنیا کے اُردو اہلِ قلم“ (جو کہ محترم تسلیم الٰہی زلفی صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور کینیڈا میں ہی شائع ہوئی ہے۔) لا کے دی جس میں ہماری کتاب پر بھی 4 صفحات پر مشتمل تبصرہ



ی ساکائیں Ambition کی مدیرہ اسماء وارثی صاحبہ، شگفتہ شفیق کو Award of appriciation دیتے ہوئے

شامل تھا، تب ہم نے کینیڈا کے ویزے کے لیے اپلائی کیا۔

تقریباً ڈھائی مہینے کے بعد ۱۵ رمضان المبارک کو ہمیں TCS سے فون آیا کہ آپ کا پاسپورٹ واپس آ چکا ہے آپ آ کے وصول کر لیں، سو دھڑکتے دل کے ساتھ نرسری TCS کے ویزہ ٹرونکس آفس پہنچے اور جب لفافے کو چاک کیا تو دیکھا کینیڈا کا ویزہ لگا ہوا تھا۔ ہمارے تمام کاغذات انہوں نے واپس کر دیئے تھے ہاں البتہ ہماری کتاب ”میرا دل کہتا ہے“ انہوں نے Embassy میں اپنے پاس رکھ لی تھی۔ ویزے کی مدت چھ ماہ تھی یعنی ہم فروری 2012ء تک سفر کر سکتے تھے لیکن سنا تو یہی تھا کہ اکتوبر کے آخر سے موسم بہت سخت ہو جاتا ہے اور ہم کراچی والے بہت زیادہ سردیوں کے تو عادی ہی نہیں ہیں، سو فیصلہ ہوا کہ فٹافٹ عازمِ سفر ہوا جائے کیونکہ کہتے ہیں کہ سفر وسیلہ ظفر ہے۔

کراچی میں اس رمضان شریف میں حالات بہت ہی خراب رہے۔ بازار اکثر بند رہے اور جو کھلے تو سب کو یہ ہی ڈر رہا کہ نہ جانے کہاں اور کب ہنگامے ہو جائیں لیکن بہرحال بازار تو جانا ہی تھا کہ ٹورنٹو، کینیڈا میں میرے بھائی پہنچے ہوئے ہیں۔ آپا (بہن) کی فیملی اور کئی ایک سسرالی رشتے دار بھی مقیم ہیں تو سب عزیز رشتے داروں کے لیے کچھ نہ کچھ تو لینا ہی تھا۔

02 ستمبر 2011ء ہے عید کا دوسرا دن۔ سارا دن بچے اور شفیق مجھ سے یہ ہی کہتے رہے۔ ”ارے بھئی یہ رکھ لیا؟ وہ رکھ لیا؟ دیکھو کوئی ضروری شے رہ نہ جائے، کوئی مشکل در پیش نہ آئے۔“ سوا ایک بجے رات کو ہم کراچی ایئرپورٹ روانہ ہوئے۔ ہماری فلائٹ PK-78 بذریعہ اسلام آباد Toronto جانی تھی۔ کنزل اور فرخ کی نم آنکھیں ہمارا راستہ روکنے لگیں لیکن چھوٹے شہریار نے مسکرا کر حوصلہ دیا۔ شفیق نے اپنا بہت خیال رکھنے کی ہدایت کی، ساتھ ہی PIA کے بزنس پلس کا پورٹر سامان لے کر تیزی سے اندر کی جانب چل دیا اور ہم نے الوداعی نظروں سے اپنے پیاروں کو دیکھا، ہاتھ ہلایا اور پورٹر کے پیچھے چل دیئے۔

کراچی ایئرپورٹ پر اسکیننگ کے دوران ایک صاحب نے کہا۔ ”یہ آپ کے سوٹ کیس میں پیکٹ میں کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”جناب، یہ میری کتاب کے پیکٹس ہیں۔ اس کی وجہ سے ہی میں کینیڈا انوائیٹ کی گئی ہوں اور اپنے ہینڈ بیگ سے ایک کتاب انہیں نکال کے دکھائی تو انہوں نے فرمائش کی کہ یہ آپ مجھے دے سکتی ہیں؟

میں نے کہا۔ ”شیور۔“

سو ایک کتاب کراچی ایئرپورٹ پر اپنے کسٹم والے بھائی کو پیش کرنی پڑی جس کو انہوں نے بہت خوش ہو کے لیا اور سرورق کی بے حد تعریف کی۔

سامان کی بکنگ سے فراغت حاصل کر کے ہم لاؤنج میں جا کے بیٹھ گئے۔ وہاں ہمارے برابر ہی شاہین معراج صاحبہ بیٹھی تھیں جو کہ اپنے بھائی کی ڈیتھ پر ٹورنٹو سے کراچی آئی ہوئی تھیں۔ اب واپس جا رہی تھیں۔ وہ خاتون بے حد چپ چاپ اور ملول تھیں لیکن ہم سے تو چپ رہا ہی نہیں جا سکتا ہے پھر جو وہ بولیں تو نا صرف انہوں نے ہماری شاعری سنی بلکہ اپنی بھی سنا ڈالی۔ وہ کینیڈا میں کسی یونیورسٹی کی پروفیسر تھیں۔ جہاز میں میری ہم سفر زہرا علی تھیں، بے حد اچھی لڑکی لیکن اسلام آباد تک اُس کی طبیعت سخت خراب رہی، تب اسلام آباد ایئرپورٹ پر ڈاکٹر نے اُسے میڈیسن دی اور باقی کا سفر اچھا گزرا۔ زہرا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ٹورنٹو جا رہی تھیں، یوں ہمارا سفر سوتے جاگتے لیکن خوشگوار گزرا۔ فضائی میزبان بے حد مہربان تھے۔ اسلام آباد ایئرپورٹ پر جہاز

کے لینڈ کرتے ہی ہمیں بے اختیار فرزانہ آغا اور فراز یاد آئے۔ دل میں اُن کی سلامتی کی دُعا کرتے ہوئے آمین کہا اور کچھ اپنے دوسرے احباب کو میسج کیے کہ عید کی مبارک باد بھی دینی تھی۔

جہاز کے پائلٹ صاحب بے حد منجھے ہوئے تھے جنہوں نے ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ پہلے ہی ٹورنٹو ایئرپورٹ پر بخیریت اتار دیا۔ اب سامان وصولنے کا مرحلہ اور امیگریشن کا سلسلہ تھا۔ Toronto کا ایئرپورٹ بے حد وسیع اور خوبصورت ہے۔ صفائی

لیکن وہ نکل کے نہیں دی۔ آخر کار ایک بچے سے کہا کہ ایک ٹرالی کھینچ کے دو۔ اُس نے کہا کہ اِس ہول میں آپ 2 ڈالرز ڈالیں' تب ٹرالی نکلے گی۔ سامنے ایک اور جگہ خاتون لوگوں کو ٹرالی دے رہی تھیں۔ اُن کے پاس جا کے اُن سے درخواست کی' تب انہوں نے دو ڈالرز مانگے۔ میں نے کہا کہ change نہیں ہے' 100 ڈالرز کا نوٹ ہے۔ انہوں نے کمال بے نیازی سے فرمایا کہ وہ سامنے منی ایکسچینج ہے' اس سے چینج کرالو' سو جا کے قطار میں کھڑے ہوئے'



Urdu TV Canada کے پروگرام ''مہمان'' میں تسلیم الٰہی زلفی صاحب، شگفتہ شفیق کا انٹرویو لیتے ہوئے

کا نہایت اعلیٰ انتظام دیکھ کر ہمیں اپنا اسلام آباد کا ایئرپورٹ یاد آیا کہ وہاں جابجا کاغذ پڑے تھے۔ اس فلائٹ میں زیادہ تر پاکستانی تھے لیکن ٹورنٹو ایئرپورٹ پر اترتے ہی سارے کے سارے organized ہوچکے تھے اور تمام rules کو فالو کرتے ہوئے قطار بنا کے چل رہے تھے۔ ہم نے سب سے پہلے ٹرالی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں' ایک لمبی قطار میں بے شمار ٹرالیز (Trolleys) لگی ہوئی تھیں۔ میں نے لاکھ چاہا کہ ایک ٹرالی کھینچ لوں

change حاصل کی' تب جا کے ٹرالی ملی۔ (عموماً جتنے بھی سفر میں نے کیے ہیں' شفیق کے ساتھ کیے ہیں یا پھر کوئی بچہ یعنی فرخ' کنزل یا شہریار ہوتے ہیں تو ٹرالی لینے دینے کی جھنجھٹ سے ہم آزاد ہوتے ہیں۔) اس ہی لیے یہ لاعلمی رہی۔ سفر میں یہ پہلا سبق ملا کہ چینج (change) یعنی سکے (Coins) ضرور ساتھ رکھنے چاہئیں۔

اسلام آباد ایئرپورٹ سے ہم نے محترم تسلیم الٰہی زلفی صاحب اور اپنے بھائی محمد علی صدیقی کو فون

کر کے بتا دیا تھا کہ ہم انشاء اللہ' 2 ستمبر کو پہنچ رہے ہیں۔ زلفی صاحب نے کہا تھا کہ کوئی بھی پرابلم ہو تو ہمیں call کر لیجیے گا لیکن کوئی مشکل درپیش نہ آئی۔ کراچی سے جب فلائٹ چلی تھی' تب میں پہلی مسافر تھی جس کا سامان بک ہوا تھا تو سامان ٹورنٹو میں بہت ہی دیر سے آیا اور بھائی بھابی بچوں کو میرا خوب انتظار کرنا پڑا۔ اپنا سامان ٹرالی پر رکھ کے ہم دھڑکتے دل کے ساتھ باہر چلے۔ وہاں ٹیبل پر ایک عدد ٹیلی فون رکھے ایک صاحب فائنل گیٹ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ بھائی کو ایک فون کرلوں پھر ارادہ ملتوی کردیا کہ پہلے دروازے کے باہر جا کے دیکھنا چاہیے۔ جھانکا تو میری پیاری بھتیجی بھتیجا' بھائی اور بھابی کھڑے تھے۔ اُن کے گلے لگ کر میری راستے کی تمام تھکان دور ہوگئی۔

بھائی نے کہا۔ ''آپا......! یہاں نہیں آئی ہیں؟ چلو' پہلے اُن کے گھر سے ہوتے ہوئے چلتے ہیں۔''

آپا کے گھر پہنچے تو عید کا دوسرا دن تھا' سو بے حد لوازمات کے ساتھ ہم سب نے وہاں لنچ کیا پھر چائے پی۔ آپا کا رچمنڈ ہل میں بے حد آراستہ و پیراستہ گھر ہے لیکن مجھے اُس گھر میں سب سے زیادہ اپنے بھانجے نوید کا پرشین بلا پسند آیا' اس قدر پیارا کہ جیسے روئی کا گالا......اس کے جھولے' کھلونے اور واش روم دیکھ کے مجھے اپنے ملک کے غریب عوام بے حد یاد آئے جنہیں زندگی جینے کے لیے کس کس طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ دل نے میرے بے اختیار دُعا کی کہ اللہ پاک میرے تمام پاکستانیوں کو سہولیات اور آسانیاں عطا فرما۔ (آمین!)

پھر ہم سب لوگ وہاں سے مارکھم میں واقع بھائی کے گھر آگئے جو کہ وہاں سے دس منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ ماشاء اللہ' اُن کا گھر بہت ہی خوبصورت ہے اور بھابی نے گھر بہت نیٹ و کلین (neat and clean) رکھا ہوا ہے۔ کچھ دیر آرام کے بعد ہم لوگ باہر نکلے اور میں نے بھائی سے کہا کہ مجھے تو پہلے ایک cell phone کی sim دلائیں تاکہ میں آرام سے سب کے ساتھ رابطہ کرسکوں' سو پہلی شاپنگ sim کی ہوئی' یہ راجرز کی sim تھی لیکن اس میں غضب یہ تھا کہ میں کسی کو فون کروں تو ڈالر کٹتے تھے' کوئی اور مجھے فون کرے' تب بھی ڈالر کٹیں گے اور ایک اپنا پاکستان' یہاں موبائل کے حوالے سے کیسی کیسی سہولت اور پیکیج موجود ہیں' ایسا کیوں؟ یہ ایک سوال ہے۔

پھر بھابی نے کہا۔ ''یہاں ایک زبردست چائنیز ریسٹورنٹ ہے شگفتہ......! کیا خیال ہے؟''

تو شگفتہ نے تو یہ ہی کہنا تھا کہ

جو مزاج یار میں آئے

''فریڈرک'' ریسٹورنٹ میں زبردست ڈنر اڑایا گیا۔ واقعی ہر ڈش بہترین' ذائقے دار تھی۔ درمیان میں محترم تسلیم الٰہی زلفی صاحب سے بھی بات کی۔ (زلفی صاحب "Urdu Society of Canada" کے صدر ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم' کینیڈا کے سربراہ بھی ہیں اور Canada Urdu T.V. چینل کے بھی پریذیڈنٹ ہیں۔) زلفی صاحب نے کمال مہربانی سے بے حد ویلکم کیا اور کہا کہ آپ کے اعزاز میں اتوار 4 ستمبر 2011ء کو ہماری قیام گاہ واقع رچمنڈ ہلز میں استقبالیہ دیا جارہا ہے' ساتھ ہی انہوں نے میرے بھائی اور بھابی کو بھی انوائیٹ کیا۔

کینیڈا سب کا دل موہ لینے والا ملک ہے' ہریالی اور سبزے سے ڈھکا ہوا۔ کینیڈا کے گرتے آبشار' خوبصورت شفاف جھیلیں اور گھنے جنگل' پل پل بدلتے موسم' ٹھنڈی شامیں' روشن دن' رنگ برساتی بارشیں' اڑتے پرندے اور کھلکھلاتے شوخ پھول'

شاعروں، ادیبوں اور سیاحوں کے دل اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہاں سے واپس آنے کو دل ہی نہیں چاہتا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی حسین سینری میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں صفائی مثالی ہے، لوگ بے حد مخلص اور سادہ ہیں، اپنے کام سے کام رکھنے والے۔ کینیڈا کی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے، وہاں کی اچھی اچھی باتوں کو انجوائے کرتے ہوئے میرے دل نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ کاش، میرے پاکستان میں بھی ایسا ممکن ہو جائے۔ ہم بھی تمام قوانین کی پابندی کریں، انصاف سے جئیں اور ایک دوسرے کا حق نہ ماریں۔

3 ستمبر کو دن میں بھابھی نے کئی مالز (Malls) کی سیریں کرائیں اور شام کو کئی فیملی فرینڈز کو انوائیٹ کیا جن میں ناہید، اصفاء، ثوبیہ اور اُن کے اہلِ خانہ سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ بے حد شاندار دعوت رہی۔ میرے اور میری کتاب کے بارے میں اُن کے خوبصورت جملے میرا دل کِھلا گئے۔

4 ستمبر کو کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم، کینیڈا کی جانب سے جناب زلفی صاحب کی پرشکوہ قیام گاہ پر پروقار استقبالیہ ترتیب دیا گیا۔ اُن کا گھر چاروں جانب سے خوبصورت درختوں سے گِھرا ہوا ہے۔ وہاں پر ہماری ملاقات نزہت زلفی سے بھی ہوئی جو کہ بے حد مہمان نواز اور سلیقہ شعار خاتون ہیں، انہوں نے اپنے گھر کو بہت خوبصورتی سے سجایا ہوا ہے۔ میری زندگی میں وہ لمحات بڑے انمول ہیں جبکہ میں آسمانِ اُردو کے اُس روشن ستارے سے ملی جو کہ گزشتہ پانچ دہائیوں سے اُردو ادب کی آبیاری میں مصروف ہیں اور بے شمار اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ پہلے تو احباب سے دوستانہ ماحول میں بات چیت ہوئی پھر کھانے کا دور چلا۔ آخر میں جناب تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے کہا کہ ”شگفتہ...... ! آپ یہاں مسند پر تشریف لے آئیں، ہمارے احباب آپ کا کلام سننا چاہتے ہیں۔“

ہمارے ”مسند نشین“ ہونے کے بعد زلفی صاحب نے حاضرینِ محفل سے ہمارا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔

”فنِ شاعری نت نئے روپ دھار رہا ہے اور افقِ ادب پر نئے چاند طلوع ہو کر انسان کو نئے روشن زینے مہیا کر رہے ہیں۔ شگفتہ شفیق نے زندگی کے اسی روشن زینے پر اپنی دلنواز اور دلگداز جذبوں کی شاعری ”میرا دل کہتا ہے“ کے رنگ بکھیر دیئے ہیں۔ شگفتہ شفیق بھی اپنی شاعری کے چاند سے ایسی ہی ضیا پاشی کا اہتمام کر رہی ہیں۔ شگفتہ کی نظمیں چونکا دینے والی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بساط ہوائے دل پر کوئی نووارد اترا ہے جس کے شعروں کی تازگی رگ و پے میں محسوس ہوتی ہے، یوں لگتا ہے کہ شدید گھٹن کے درمیان ایک تازہ ہوا کا جھونکا آیا ہے۔ اسی طرح شگفتہ کی غزل کا بھی اپنا ذائقہ ہے اور یہ ہی ذائقہ اُن کا معیار بھی ہے۔ شگفتہ شفیق کی غزل فنی تخلیق سمجھنے کے لیے نہیں، محسوس کرنے کے لیے ہوتی ہے اور محسوسات کے راستے سے ہی اس کا شعور حاصل ہوتا ہے لہٰذا آیئے، آج شگفتہ سے اُن کی شاعری اپنے محسوساتی رابطے سے سنتے ہیں۔“

اِس طرح اُس دن ہمیں جی بھر کے سنا گیا اور ہم نے بے حد داد سمیٹی۔ زلفی صاحب نے اس قدر خوبصورتی سے تعارف کرایا کہ ہم تو بس اللہ کا شکر بجاتے رہ گئے کہ تسلیم الٰہی زلفی صاحب تو اُردو ادب کا وہ سورج ہیں جن کو اُن کے طویل ادبی سفر میں بے شمار اعزازات وایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ یہ میرے لیے ایک انتہائی اعزاز کی بات تھی کہ میں آج اُن کے ساتھ بیٹھی اپنا کلام سنا رہی تھی۔ ہم نے ساون سے متعلق کئی غزلیں، نظمیں سنائیں اور ٹورنٹو کے بادل جو تُلے بیٹھے تھے، خوب رج کے برسے جس نے اُس خوبصورت شام کو اور بھی حسین بنا دیا۔ یہ میری زندگی کی خوبصورت شاموں میں سے ایک شام ہے، جس کو میں کبھی بھی فراموش نہ کر سکوں گی لیکن مجھے اپنے گھر والوں کی بہت یاد ستا رہی تھی کہ کاش...... وہ بھی میرے ساتھ ہوتے۔

کراچی سے پروفیسر زیب النساء زیبی بھی تقریباً ایک ماہ پہلے کینیڈا تشریف لائی ہوئی تھیں۔ اپنی بیٹی داماد سے ملنے۔ انہوں نے اس تقریب میں شرکت فرمائی۔ اس کے علاوہ جمال انجم صاحب مبارکہ شکور، ثمینہ خان اور ڈھیروں دوسرے احباب جن کے نام میرے ذہن سے محو ہو چکے ہیں، نے شرکت فرما کے اس تقریب کو چار چاند لگا دیئے۔

اگلے دن "Urdu TV Canada" پر ہمارا انٹرویو تھا۔ پروگرام ”مہمان“ کے لیے میں اپنے بھائی کے ساتھ اسٹوڈیو پہنچی جہاں اس ٹی وی چینل کے سربراہ تسلیم الٰہی زلفی صاحب ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے میرا طویل دورانیے کا تفصیلی انٹرویو کیا جسے اگلے دن ہی ٹورنٹو کے ہزاروں ناظرین نے اپنے اپنے گھروں میں دیکھا اور مجھے فون کر کے خوش آمدید کہا اور مبارکباد دی۔ انٹرویو ہونے سے پہلے مجھے خاصی گھبراہٹ تھی لیکن زلفی صاحب بے حد دھیمے مزاج کے اینکر ہیں، انہوں نے اس قدر آرام سے یہ ون ٹو ون انٹرویو لیا کہ مجھے وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔

شام کو بھابھی کی فرینڈ ناہید نے عید ملن کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہاں پر بھی شاندار محفل جمی۔ ناہید نے سرسوں کا ساگ اور بھنڈی کی ترکاری بہت ہی عمدہ بنائی تھی، بے شمار لوازمات الگ تھے۔ اسی دوران میں میرے پیارے بچوں فرخ، کنزل، شہریار کے درمیان میں ڈھیروں فون آتے رہے کہ وہ وہاں کی ساری internet activities کو پر دیکھ رہے تھے۔ کنزل جس کو میں بے حد لاپرواہ سمجھتی تھی، اُس نے ماشاءاللہ، گھر بہت اچھی طرح سنبھالا حالانکہ میرے ہوتے ہوئے وہ عموماً گھریلو کاموں میں بہت کم حصہ لیتی ہے کہ اس کا ماشاءاللہ ایم بی بی ایس کا last year ہے اور رہے شفیق تو وہ اظہار کے معاملے میں انتہائی کنجوس ہیں پھر بھی بچے کہہ رہے تھے کہ ڈیڈی نے آپ کو سب سے زیادہ miss کیا۔ یہاں ہم نے پاکستانی اداکارہ نرگس کا پارلر بھی دیکھا، بڑا زبردست سیٹ اپ لگایا ہوا ہے انہوں نے۔ مین پاکستانی اسٹور بھی دیکھے جہاں ہر پاکستانی شے موجود تھی، چھالیہ سپاری سے لے کے ”شان“ کے مصالحوں تک۔ پاکستانی گروسری شاپ ”زمزمہ“ اور انڈین گروسری شاپ ”گولڈن گروسری“ کہلاتی ہے۔ Lauggoes اور Loblaws دونوں ہی بے حد مشہور اسٹورز ہیں۔ سب سے سستا اسٹور Nofril ہے جہاں cart بھی چونی میں ملتی ہے اور واپسی پر چونی بھی واپس ہو جاتی ہے۔ سب سے زیادہ خوبصورت اسٹور مجھے ”مائیکل اینجلو“ لگا جہاں ایک ایک شے چُنی ہوئی ہوتی ہے۔ بہترین اسٹور جہاں تازگی اور صفائی کا شاندار نظارہ ہے۔

شام کو جیراڈ اسٹریٹ جانے کا پروگرام بنا۔ زیادہ تر یہاں پاکستانی، ہندوستانی اور چائنیز لوگوں کی دکانیں اور ریسٹورنٹ ہیں۔ یہاں میٹھا پان تک فراوانی سے ملتا ہے۔ ”لاہوری تکہ ہاؤس“ پر بے شمار گوروں کا ہجوم تھا۔ انہوں نے اپنا سیٹ اپ بہت اچھا بنایا ہوا ہے۔ گیٹ کے باہر رکشا، بیل گاڑی وغیرہ بھی کھڑی کی ہوئی ہیں۔ انڈین ڈریسز اور ساڑھیوں کی بے حد دکانیں ہیں۔ مجھے اُن دکانوں کے ڈریسز زیادہ پسند نہیں آئے کیونکہ دیسی کپڑوں کی جو وسیع ورائٹی ہمیں پاکستان میں ملتی ہے، وہ بہت

اچھی ہے۔ کینیڈا ہنرمند لوگوں کے لیے جنت ہے۔ تمام دنیا سے باحیثیت اور باصلاحیت لوگ کینیڈا میں امیگریشن لیتے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم، کینیڈا نے جو ہمارے اعزاز میں استقبالیہ دیا تھا اتوار کو تو جمعرات کو اخبارات جیو پاکستان، (کینیڈا)، نوائے پاکستان، (کینیڈا)، پاکستان ٹائمز، (کینیڈا)، سن ڈے ٹائمز، (کینیڈا)، پاکیزہ (کینیڈا) اور اُردو ٹائمز (کینیڈا) میں اُس تقریب کی بھرپور کوریج آئی تھی۔

کینیڈا ہرے بھرے سبزہ زاروں کا ملک ہے۔ وہاں بے شمار خوبصورت پرندے آزاد اڑتے پھرتے ہیں اور کوئی انہیں مارنے، پکڑنے یا نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ قوانین سخت ہیں۔ اسی طرح Canadian Geese جب چلتی ہیں تو پوری سڑک پر ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ وہ اڑتی نہیں ہیں بلکہ آرام سے مٹک مٹک کر چلتی ہیں اور مجال ہے کہ کوئی اُن پر بُری نظر ڈالے۔

7 ستمبر کو میرے پیارے چھوٹے بھتیجے محسن کی سالگرہ تھی جو کہ Red Lobster, Sea Food restaurant پر بہترین dinner کے ساتھ منائی گئی۔ محسن نے اپنا پسندیدہ crab کھایا۔ میں نے Fish and chips لیا۔ یمنیٰ نے ضد کر کر کے اپنی پلیٹ میں سے ہر چیز چکھنے پر مجبور کیا۔ غرض کہ آج کا دن بھی خوب ہی گزرا۔

بھائی اور بھابھی نے پروگرام بنایا تھا کہ شگفتہ کو یہاں کا تھیٹر بھی دکھایا جائے، سورات کو ہم اگلے دن AMC گئے جہاں بیک وقت 20 فلمیں چلتی ہیں۔ ہم نے تو پاکستانی فلم "بول" دیکھی۔ فلم بہت شاندار ہے۔ شعیب منصور کی ایک اور بڑی کامیابی "بول" کی صورت میں ہم سب کے سامنے آئی ہے۔

10 ستمبر کی صبح بھائی نے کہا۔ "چلو بھئی، آج تمہاری تصاویر develop کرانے چلتے ہیں۔"

وہاں پر ہم نے بے حد مزے سے خود automatic pictures develop کرلیں اور صرف 1 گھنٹہ لگا اور ساری تصاویر بن گئیں۔ اسی روز رچمنڈ ہل میں میری کتاب "میرا دل کہتا ہے" کی رسمِ اجراء 'انجمنِ اُردو کینیڈا' کے زیرِ اہتمام تھی۔ اُس کے بعد مشاعرہ تھا۔ یہ ایک شاندار فنکشن تھا۔ پہلے انجمن اُردو کینیڈا کی جانب سے زلفی صاحب نے ہمیں خوبصورت پھول عنایت کیے، اُس کے بعد "Award of Excellence" سے بھی نوازا۔ تقریب کی صدارت جناب تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی تھی۔ اس موقع پر انجمن کے ڈائریکٹر معروف شاعر جناب جمال انجم صاحب نے میری کتاب کے حوالے سے سیر حاصل جائزہ لیا جبکہ اپنے صدارتی خطاب میں زلفی صاحب نے میرے فن اور تخلیقی ہنر کے حوالے سے جامع گفتگو فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے کینیڈا جیسے خوبصورت ملک میں مجھے خوبصورت دن عطا کیے۔ آج کے دن میری صلاحیتوں کا دل کھول کر اعتراف کیا گیا جس کے اختتام پر لذت کام و دہن کا انتظام تھا۔ لاجواب ڈنر اور چائے کے بعد محفلِ مشاعرہ کا آغاز ہوا جس میں بے شمار معروف مقامی شعراء نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ تمام شعراء اور باذوق سامعین نے میرا کلام نہایت توجہ، شوق و ذوق سے سنا اور دل کھول کر داد سے بھی نوازا۔ اس قدردانی کے لیے میں اُن سب کی ممنون ہوں۔ تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے مشاعرہ کی صدارت فرمائی اور اپنا کلام سنایا۔ شام 7 بجے ہونے والی یہ تقریب رات 12 تک پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری رہی۔ اُس دن تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے کمال مہربانی سے مجھے میرے T.V. انٹرویو کی DVD عنایت کی۔

میں ٹورنٹو میں خوبصورت ترین علاقے مارکھم میں بھائی کے گھر ٹھہری ہوئی ہوں۔ وہاں سے نیاگرا

فال کم از کم 200 کلومیٹر دور ہے۔ 12 ستمبر 2011ء کو وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ بے حد انتظامات یعنی کھانے پینے کے لوازمات کے ساتھ روانہ ہوئے۔ پہلے گیس فل کرائی۔ میں احسن بھتیجے کے ساتھ آگے کی سیٹ پر براجمان تھی۔ بھائی اور بھابھی پیچھے کی سیٹ پر تھے۔ تقریباً پونے دو گھنٹے کا یہ سفر انتہائی خوشگوار گزرا۔ راستے میں اتنے خوبصورت مناظر تھے کہ بے شمار تصاویر بنائیں۔ انگوروں کی بیلوں سے ڈھکا دورویہ راستہ عجب بہار دکھا رہا تھا۔ احسن نے جی پی ایس (GPS) سیٹ کر دیا تھا۔ یہ ایک زبردست چیز ہے کہ اس آلے میں آپ اپنی منزل کا پتا ٹائپ کر دیں تو وہ آپ کی رہنمائی کر کے آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد آواز سنائی دیتی ہے کہ گاڑی Right hand پر موڑیں اور پھر اُدھر ٹرن کریں۔ میرے بھائی اکثر GPS کی ہدایات پر عمل نہیں کرتے تھے اور پھر بھی بار بار یہ ہی کہتے تھے کہ او کے۔ میں دوبارہ calculate کر کے آپ کو راستہ بتاتا ہوں۔

احسن نے نیاگرا فال کے نزدیک پہنچ کر Hilton ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کردی۔ یہاں اور بھی بے شمار ہوٹل ہیں۔ اس قدر پھول اور سبزہ ہے کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ خوبصورتی دل میں بس جاتی ہے۔ یہاں کیسینو (Casino) بھی ہیں، کیسینو ہال میں ایک نئی دنیا آباد تھی۔ ہم نے اس سے پہلے کبھی کیسینو نہیں دیکھا تھا۔ ہر طرف مشینوں کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ بے شمار خواتین و حضرات مختلف کھیلوں پر رقم لگا رہے تھے۔ اگر مشین کا لیور دبانے کے بعد تین تصویریں یا ہندسے ایک لائن میں آ جائیں تو آپ گویا جیت جائیں گے۔ ہم بھی ایک مشین پر بیٹھ گئے۔ ایک پر میری بھابھی ہُما بیٹھ گئیں۔ ہم دونوں نے fun کے لیے 5-5 ڈالر کا نوٹ ڈالا۔ کچھ دیر تک الل ٹپ بٹن دبائے۔ ہُما کے 5 ڈالر صفر میں تبدیل ہو گئے۔ ہمارے 5 ڈالر 23 میں تبدیل ہو گئے۔ ہم نے مزید ایک بار لیور دبایا تو وہ 17 رہ گئے۔ ہم نے اس پر گیم روک دیا اور سلپ لے کر



شگفتہ شفیق اپنے بھانجے نوید کے پرشین بلے کے ساتھ

اپنے پاس سوونیئر کے طور پر رکھ لی اور پھر بھائی واش روم گئے تو میں نے اور بھابھی نے 10-10 ڈالرز دوبارہ ڈالے اور دو منٹ میں ہی مشین نے انہیں زیرو کر دیا پھر ہم لوگ اٹھ کر چل دیئے۔ بھائی نے ڈانٹ پلائی' ہم دونوں نے یہ ہی کہا کہ بھئی' تھوڑا fun کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہم نے ہوٹل کا بوفے (Buffet) چیک کیا' بہترین تھا لیکن طے یہ پایا کہ پہلے نیاگرا فال دیکھیں' گھومیں پھریں پھر آ کے بوفے انجوائے کریں گے' سو فال کی جانب بڑھے۔ اچھا خاصا پیدل کا راستہ تھا۔ احسن نے ایک ٹیکسی کو روکا اور ہم لوگ منٹوں میں فال کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ وہاں سے چلے تو Made of the Mist بالکل سامنے تھا۔ وہاں ہم سب لوگوں نے Flavoured Yogurt (جس کے مختلف فلیورز ہوتے ہیں۔) لیا۔ مجھے تو Vanilla اچھا لگتا ہے۔ بھائی نے اسٹرابیری' بھابھی نے چاکلیٹ اور احسن نے اپنی پسند کا لیا۔ سب اپنے اپنے فلیورز کو بہترین قرار دے رہے تھے۔ میڈ آف دی مسٹ کا ٹکٹ لینے پر لمبی قطار تھی۔ یہاں سے ٹکٹ لینے کے بعد ہم ایک لمبی قطار میں لگ گئے۔ جب نیچے پہنچے تو کیمرے کے ساتھ فوٹوگرافر صاحب کھڑے تھے' انہوں نے ہم چاروں کی فٹافٹ ایک تصویر بنا کے ہمیں ایک عدد رسید سے نوازا کہ واپسی پر اگر ہم وہ تصویر خریدنا چاہیں تو خرید سکیں۔ آخرکار بالکل بوٹ کے نزدیک پہنچے تو سب سے پہلے انہوں نے بلیو کلر کا پلاسٹک کور پہننے کو دیا تاکہ پانی سے کچھ نا کچھ بچاؤ ہو سکے۔ نیاگرا پر پانی 170 فٹ اوپر سے گرتا ہے۔ بھائی نے کہا تھا کہ بوٹ میں سب سے آگے کھڑے ہونا تاکہ خوب انجوائے کر سکو۔ خیر صاحب' بوٹ چلی' پانی دور سے ہی اڑاڑ کے آ رہا تھا اور چہرہ بھگو رہا تھا۔ کیا حسین نظارہ ہے...... میرا دل بے اختیار کہہ اٹھا کہ

سُبحان اللّٰہِ وبحمدہ سُبحان اللّٰہِ العظیم

خدا کی قدرت کا بے نظیر کرشمہ ہے نیاگرا فال۔ دو جگہ سے فال گرتا ہے' بالکل سامنے سے جو سیدھا سا گرتا ہے' وہ 'امریکن فال' کہلاتا ہے اور کینیڈا کا فال ہارس شو نال کی شکل میں گرتا ہے۔ وہاں بے شمار لوگ پیدل بھی مارچ کر رہے تھے۔ وہاں سے امریکی سرحد بھی دیکھی۔ امریکہ سے آنے والے سیاح پہلے پلاسٹک کور میں تھے۔ بے شمار آبی پرندے حسین جھیل میں بسیرا کیے ہوئے تھے۔ دور ایک بہت بڑے پتھر پر سفید آبی پرندے براجمان تھے اور اُن سے کافی فاصلے پر ایک دوسرے بڑے پتھر پر کالے آبی پرندے بیٹھے تھے۔ ایک نظم و ضبط تھا۔ یہ دیکھ کے سخت حیرت ہو رہی تھی کہ کالے پرندوں میں ایک بھی سفید شامل نہیں تھا اور سفید پرندوں میں کوئی کالا نہیں تھا۔ بار بار رین بو (Rain bow) بن رہی تھی اور ہمارا دل بخدا کی قدرت پر نثار تھا۔ وہ سماں دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتا تھا جب بوٹ پانی کے اندر تک چلی گئی تھی۔ وہاں سے بوٹ چلانے والا اُس کو نہیں موڑتا بلکہ پانی کا پریشر خود بوٹ کو دھکا دے کر مڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ ایسا دلفریب نظارہ تھا کہ میرا اور مجھ جیسا پانی سے پیار کرنے والے نہ جانے کتنوں کے دل وہیں رہ گئے ہوں گے۔ بھائی نے بے شمار تصاویر بنائیں۔

بوٹ سے اترنے والی آخری مسافر میں ہی تھی۔ وہاں سے آ کر اپنا بلیو پلاسٹک کور گاربیج میں پھینکا۔ کچھ آگے بڑھے تو ایک بڑی shop تھی' وہاں سے کچھ نیاگرا فال کے سوونیئر بچوں کے لیے خریدے۔ جب تک میں شاپ سے باہر آئی' احسن اتنی دیر میں اُس تصویر کی دو copies خرید چکا تھا جو آتے وقت فوٹوگرافر نے کھینچی تھی۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر بڑی بڑی دوربینیں لگی ہوئی تھیں جن میں سکے

ڈال کے آپ نیاگرا کو دوبارہ انجوائے کر سکتے ہیں۔ حسین پھولوں کے تختے کے تختے لگے ہوئے تھے جن میں بے شمار پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ یہاں بھی کئی تصویریں بنوا کر آگے بڑھے تو ایک صاحب کرسی پر بیٹھے گٹار پر زبردست دھن بجا رہے تھے اور عمدہ آواز میں گانا گا رہے تھے۔ ہم فوراً وہیں رک گئے۔ بھائی سے کہا کہ اس آرٹسٹ کے ساتھ بھی تصویر ہونی چاہیے' تصویر کھنچوا کے دیکھا تو پتہ چلا کہ بھابھی اپنے پرس



شگفتہ شفیق اپنے بھائی، بھابی اور احسن کے ہمراہ نیاگرا فال پر

میں سے پیسے نکال کر ڈال رہی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ صاحب گا گا کے مانگتے ہیں یعنی 'مہذب فقیر' ہیں پھر واپسی پر ہلٹن ہوٹل میں بوفے کھایا۔

اس بوفے میں بے شمار و بے حساب ورائٹی تھی لیکن ہمیں تو اپنی حلال اشیاء ہی کھانی تھیں' سو ہم نے Shrimps and fish, sweet corn اور ویجی ٹیبل رائس اور سلاد لیا۔ وہاں کے shrimps کا جواب نہیں۔ اُس کے بعد فروٹ سے انصاف کیا۔ میٹھا تو میں نہیں کھاتی' مجھے ذرا کم پسند ہے۔ وہاں پر بے شمار کوکیز (cookies) اور کیک کی ورائٹی تھی۔ اُس کے بعد چائے پی اور پھر اِدھر اُدھر خوب ہی گھومے۔ نیاگرا کو رات میں روشنیوں میں نہلا دیا جاتا ہے۔ وہ نظارہ بھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان انگشتِ بدنداں رہ جائے۔

واپسی پر بھائی اور بھابھی دونوں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آرام سے سو گئے۔ میں اور میرا بھتیجا مزے سے باتیں کرتے ہوئے آئے۔ احسن نے واپسی پر دوسرا راستہ اختیار کیا اور بالکل CN ٹاور کے نزدیک سے ہم گزرے پھر کسی دن CN ٹاور جانے کا پروگرام بنانے کا ارادہ کیا اور تقریباً 2 گھنٹے میں واپس آئے۔ گھر آ کے سب نے شاور لیا اور فریش ہو گئے۔

13 ستمبر کو صبح صبح بھائی نے نیاگرا کی تصاویر کی CD بنوا کے اور تصاویر develop کرا کے دیں۔ آج میرے پیارے بھائی اور بھتیجے احسن کی سعودی عرب روانگی تھی۔ انہوں نے اس قدر مجھے

پیار اور دلار سے رکھا کہ میری آنکھیں اُن کی محبت پر بھیگی جا رہی ہیں اور دل اُن کے پیار سے بھرا ہے اور بے اختیار دُعا کر رہا ہے کہ وہ ساتھ خیریت کے سعودی عرب پہنچیں اور اُن کے سارے کام بنیں۔
دوپہر کو آپا بھی آ گئی تھیں، وہ طلعت کو جدہ کچھ میک اپ بھیجنا چاہ رہی تھیں، سو دوپہر کا لنچ انہوں نے بھی بھائی کے گھر کیا۔ مزے دار پلاؤ، شامی کباب، اسٹیو اور سلاد رائتے نے کھانے کا لطف دوبالا کر دیا۔ بھابھی نے کھانا بہت اچھا بنایا تھا۔ ہم بھائی اور احسن کو ایئر پورٹ چھوڑ کے آئے تو عجیب اداسی نے دل کو گھیر لیا۔ اب کیا کریں؟ سو یمنیٰ سے کہا۔ "سلائی مشین لے آؤ۔" جو ہم یمنیٰ کے ڈریس کراچی سے لے گئے تھے ایک ذرا ڈھیلا تھا اور ایک کچھ تنگ، سو بیٹھ کے دونوں ڈریس فٹ کر دیئے تو کچھ اطمینان ہوا۔ میری نند بھی کراچی سے کینیڈا آئی ہوئی تھیں۔ مجھ سے کوئی دس دن پہلے اپنی بیٹی کے ہاں اُن کا فون آ گیا تو باتوں میں دل لگ گیا پھر توحید (میری دیورانی) سے بھی بات ہوئی۔ اُن سب کا اصرار تھا کہ میں جلد از جلد آؤں اور میں نے بھی جلد آنے کا وعدہ کر لیا۔
اگلے دن Loblose اور Longoes کی سیریں کیں۔ "Bay" کے وسیع و عریض حصے دیکھے جہاں مردوں اور عورتوں کے ڈریسز کی وسیع ورائٹیز تھی۔ گھریلو سامان کا بہت بڑا سیکشن ہے۔ میک اپ کی بڑی بڑی شاپس ہیں۔
بھائی کے جانے کے بعد میں اپنی بڑی بہن ماہ پارہ آپا کے ہاں آ گئی ہوں۔ آج موسم بے حد خوبصورت ہے، ہلکی ہلکی بارش، تیز ہوا اور تیز دھوپ کیسا combination ہے۔ میرے بہنوئی صاحب کی طبیعت ناساز تھی اس لیے کوئی پروگرام نہ بن سکا۔ اگلے دن آپا گروسری کرنے گئیں تو ہم ساتھ گئے۔ ہمیں News Papers کی تلاش تھی کہ ہماری کتاب کی "تقریب اجراء" کا احوال آیا ہوگا۔ کراچی اسٹورز پر گئے اور ایک ڈھیر اخبارات کا اٹھا لائے۔ 7-6 اخبارات میں پورے پروگرام کی مکمل کوریج آئی تھی۔ کینیڈا میں اخبار مفت ملتے ہیں، آپ جتنے چاہیں، لے سکتے ہیں۔ اخبارات میں جو اشتہارات چھپتے ہیں، اُن سے وہ اپنا خرچہ پورا کرتے ہیں۔
17 ستمبر 2011ء کو میں نے کینیڈا ٹی وی پروگرام "ادبی مجلہ" میں اپنی کہانی پڑھی۔ پروگرام کے میزبان تسلیم الٰہی زلفی صاحب تھے۔ جناب اثر اکبر آبادی بحیثیت شاعر اور جدہ سے آئی ہوئی مہمان محترمہ نجمہ قریشی بحیثیت مبصر شریک تھیں۔ میں نے ماہ نامہ "سچی کہانیاں" میں ایوارڈ لینے والی اپنی کہانی "کاش" پڑھی اور خوب داد وصول کی۔ اثر اکبر آبادی صاحب نے بہت ہی خوبصورت غزل پیش کی اور ساتھ ہی اپنی کتاب "جذبات اثر" ہمیں عنایت کی۔ چھوٹی سی کتاب ہے لیکن غزلیات بہت اچھی ہیں۔ ایک شعر ہمیں بہت ہی اچھا لگا۔

ڈوب جاؤ گے میری چاہت میں
مجھ سے نظریں ملا کے دیکھو تم

ہماری کہانی پر تسلیم الٰہی زلفی صاحب، اثر اکبر آبادی اور محترمہ نجمہ قریشی صاحبہ نے تبصرہ کیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مایہ ناز رائٹر ڈاکٹر کیول دھیر صاحب کی کتاب پر محترم تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے سیر حاصل تبصرہ فرمایا۔
آج کا لنچ زلفی صاحب کی طرف سے تھا، سو ہم سب نے شاندار لنچ کیا اور Sunset Beach بھی دیکھا۔ یہ حسین بیچ رچمنڈ ہلز میں واقع ہے اور بے حد خوبصورت ہے۔ بیچ کے

سامنے ایک وسیع و عریض باغ ہے جو کہ Weekend پر بالکل بھرا ہوا ہوتا ہے۔ آج بھی اُس میں کافی فیملیز آئی ہوئی تھیں۔ بیچ پر دو اسکولوں کے بچے بھی پکنک منانے آئے ہوئے تھے۔ ویسے آپ کو بتاؤں، مجھے تو پورا رچمنڈ ہلز اور مارکھم بلکہ تمام ٹورنٹو ہی پکنک پوائنٹ لگ رہا تھا، حسین مناظر، دلکش موسم اور دلربا نظارے، کینیڈا میں رہنے والے کہتے ہیں کہ کینیڈا زمین پر جنت ہے بشرطیکہ جیب میں ڈالرز ہوں۔
کینیڈا میں خوب ہی آزادی ہے۔ ہر شخص دوسرے کے جذبات کا احترام کرتا ہے۔ بچوں کو ہی لے لیجیے، سب بچوں کی اپنی اپنی مرضی ہے کہ کھائیں یا نہ کھائیں۔ ابھی کھائیں یا کبھی کھائیں، دروازے بند کر کے بیٹھیں۔ اگر وہ بات آپ سے کریں تو بہت مہربانی ہے اور نہ کریں تو مائنڈ نہ کریں۔ ہر ایک بات پر شکریہ ضرور ادا کریں۔ میری بھابھی جب بھی کسی سے راستہ پوچھتی تھیں تو ضرور کہتی تھیں۔
"I appreciate your kindness."
رستہ یوں پوچھنا پڑتا تھا کہ مجھے کئی نئے ایڈریس پر لے جانا ہوتا تھا جیسے ہم مسز شمس کے گھر گئے۔ اپنے کراچی کے پُرخلوص پڑوسیوں سے کینیڈا میں ملنا بہت ہی اچھا لگا۔
راستوں میں پارکنگ میں کسی کو ہرگز ہارن نہ دیں۔ یہ بالکل گالی کی مانند سمجھا جاتا ہے کہ آپ نے مجھے ہارن کیوں دیا؟ وہ آدمی یوں محسوس ہوتا ہے کہ پتھر کا بن گیا۔ راستے سے ہٹتا ہی نہیں ہے جس کو ہارن دیا جائے اور وہ اس کی وجہ نہ جان جائے لیکن اگر اس کی غلطی ہے تو وہ معذرت کرنے میں بھی دیر نہیں کرتا ہے۔
(اس دلچسپ سفرنامے کا باقی حصہ اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔)

☆☆☆

ڈائری سے ایک ورق

تیرے انتظار کی ریت پر
کوئی لفظ میں نے لکھا نہ تھا
کوئی حرف میں نے کہا نہ تھا
کوئی خواب میں نے بُنا نہ تھا
اسی انتظار کی ریت پر
میری آرزو کے گلاب تھے
میری جستجو کے سراب تھے
کبھی حسرتوں کے جواب تھے
اسی انتظار کی ریت پر
میں بکھر گیا ہوں ہواؤں میں
مجھے یاد رکھنا دُعاؤں میں

شرجیل اقدس۔ جیکب آباد

آصفہ اقبال بلوچ

زندگی لکھ رہی ہوں

شاہدہ لطیف کا خیال

وہ دن بھی یاد رکھنا ہے ابھی جو کل ہی بیتا ہے
جو، اب ماضی کا حصہ ہے ہمیشہ یاد رکھنا ہے

ہماری اپنی لکھاری کی زیست کے چند اوراق لفظوں کی صورت نذر قارئین

اپنی زندگی کو ترتیب دے کر لکھنا مجھے بڑا مشکل لگ رہا ہے۔ کب سے سوچ رہی ہوں، شروعات کہاں سے کروں؟ میرے حساب سے شروعات مجھے بچپن سے کرنی چاہیے۔ تین بہنوں اور ایک بھائی میں میرا نمبر دوسرا ہے یعنی مجھ سے بڑی بہن انیلا دوسرے نمبر پر میں، تیسرے نمبر پر عرشی اور سب سے چھوٹا اور لاڈلا اکلوتا بھائی عمران ہے۔

آج میں تھوڑا بہت جو بھی لکھنے لگی ہوں، اس کے پیچھے بہت سے لوگوں کا ہاتھ ہے۔ سب سے پہلے میں اپنی ماں کا ذکر کروں گی، میری ماں ہمیشہ سے ہی میرے بہت قریب رہی ہیں، وہ اگرچہ میری سب سے گہری سہیلی تو نہیں مگر میں ان کی ہمیشہ سے گہری دوست رہی ہوں۔ وہ اپنی ہر چھوٹی بڑی پریشانی اور ہر چھوٹی بڑی خوشی سب سے پہلے مجھ سے شیئر کرتی ہیں۔ میری ماں ایک بے حد صابر اور حوصلہ مند عورت ہیں، ان کی ساری زندگی اس طرح سے گزری ہے کہ شاید ہی کوئی عورت ان کی طرح زندگی گزار پائی۔

مجھ میں بھی اپنی والدہ کی کئی عادتیں ہیں، میں بے حد تنہائی پسند ہوں، مذہب کی طرف شروع سے مائل رہی بلکہ یہ سہرا بھی ماں کے سر جاتا ہے۔ میری ماں انتہائی مذہبی خاتون ہیں۔ زیادہ تر روزے سے ہوتی ہیں۔ اُن کی دُعائیں، اُن کا پیار ہی میرا سرمایہ ہے۔

اپنی دو بہنوں کے مقابلے میں، میں سانولی رنگت لے کر پیدا ہوئی اور یہ احساسِ کمتری میرے ساتھ ساتھ جوان ہوتا رہا۔ یہ احساسِ کمتری مجھے دیمک کی طرح کھاتا تھا۔ میرے بھائی اور بہنوں کے رنگ قدرے صاف تھے، اُن کے درمیان میں سادہ سا وجود لیے خاندان والوں کی نظروں میں ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنتی۔ مجھے بننے سنورنے سے بھی

دلچسپی نہ تھی جبکہ میری بہنیں جدید تراش خراش کے لباس میں اور بھی جاذب نظر دکھائی دیتیں۔ میں رات کو اکثر لوگوں کی باتیں سوچتی اور روتی رہتی ایسا نہ تھا کہ میں بدصورت تھی بس سانولا رنگ میرے لیے ایک خامی بن کر رہ گیا تھا......اور پھر بات صرف اتنی ہی نہ تھی۔ میں اپنے بھائی اور بہنوں میں ذہانت کے معاملے میں بھی مار کھا گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس زمانے میں مجھے پڑھائی کا خاص شوق نہ تھا، نہ میری سمجھ میں کچھ آتا تھا، روز ٹیچرز کی ڈانٹ کھاتی اور گھر آ کر روتی اور پھر ایک دن تو روتے روتے گھر سر پر اٹھا لیا تھا کہ مجھے اب اسکول نہیں پڑھنا، آپ لوگ اپنی فیسیں برباد نہ کریں۔

گھر والوں نے بہت سمجھایا مگر میں نہ مانی پھر پتہ نہیں، امی کے ذہن میں کیا آیا کہ انہوں نے میری بات مان لی اور میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا لیکن اب ہونے یہ لگا تھا کہ مجھے سارے گھر کا کام کرنا پڑتا، بہنوں اور بھائی کے یونیفارم استری کرنا، جوتے پالش کرنا، کچن کا کام غرض کہ اب ہر کام میرے ذمے ہو گیا تھا، اوپر سے گھر میں جو بھی مہمان آتا اور اسے جب یہ پتہ چلتا کہ میں پڑھائی چھوڑ چکی ہوں تو وہ مجھے کبھی مذاق اور کبھی سوبر طریقے سے تنقید کا نشانہ بناتا۔ آہستہ آہستہ میری ہمت جواب دے گئی، پہلے شکل وصورت کے معاملے میں میرا موازنہ کیا جاتا تھا تو اب بات پڑھائی اور ذہانت کی آ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ چھوٹے بھائی بہنوں نے بھی طعنے دینے شروع کر دیئے تھے تو پھر آخر کار ایک دن میں نے امی سے کہہ دیا تھا کہ مجھے دوبارہ پڑھائی شروع کرنی ہے۔

امی جیسے مجھے یہی دن دکھانا اور یہی سبق سکھانا چاہتی تھیں کہ بنا تعلیم انسان زیرو ہی ہے۔

یہاں میں اپنی بڑی بہن کی بھی ہمیشہ احسان مند رہوں گی کہ جن کی بدولت مجھے کراچی کے ایک اچھے اسکول میں داخلہ ملا اور پڑھائی کے اس سلسلے میں میری بہن نے میری خوب مدد اور رہنمائی کی تھی، یوں کراچی کے مشہور میٹروپولیٹن اکیڈمی (نصیر آباد برانچ) میں میرا داخلہ ہو گیا اور پھر میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ شروع شروع میں بہت دشواریاں پیش آئیں لیکن میں ثابت قدم رہی۔ میں نے دن رات ایک کر دیئے۔ میری ایک دوست زوبیہ الیاس تھی۔ (نہ جانے اب وہ کہاں ہے؟) ہم میں گہری دوستی تھی۔ وہ بلا کی ذہین تھی۔ وہ بھی پڑھائی میں میری بہت مددگار ثابت ہوئی تھی۔ وہ فرسٹ آتی تو میں سیکنڈ۔ کبھی میں تو فرسٹ تو وہ سیکنڈ، یوں میں نے میٹرک میں بھی نمایاں پوزیشن لی تھی۔ ہم میٹرک کے بعد بچھڑ گئے تھے۔ میں زوبیہ الیاس سمیت اپنی بہت سی دوستوں کو آج تک مس کرتی ہوں۔ خدا کرے، وہ جہاں بھی ہوں، خوش ہوں۔ میں نے پڑھائی پر توجہ کے ساتھ دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ میں ایک بہت اچھی مقررہ ہی نہیں بنی، ٹیبلوز، ملی نغمے اور دوسرے مقابلوں میں میری شرکت لازمی ہو گئی تھی۔

جب میں سیکنڈ ایئر میں تھی کہ میری زندگی میں اقبال بلوچ نے محبت بھرا قدم رکھا، تب میری منگنی اور ڈیڑھ سال بعد میری شادی اقبال بلوچ سے ہوئی۔ یہاں میں یہ بات بتاتی چلوں کہ کالج پہنچنے تک میں اپنی شخصیت کو بدلنے میں بہت حد تک کامیاب رہی تھی۔

کہتے ہیں، جھونپڑے کو صاف رکھو تو وہ بھی خوشنما لگتا ہے، یہ تو پھر میں ایک انسان تھی۔ میں نے اپنی شخصیت کو سنوارنا سیکھ لیا تھا اور ویسے بھی جوانی کا اپنا ہی ایک نکھار ہوتا ہے۔

اقبال بلوچ سے میری شادی لو میرج کا نتیجہ تھی،

میرے گھر والے اس شادی سے خاص خوش نہیں تھے کیونکہ ہمارا تعلق گجراتی اور میرے شوہر کا بلوچ کمیونٹی سے تھا۔ قصہ مختصر کہ آخر گھر والوں نے میری یہ ضد مان لی تھی۔

میں نے اقبال بلوچ کے ساتھ شریکِ سفر کی صورت زندگی کے نئے سفر پر قدم رکھا تو احساسِ کمتری کے چکر سے بھی میں جیسے آزاد ہوگئی۔ اب مجھے کسی اور کی بات اور سوچ کی کوئی پروا نہیں تھی، میرے لیے یہی احساس کافی تھا کہ کسی نے مجھے پسند کیا اور اپنی زندگی میں شامل کیا...... کوئی بات تو ضرور ہوگی مجھ میں اور اس 'کوئی بات' نے مجھے احساسِ برتری دلادی۔

شادی کے کچھ عرصے بعد ہم امریکہ چلے گئے تھے، وہاں بہت کٹھن وقت بھی گزرا اور بہت اچھا وقت بھی۔ میں ایک بیٹے کی ماں بھی بن گئی۔ میری زندگی میں جب بہت کٹھن وقت آیا تو اس بڑے کٹھن وقت میں میرا بیٹا علی اسد میرا سہارا بنا رہا۔ اس سے میرا ویسے ہی رشتہ ہے جیسا میری ماں کا مجھ سے، 'عزت، احترام، دوستی، عشق اور پتہ نہیں کیا۔

امریکہ میں ہی میں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ وہاں میں نے ''پاکستان پوسٹ'' اور ''اُردو ٹائمز'' کے لیے غزلیں لکھیں۔ میری ابتدا تو شاعری سے ہوئی تھی مگر کچھ missing تھا جیسے کچھ رہ سا گیا ہو اور یوں میری پہلی کہانی ''میرا گھر، میری جنت'' ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' شمارہ اگست ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اُس وقت خوشی کا جو عالم تھا، وہ بیان سے باہر ہے۔ یہاں میں یہ بات بھی عرض کرتی چلوں کہ میری کہانیاں میرے شوہر کے علاوہ سب پڑھتے ہیں، تعریف کے ساتھ مجھے مشورے بھی دیتے ہیں۔ میری تو یہ خواہش ہے، کاش، میرے شوہر بھی میری کہانیاں پڑھیں، تنقید کریں، مشورے دیں۔

بہرحال کہانی لکھنے کے حوالے سے ایک بہت خاص بات یہ ہے کہ میں کہانی لکھ کر سب سے پہلے اپنی ماں کو سناتی ہوں۔

میرے سسرال والے بہت عزت اور محبت کرنے والے لوگ ہیں، اُن سے میں نے بہت کچھ سیکھا، انہیں عزت اور مان دیا اور آج بچہ بچہ مجھ سے بے پناہ پیار اور مجھے ڈھیر ساری عزت دیتا ہے۔ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں جب میری کہانی شائع ہوتی ہے تو میرے بھائی بہنوں کے بعد میرے سسرال والے ہی ہوتے ہیں جن کی طرف سے مبارکباد اور نیک تمناؤں کا اظہار ہوتا ہے۔

اللہ کا لاکھ کرم ہے کہ اس نے مجھے علی اسد کے بعد ارسلان جیسے پیارے بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔ میرے یہ دونوں بچے بہت ذہین اور سعادت مند ہیں۔ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور میں اپنی ماں کے بعد اگر کسی سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہوں تو وہ میرے دونوں بیٹے ہیں۔ میرے دونوں بیٹے The City School میں پڑھتے ہیں اور پڑھائی میں خاصے اچھے ہیں۔ شکر خدا کا، اپنے بچپن میں جیسی میں تھی، وہ ویسے نہیں ہیں۔

میں نے زندگی کے ہر چیلنج کو قبول کیا اور ہمیشہ اس پر پورا اترنے کی کوشش کی۔ بچپن سے لے کر اب تک اللہ نے مجھے سب کچھ دیا ہے مگر پھر بھی جو لوگ کھو گئے ہیں، میں چاہتی ہوں، وہ ایک بار پھر سے ملیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں نے اسکول و کالج لائف کے بعد جسے اپنی بیسٹ فرینڈ بنایا، وہ رشتے کے حساب سے میری نند ہیں جو عمر میں مجھ سے ۲۵ سال بڑی ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میری نند زبیدہ حیدر میری سب سے قریبی دوست ہیں، وہ رشتے میں میری نند ہی نہیں بلکہ انہوں نے مجھے ہمیشہ ایک دوست اور ایک بیٹی کے

طور پر ٹریٹ کیا مگر بدقسمتی سے وہ اَب امریکہ میں ہیں، یوں اب ہمیں بات چیت کے زیادہ مواقع تو نہیں ملتے مگر وہ جو ایک دل سے دل تک کا رابطہ ہوتا ہے، وہ برقرار ہے۔ ہماری سوچ، ہمارے خیالات، ہماری زندگی میں بہت کچھ ایک سا ہے۔ وہ اکثر کہتی ہیں۔

''آصفہ......! ہم دونوں غلطی سے اِس صدی میں پیدا ہوگئے، ہمیں تو بہت پہلے پیدا ہو جانا تھا۔''

وہ ہمیشہ سے میرے لیے ایک آئیڈیل رہی ہیں۔ وہ بھی میری طرح تنہائی پسند، لوگوں سے دور بھاگنے والی ہیں۔ اصل میں اُن کی طرح مجھے بھی منافقت اور لوگوں کے دہرے رویے ہمیشہ دکھ پہنچاتے ہیں، سو اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ لوگوں کو کھوجنے کے بجائے ہم خود کو کھوجیں۔

مجھے اپنے گھر سے بے انتہا محبت ہے۔ میں اپنے گھر میں بے حد سکون سے رہتی ہوں۔ بلاوجہ باہر جانا مجھے ویسے بھی پسند نہیں مگر کبھی مجبوری کے تحت کہیں جانا بھی پڑے تو میرا جی بس یہی چاہتا ہے کہ میں جلدی سے اپنے گھر جاؤں۔ یہ عادت بھی مجھ میں میری ماں کی ہی آئی ہے۔ میرا بیٹا علی اسد کچھ عرصہ پہلے تک تو اکثر کہتا تھا کہ ''مما......! آپ تھوڑی سی تو سوشل ہوں، آپ کا یہ طرزِ زندگی تو ابنارملٹی کے زمرے میں آتا ہے، آپ نارمل لائف گزاریں۔''

میرا بیٹا کچھ غلط نہیں کہتا تھا۔ ''مگر مجھے باہر رہ کر ابنارمل لوگوں کا حصہ نہیں بننا۔ میں جیسی ہوں، ٹھیک ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اُسے خاموش کروادیتی تھی، شاید اسی لیے اَب تو اُس نے ایسا کہنا چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے، میں ضدی طبیعت ہوں، اپنے حساب سے زندگی گزارتی ہوں۔

مجھے لگتا ہے کہ مجھے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ زندگی

عشق

عاشقی میں مرد کی عمر عورت سے زیادہ ہے۔ یوں بھی عورت تو ہمیشہ سے کم عمر ہے کیونکہ جس وقت پہلا مرد بھرپور جوان تھا' اس وقت تو یہ پہلی بار پیدا ہوئی تھی لیکن عشق میں اس نے ہر قسم کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اس کا نام ہمیشہ مردوں سے پہلے آیا جیسے سسی پنوں' ہیر رانجھا' لیلیٰ مجنوں' سوہنی مہینوال وغیرہ۔ مرد کم ہی چوٹی کے عاشق گزرے ہیں۔ اکثر عورتیں ہی چوٹی کی عاشق ہیں...... عورت کے لیے اس شخص کو محبت کا یقین دلانا آسان ہے جس سے محبت نہیں کرتی بہ نسبت اس شخص کے جس سے کرتی ہے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کے مضمون '' کچھ عاشق کے بارے میں'' سے اقتباس

کے کئی phases ہیں جن سے گزر کر آج میں ایک بااعتماد عورت بنی ہوں۔ جو لوگ مجھے سمجھتے ہیں' اُن کے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن جو مجھے اَب تک سمجھ نہیں پائے' اُن کے لیے میں مشکل ترین ہستی ہوں۔ میرا کل سرمایہ حیات میری ماں' میرے شوہر' میرا گھر' میرے بچے اور میرے وہ بھائی بہن ہیں جو آج کل مجھ سے دور امریکہ میں مقیم ہیں' یوں میں اکیلی ہی یہاں ہوں لیکن یہ بات میرے لیے باعثِ اطمینان اور سعادت ہے کہ کم از کم میرے والدین تو میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اپنی زندگی کی اِس مختصر سی تحریری جھلک کے آخر میں' میں اتنا ہی کہوں گی کہ میرے تھوڑا بہت کہانی کی صورت لکھنے کو قارئین سراہتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اپنی ہر کہانی میں میرا اپنا وجود کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا ہے۔ میری سوچ' میرا خواب' کوئی نام' کوئی واقعہ' کچھ ادھوری رہ جانے والی خواہشیں' یوں کہانی لکھ کر میں خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کرتی ہوں۔ آج تو میرا ایمان یہ ہے کہ زندگی میں کبھی ہارنا نہیں چاہیے نہ اپنی ذات کو کم تر سمجھنا چاہیے۔ اگر میں احساسِ کمتری سے باہر آسکتی ہوں' نالائق سے بہت لائق اسٹوڈنٹ بن سکتی ہوں تو اور لوگ ایسا کیوں نہیں کرسکتے؟

کچھ دن قبل ماموں جان بمع اپنے ذہین لائق بچوں سمیت امی کے گھر آئے تھے۔ اتفاق سے میری بھی اُن سے وہاں ملاقات ہوگئی۔ یہ ملاقات کافی عرصے بلکہ سالوں بعد ہوئی تھی۔ میں اپنے ماموں زاد بھائیوں سے مذہب' سیاست' کھیل' شوبز' غرض کہ ہر موضوع پر بات کررہی تھی کہ اچانک ماموں' امی سے مخاطب ہوئے تھے۔

''آپا......! آپ کی یہ بچی تو ماشاء اللہ' بڑی talented ہے۔'' یہ میرے وہی رشتے دار ہیں جو اس طرح کی تعریفیں کبھی صرف میرے بھائی بہنوں کی کیا کرتے تھے اور میرے لیے!...... یقین جانیے' میں کبھی اپنے بھائی بہنوں کی تعریف پر حاسد نہیں ہوئی تھی بلکہ لاشعوری طور پر یہ اَرمان دل میں چھپا رکھا تھا کہ کبھی کوئی مجھے بھی باصلاحیت سمجھے' کہے اور اَب اتنا عرصہ گزرنے کے بعد' اتنے طویل انتظار کے بعد یہ تعریفی جملے سننے کو ملے تو مجھے وہ خوشی نہیں ہوئی جو میں سمجھتی ہوں' بچپن میں ہوتی۔

میں اپنی اس کہانی کا اختتام اِس بات سے کروں گی کہ خدا کی ذات پر مکمل ایمان' عشقِ رسول ﷺ سے اپنے دل کو منور کیجیے' ہمت اور will power' اِن فارمولوں کی بنیاد پر آپ دنیا جہاں سب کچھ فتح کرسکتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' ایک مفید معلوماتی اور مستقل سلسلہ ہے۔ یہ کالم خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے ساتھ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے استفادہ کیا اور ہزاروں لوگوں نے اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ حاصل ہوتا رہا' اسی تناسب سے ہر ماہ وصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ گزشتہ کئی برسوں میں ان خطوط کی تعداد اتنی تجاوز کرگئی کہ اگر ''سچی کہانیاں'' میں جواب دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے اپنے جواب کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیونکہ پرچے کے صفحات بہرحال محدود ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس رہا ہے کہ لوگوں کے مسائل اور مشکلات بہت زیادہ اور عموماً فوری حل طلب ہوتی ہیں۔ ان کے لیے طویل انتظار ایک اذیت ناک کام ہے۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جواب براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا' ان کا ریکارڈ مرتب کرنا' انھیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے اور مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ میری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ ان صفحات کی ترتیب' تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی' قومی یک جہتی کی دعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دعائے خیر ہے اور بس! حقیقت تو یہ ہے کہ دعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور اس سے زیادہ قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ صاحبِ استطاعت حضرات اور خواتین سے درخواست ہے کہ وہ ٹوکن منی (100/-) روپے کو آخری حد نہ سمجھیں' وہ اپنی بساط کے مطابق اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں بسنے والی اُن خواتین کے جوابات بھی سپردِ ڈاک ہوجائیں گے جو کسی مجبوری کی بنا پر ڈاک خانے تک جا نہیں سکتیں اور (100/-) روپے کا منی آرڈر نہیں کرسکتیں۔ یہ نیکی ہے جس کا اجر اس دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی! اب تک صرف ممالکِ غیر میں مقیم حضرات نے از خود تعاون کیا ہے۔ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو قارئین کے خطوط اور میرے جوابات کو فوری سپردِ ڈاک کرنے' ریکارڈ مرتب کرنے اور دیگر متعلقہ امور کو سرانجام دینے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں تو براہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 100/- روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ سچی کہانیاں کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم ان افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ لفافے میں بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ کا نمبر ضرور تحریر کریں۔ وہ تمام خطوط جو 100/- روپے ٹوکن منی اور جوابی لفافے کے بغیر موصول ہوں گے' ان کے جوابات حسبِ سابق پرچے میں شائع ہوتے رہیں گے۔ خط ارسال کرنے سے پہلے درج ذیل ہدایات نوٹ فرمائیں:۔

(۱) براہِ راست جواب درکار ہو یا کالم کے ذریعے دونوں صورتوں میں اپنا اور اپنی والدہ کا اصل نام تحریر کریں' کالم میں اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو اصل نام کے ساتھ کوئی فرضی نام بھی تحریر کریں تاکہ مسئلہ اسی نام سے شائع کیا جائے۔ جان بوجھ کر گمنام اور فرضی پتوں کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ (۲) پوری سچائی کے ساتھ پیش کریں' غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ اس سے فائدے کی بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہے (۳) منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ صرف ماہنامہ سچی کہانیاں کے نام ارسال کریں (۴) اپنا مسئلہ مختصر' واضح اور کاغذ کی ایک جانب لکھیں۔ ایک خط میں دو سے زیادہ مسائل تحریر نہ کریں (۵) کوئی عمل یا وظیفہ کریں' نماز کی پابندی کا عہد کریں اور اپنے لیے دعا کرنے سے پہلے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے دعائے خیر کریں (۶) صرف خصوصی وظائف کی اجازت درکار ہوگی۔ لفافے کو بند کرنے کے لیے زیادہ گوند نہ لگائیں' اس طرح خط پھٹ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط ہم تک نہیں پہنچتے لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ خط رجسٹری ڈاک سے بھیجے جائیں۔ جوابی لفافے پر مکمل پتا واضح و خوشخط لکھا جائے۔ فوری جواب کے لیے اپنی ڈاک اس پتے پر روانہ کریں۔

سچی کہانیاں' 110 آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ۔ کراچی

ماہِ مُحرّمُ الحرام

عزیزو......!

خداوندِ کریم نے قرآنِ الجید میں چار مہینوں کو حُرمت والا قرار دیا ہے۔ مُحرّمُ الحرام، رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ۔ ایام جہالت میں بھی اِن مہینوں میں لڑائی کا آغاز نہیں کیا جاتا تھا۔ سیّدنا رضاؓ سے روایت ہے حضور اکرم ﷺ محرم الحرام کی یکم تاریخ کو دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور جب نماز سے فارغ ہوتے تو ہاتھ اٹھا کر یہ دُعا تین بار پڑھتے تھے۔ (دُعا) ماہ محرم الحرام کی دسویں کو سیّدنا حضرت اِمام حسینؓ شہید ہوئے۔ اِس روز بہت کچھ پڑھنے کی تاکید ہے جسے یہاں لکھنے سے بات طویل ہوجائے گی۔ اِس روز کی عبادت ہرگز ترک نہ کریں۔ روزہ بھی رکھیں۔ اِس دن کی عبادت سوسال کی عبادت کے برابر ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَنتَ اِلاّ لَہُ القَدیمُ وَھٰذِہٖ سَنَتہ" جَدِیدَۃ" فَاَسئَلُکَ فیھاَ العِصمَۃَ مِنَ الشَّیطٰنِ وَالقُوَّۃَ عَلیٰ ھٰذِہِ النَّفسِ الاَمَّارَۃِ بِالسُّوٓءِ وَالاِشتِعالَ بِمَایُقَرِّ بُنِي اِلَیکَ یَاکَرِیمُ یَاذَاالجَلَالِ وَالاِکرَامِ یَاعِمَادَ مَن لَا عِمَادَ لہ یَاذُخرَمَن لَاذُخرَلَہ یَاحِرزَمَن لَا حِرزَلَہ یَاغِیَاثَ مَن لَاغِیَاثَ لَہ یَاسَنَدَ مَن لَا سَنَدَ لَہ یَا کَنزَ مَن لَا کَنزَ لہ یَاحَسَنَ البَلَاءِ یَاعَظِیمَ الرَّجَاءِ یَاعِزَّ الضُّعَفَآءِ یَامُنقِذَالغَرقیٰ یَامُنجِیَ الھَلکیٰ یَامُنعِمُ یَامُجمِلُ یَامُفضِلُ یَا مُحسِنُ اَنتَ الَّذِی سَجَدَ لَکَ سَوَادُاللَّیلِ وَنُورُالنَّھَارِ وَضَوءُ القَمَرِوَشُعَاعُ الشَّمسِ وَدَوِیُّ المَآءِ وَحَفِیفُ الشَّجَرِ یَااَللّٰہُ لَاشَرِیکَ لَکَ اَللّٰھُمَّ اجعَلنَا خَیرًامِّمَّایَظُنُّونَ وَاغفِرلَنَا مَالَایَعلَمُونَ وَلَا تُؤَاخِذنَابِمَا یَقُولُونَ حَسبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّاھُوَعَلَیہِ تَوَکَّلتُ وَھُوَ رَبُّ العَرشِ العَظِیمِ اٰمَنَّا بِہٖ کُلّ" مِّن عِندَ رَبِّنَاوَمَایَذَّکَّرُاِلَّا اُولُوالاَلبَابِ رَبَّنَا لَاتُزِغ قُلُوبَنَا بَعدَ اِذھَدَیتَنَا وَھَب لَنَا مِن لَّدُنکَ رَحمَۃً اِنَّکَ اَنتَ الوَھَّاب

□ شمیم بانو۔ کراچی۔

o بابا جی! السلام علیکم! میں آپ سے دو مسئلے شیئر کرنا چاہتی ہوں اپنی بیٹیوں کے حوالے سے۔ میری بڑی بیٹی کا نام عذرا بانو ہے، عمر تقریباً 28 سال ہے۔ دوسری بیٹی کا نام اسماء ہے۔ عمر 26 سال ہے۔ میری بہت کوششوں کے باوجود بھی ان کے رشتے نہیں ہوتے، لوگ آتے ہیں اور دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی آپ کو کئی خط لکھ چکی ہیں اور ان کے رشتوں کے لیے آپ کو 8 سال سے خط لکھ رہی ہوں لیکن کہیں سے رشتے نہیں آتے ہیں، آتے ہیں تو بات نہیں بنتی۔ اب تو ان کے ساتھ نجانے کیا مسئلہ ہوگیا ہے کہ ان کے چہروں پہ جھائیاں ہوگئی ہیں، صحت اتنی خراب ہوچکی ہے اور ایک بیٹی کے تو جسم پر کالے داغ ہوگئے ہیں جو باوجود علاج کے، ختم نہیں ہوتے ہیں اور چہروں سے بڑی عمر کی نظر آنے لگی ہے۔ دونوں کا نظامِ ہاضمہ بھی درست نہیں، علاج کروا کروا کر تھک چکے ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ چھوٹی بیٹی کو جو کالے داغ ہیں، وہ فنگس کی وجہ سے ہیں۔ بابا جی! آپ میری بیٹیوں کے لیے دعا کروایئے جو آپ کرواتے ہیں کہ ان کے اچھی جگہوں پر رشتے ہوجائیں اور ان کی بیماریاں ختم ہوجائیں اور ان کی بیماریوں کے لیے کوئی آسان حل بتا دیجیے اور ہاں، پہلے بھی آپ سے جھائیاں ختم کرنے کے لیے دوائی لی تھی لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ آپ اس کے علاوہ کوئی حل بتایئے اور آپ اس مسئلے کو اپنے ڈائجسٹ میں بھی شائع کیجیے۔ میری عمر خود 52 سال ہے اور میں اپنی بچیوں کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہوں۔ کئی وظیفے بھی کرکے دیکھ چکی ہوں لیکن کوئی کام نہیں بنتا۔ لوگوں سے کہہ کہہ کر تھک چکی ہوں، دعائیں بھی مانگتی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میری بیٹیوں کا کیا ہوگا؟ آپ چہرے کی جھائیوں کا علاج اور کالے داغوں کا بھی کوئی علاج بتایئے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

☆ بیٹی شمیم بانو......!

فَکَشَفنَا عَنکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الیَومَ حَدِیدٌ ○

مندرجہ بالا آیت ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھو۔ یہ آیت بچیاں خود پڑھیں تو بہت اچھا ہے۔ داغوں کے لیے نہار منہ نیم گرم پانی میں ایک لیموں نچوڑ کر پینا بہت فائدہ مند ہے۔ مدت 41 دن ہے۔

□ صائمہ نوید۔ کراچی۔

o بابا جی! السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ اللہ کے کرم اور فضل سے ٹھیک ہوں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر کا فشرنگ کا کاروبار ہے، پہلے دو لانچیں تھیں جن میں سے اب ایک رہ گئی ہے، ایک ڈوب گئی۔ ان پہ بہت قرضہ ہے، پیسے نہیں ہیں کہ دوبارہ کاروبار شروع کریں، بہت تنگی ہوگئی ہے۔ میرے دو بچے ہیں جن میں سے ایک بچی اسکول جاتی ہے۔ اب زندگی گزارنے میں بہت مشکل ہو رہی ہے۔ بابا جی! میں نماز باقاعدگی سے پڑھتی ہوں اور شوہر بھی پڑھتے تھے۔ جب سے یہ لانچ ڈوبی ہے، شوہر نماز بہت کم پڑھتے ہیں۔ مہربانی فرما کر ہماری مدد کریں کہ ہمارا سارا قرضہ اتر جائے اور کاروبار ٹھیک ہوجائے۔ اللہ آپ کو اجر دے گا اور میں بھی آپ کو زندگی بھر دعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی صائمہ......!

○ وَاُفَوِّضُ اَمرِیٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیرٌۢ بِالعِبَادِ ○

نماز فجر اور عشاء کے بعد 300-300 بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ ورد ترک کیے بنا مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ فرحانہ۔سکھر۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! میں اپنے تین مسئلے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ میں نے آپ کو پہلے بھی خط لکھا تھا اور آپ نے جو وظیفہ دیا تھا اس کی برکت سے آج میری چھوٹی بہن کو ابو کی جگہ نوکری مل گئی۔ بابا جی! اب ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ میری پھوپھو نے اپنے بیٹے سے ہوئی میری منگنی توڑ دی ہے کیونکہ ان کو بڑے گھر کی لڑکی چاہیے جو اپنے ساتھ زیادہ جہیز لائے۔ میں چاہتی ہوں کہ اب میری جلد از جلد شادی ہو جائے اس لیے نہیں کہ ان کو نیچا دکھانا ہے بلکہ اس لیے کہ میری امی میری منگنی ٹوٹنے سے بہت پریشان ہیں۔ بابا جی! کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرا کسی بہت ہی اچھے گھر اور اچھے خاندان سے رشتہ آجائے۔ دوسرا مسئلہ میری چھوٹی بہن کا ہے، وہ جس لڑکے کو پسند کرتی تھی اس کے گھر والوں سے ہم لوگوں نے رشتے کی بات کی تھی لیکن ان لوگوں نے انکار کر دیا ہے۔ اب میری بہن ویسے تو کہتی ہے کہ میری کہیں بھی شادی کروا دو لیکن جب کوئی رشتہ آتا ہے تو وہ ان کے سامنے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرتی ہے کہ رشتے والے پلٹ کر دیکھتے ہی نہیں۔ میری امی اس وجہ سے بھی بہت پریشان ہیں۔ وہ نہیں جانتی کہ اس نے ہم سب کو کتنا پریشان کر رکھا ہے۔ میرے ابو کا تو بس نہیں چلتا کہ وہ ہمیں ایسے ہی اپنے گھر سے نکال دیں۔ میں چاہتی ہوں میری بہن عزت کے ساتھ رخصت ہو اور تیسرا مسئلہ میرے چھوٹے بھائی کا ہے جو ابھی نویں کلاس میں گیا ہے لیکن پڑھائی میں اچھا نہیں، مشکلوں سے پاس ہوتا ہے، اس کے لیے بھی کوئی ایسی دعا وغیرہ بتائیں کہ وہ پڑھائی میں ہوشیار ہو جائے۔ میرا ایک ہی بھائی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میرا بھائی پڑھ لکھ کر کسی اچھے مقام پر پہنچے۔ بابا جی! اللہ کے بعد میری سب امیدیں آپ سے ہیں۔ امید ہے، مایوس نہیں کریں گے۔

☆ بیٹی فرحانہ......!

o فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ o

مندرجہ بالا آیت ہر نماز کے بعد 3-3 تسبیح پڑھو۔ والدہ سے کہو صدقہ خیرات بہت کریں۔

□ راحت۔کراچی۔

o بابا جی! السلام علیکم کے بعد عرض یہ ہے کہ میرا نام راحت ہے اور میری عمر 16 سال ہے۔ 20 فروری کو میرا نکاح ایک لڑکے جس کی عمر 33 سال ہے، سے ہوا۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی۔ نکاح سے پہلے ہمیں اُس کی پابندیوں کا علم نہ تھا مگر نکاح کے بعد اُس نے ہر بات پر پابندی لگانا شروع کر دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی کے گھر نہیں جانا، نہ بیوٹی پارلر جانا ہے اور نہ کسی عزیز کے گھر جانا ہے نہ گھر والوں کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے، بننے سنورنے اور میک اپ کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ میں یہ کسی بھی موقع پر مثلاً عید وغیرہ پر بھی نہیں کرنے دوں گا۔ سگے بھتیجے پر بھی شک کرتا ہے اور بڑے بھائی کے گھر جانے سے منع کرتا ہے۔ بار بار قسمیں اٹھواتا ہے اور ایک بار قرآنِ پاک اٹھانے کو بھی کہا لیکن میں نہیں مانی۔ وہ مجھ سے 11 ہزار روپے لے چکا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ موبائل میں ایزی لوڈ بھی میں ہی کرواتی ہوں اس کے موبائل میں۔ یہ خاندان سے باہر کے لوگ ہیں اور گھر والوں کی رائے سے یہ رشتہ طے پایا۔ وہ کہتا ہے کہ میری لڑائی یا کوئی بات بھی گھر والوں کو تم نہیں بتاتا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میری امی کا نام عائشہ ہے اور اس لڑکے کا نام اکرم ہے۔ اس کی امی کا نام مہتاب سنا ہوا ہے۔ کنجوس بہت زیادہ ہے، اپنے گھر والوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم بھی بہت اہمیت دینا۔ اس کی تنخواہ 7,000/= روپے ہے۔ وہ خود اور اس کے گھر والے بات بات پر مجھے طنز کرتے ہیں اور عید الفطر کے موقع پر عیدی بھی نہیں دی۔ موبائل پر بات کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی بات پر منہ بنا لیتا ہے اور لڑتا رہتا ہے۔ کوئی بات نہ مانو تو بولتا نہیں ہے اور کہتا ہے کہ پوری زندگی ہر بات اور ہر مسئلہ مرضی کے مطابق ہوگا، تمہاری مرضی نہیں چلے گی۔ میں نے کئی لوگوں سے مشورہ کیا ہے، وہ بھی مجھے طلاق کا مشورہ دیتے ہیں۔ ویسے تو وہ محبت بہت جتاتا ہے کہ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں جتنی تم تصور نہ کر سکو لیکن ذرا سی بات نہ مانوں تو وہ کئی دن نہ فون کرتا ہے اور نہ ہی ہمارے گھر آتا ہے۔ اس لڑکے کے ابو کے پاس ایک کتاب 'شمع شبستان نامہ' تعویذات کا مجموعہ بھی ہے جو وہ پڑھتے رہتے ہیں اور اس کے ابو فون پر حال بھی نہیں پوچھتے۔ اس کے علاوہ وہ لڑکا کہتا ہے کہ اگر تم نے میری ذرا سی بات نہ مانی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ اس طرح دھمکیاں دیتا ہے۔ لباس کے معاملے میں وہ کہتا ہے کہ سادہ اور ہلکے رنگ کے اور سستے کپڑے پہنا کرو جبکہ مجھے ریڈی میڈ کپڑے اور گھر میں تیار ہو کر رہنا پسند ہے۔ خود وہ بڑا فیشن ایبل ہے، پینٹ شرٹ پہنتا ہے اور شیو بنواتا ہے، سگریٹ پیتا ہے، لینس لگاتا ہے، پرفیوم اور کریم وغیرہ لگاتا ہے۔ ہمارا گھرانہ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ میرے والد صاحب عرصہ 2 سال پہلے فوت ہو چکے ہیں اور بھائیوں میں کوئی بھی میرے معاملے کو سنجیدہ نہیں لیتا، ہر کوئی اپنی دنیا میں مگن ہے۔ میں بہت پریشان رہتی ہوں کہ کل کو وہ میرے ساتھ کیا کرے گا؟ میں اس سے محبت بھی بہت زیادہ کرتی ہوں لیکن اس کی اتنی روک ٹوک مجھے پسند نہیں ہے۔ ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ طلاق لے لو۔ میرا دماغ کہتا ہے کہ اسے چھوڑ دوں مگر دل کہتا ہے کہ نہیں۔ ایک ہفتے پہلے الٹرا ساؤنڈ کروانے سے پتہ چلا ہے کہ میرے پیٹ کے دائیں طرف رسولی ہے۔ وہ بیماری کے طعنے دیتا ہے۔ اگر ٹھیک نہ ہوئی تو طلاق دے دوں گا۔ وہ کہتا ہے کہ میں تمہیں پستول سے گولی مار کر قتل کر دوں گا، اگر تم میری کوئی بھی بات نہ مانو گی اور مجھے بات بات پر جھلی، پاگل، کم عقل، ان پڑھ کہتا ہے۔ میری تعلیم مڈل ہے، اس کی میٹرک ہے۔ پلیز، میرا مسئلہ نومبر کے شمارے میں شائع کریں۔ بہت پریشان رہتی ہوں۔ برائے کرم میرے اس مسئلے کا حل نکالیں تاکہ مجھے پریشانیوں سے چھٹکارہ نصیب ہو سکے۔ میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں گی۔

□ حمیدہ وائن۔لاہور۔

☆ بیٹی حمیدہ! زخم کا علاج ہونا بہت ضروری ہے ورنہ وہ ناسور بن جائے گا۔ ادویات جو بھی استعمال کرو ان پر یَاشَافِعُ پڑھ کر دم کر لیا کرو۔ رزق میں برکت کے لیے نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد ایک ایک تسبیح یَامَالِکَ الۡمُلۡکِ کی پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ خدیجہ شاہ۔حیدر آباد۔

☆ بیٹی خدیجہ! زندگی میں جہاں سکھ ہیں، وہاں دکھ بھی ہیں۔ گھبرانا مت بلکہ پورے اعتماد کے ساتھ ہر نیا قدم اٹھاؤ، یقیناً اعتماد کے ساتھ اٹھائے گئے قدم کامیابی کی جانب ہی بڑھتے ہیں۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد ۲۱ بار سورۃ العادیات پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ۱۴ دن ہے۔

عائشہ عارف

آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سجا سکتے ہیں

انتخاب

تمنا کے پاؤں

دولت، تسکین دولت حسن کی طرح عطائے رحمان ہے۔ اس کا کوئی فارمولا نہیں اگر خواہش اور حاصل کا فرق مٹ جائے تو سکون مل جاتا ہے۔ انسان کو جو پسند ہے، حاصل کر لے یا جو حاصل ہے اسے پسند کر لے تو سکون مل جاتا ہے۔ جب ہماری تمنا کے پاؤں حاصل کی چادر سے باہر نکل جاتے ہیں تو ہمیں سکون نہیں ملتا۔

واصف علی واصف کی تصنیف "دل دریا سمندر" سے اقتباس

انتخاب: آصف زیدی۔ کراچی

اپنی جان

جان بہت ہی قیمتی چیز سمجھی جاتی ہے۔ جان حالانکہ وہ انسان کے وجود میں سب سے کم قیمت چیز ہے جو چیز اپنی نہ ہو اپنے قابو کی نہ ہو، اس کی قیمت ہی کیا لیکن ایک دنیا ہے کہ اس جان کو "اپنی جان" سمجھ رہی ہے باوجود یہ کہ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ وہ ہے کیا۔ کہاں ہے، کہاں سے آتی ہے، کہاں جاتی ہے؟ جب وہ جانے لگتی ہے تو ایک لمحہ بھی آپ اس کو روک نہیں سکتے پھر بھی وہ آپ کی ہے؟

قاضی عبدالغفار کی تصنیف "لیلیٰ کے خطوط" سے اقتباس

انتخاب: فیضان عثمانی۔ حیدر آباد

خواہش

خدا نے انسان کو خواہش کرنے کی طاقت دی ہے۔ یہاں تک کہ وہ جس چیز کی خواہش کرتا ہے، اس کی آنکھوں میں متشکل ہو جاتی ہے اور ایک ایسی منزل بھی آتی ہے کہ انسان اپنی حقیقی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے اور وہ جو اپنی حقیقی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری انسانیت اور تمام اشیاء کے لیے حقیقی زندگی کی صداقت کا مشاہدہ کرتا ہے۔

خلیل جبران کی تصنیف "شداد کی جنت" سے اقتباس

انتخاب: شاہد فراز۔ کراچی

شیطان

شیطان مرد کے دماغ میں رہتا ہے اور عورت کے دل میں! اس دنیا کا پورا نظام شیطان کی وجہ سے چل رہا ہے اگر شیطان نہ رہے تو کوئی انسان نہ رہے بلکہ سب فرشتے ہو جائیں۔ انسان رہنے کے لیے شیطان چاہیے۔ وہ نہ ہوتا تو مولویوں اور واعظوں کے بچے بھوکے مر جاتے۔ یہی تو ان کا ذریعہ روزگار ہے۔ شیطان نہ ہوتا تو کس کے خلاف تقریریں کریں؟ یہ سارے حسن کے بازار رقص و موسیقی کی محفلیں اسی کے دم سے تو ہیں۔ شیطان نہ ہوتا تو کوئی سیاست دان اور شاعر نہ ہوتا۔ عورت کا تو کوئی کام ہی نہ رہ جاتا۔ کہتے ہیں عورت بھی زمین پر شیطان کی

ایجنٹ ہے۔ شیطان کائنات میں پہلا صحافی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کو یہ خبر دی کہ آدم زمین پر جا کر کیا کیا کرے گا۔ صرف یہ نہیں، وہ پہلا وکیل بھی ہے جس نے آدم کو مشورہ دیا کہ پھل کھا لو پھر کوئی تم سے جنت کا قبضہ نہیں لے سکے گا۔ ہمیشہ کے لیے رہو گے اور فیس مشورے میں جنت لی۔ اپنی غلطی تسلیم کرنا دراصل خود کو انسان ماننا ہے کیونکہ وہ صرف شیطان ہے جس نے آج تک اپنی غلطی تسلیم نہیں کی شاید اسی لیے ہم بھی آج کل غلطی کو نہیں مانتے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی تصنیف "شیطانیاں" سے اقتباس

انتخاب: عمران ہارون چھوٹانی۔ کراچی

انمول خزانہ

کام کی باتیں

☆ گالی کا جواب گالی میں مت دو کیونکہ کبوتر، کوے کی آوازیں نہیں نکال سکتا۔

☆ برے لوگوں سے بچو، کیونکہ وہ تمہارا تعارف بن جاتے ہیں۔

☆ بیٹھے رہنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان گرتا نہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ جس کو زمین پر عاجز کرنا چاہتا ہے، پہلے اس سے عاجزی چھینتا ہے۔

☆ پاگل اور عقل مند بے ضرر ہوتے ہیں۔ صرف نیم پاگل اور نیم عقل مند خطرناک ہوتے ہیں۔

☆ دنیا کا خوش قسمت انسان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہر چیز پر راضی بہ رضا رہے۔

مرسلہ: قرۃ العین زینب۔ ملتان

یاد رکھنے والی باتیں

- لینا چاہتے ہو تو والدین کی دعائیں لو۔
- دینا چاہتے ہو تو راہ خدا میں دو۔
- لڑنا چاہتے ہو تو اسلام کی خاطر لڑو۔
- بیٹھنا چاہتے ہو تو اچھوں کی صحبت میں بیٹھو۔
- ہنسنا چاہتے ہو تو اپنی تقدیر پر ہنسو۔
- رونا چاہتے ہو تو اپنے اعمال پر رو۔
- آنا چاہتے ہو تو غریب کی مدد کو آؤ۔
- جانا چاہتے ہو تو مقدس مقامات کی زیارت کو جاؤ۔
- پینا چاہتے ہو تو صبر کے گھونٹ پیو۔

مرسلہ: عائشہ اشعر۔ کراچی

باتوں سے خوشبو آئے

✠ جو شخص اپنے ماضی کو یاد رکھتا ہے، اس کے زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔

✠ دنیا میں سب سے بڑی فتح اپنے نفس پر قابو پانا ہے۔

✠ غریب کی آہ اور فقیر کی بددعا سے ڈرو۔

✠ ماں وہ عظیم رشتہ ہے، جس کا کائنات میں کوئی نعم البدل نہیں۔

✠ سوئے ہوئے غلام کو بھی مت جگاؤ شاید وہ آزادی کے خواب دیکھ رہا ہو۔

✠ بادل کی طرح رہو جو پھولوں اور کانٹوں پر بلا امتیاز برستا ہے۔

✠ محبت وہ امتحان ہے جس میں بہت کم لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔

✠ انتقام میں جلدی اور نیکی میں تاخیر مت کرو۔

✠ مت جاؤ ایسی جگہ جہاں تمہاری عزت کچھ نہیں ہے۔

✠ دوستی وہ نازک پھول ہے جو فریب کی دھوپ میں مرجھا جاتا ہے۔

مرسلہ: سعد گھلو۔ حیدر آباد

سنہری باتیں

◎ آنکھیں جھکتی ہیں تو زمانے بھر کی حیاء اپنے اندر سمو لیتی ہیں۔

◎ آنکھیں کھلتی ہیں تو کائنات کے پردے اٹھا

دیتی ہیں۔

◉ آنکھیں مسکراتی ہیں تو کائنات کی تمام خوب صورتی اور معصومیت جذب کر لیتی ہیں۔

◉ جو عورت بدصورت نہیں ہو سکتی، وہ خوب صورت نہیں ہوتی۔

◉ اگر دنیا میں عورتوں کا وجود نہ ہوتا تو دنیا بھر کی تمام دولت بے معنی ہوتی۔

◉ پیدائش سے 18 سال کی عمر تک لڑکی کو اچھے والدین کی ضرورت ہوتی ہے۔ 18 سال سے 35 سال تک خوب صورتی کی ضرورت ہے۔ 35 سے 55 سال تک وقار کی ضرورت ہوتی ہے۔

◉ دنیا کی کوئی عورت بدصورت نہیں ہوتی۔ اپنی اپنی جگہ ہر عورت حسن کی دیوی ہوتی ہے۔

مرسلہ: رضوانہ کوثر۔ لاہور

انمول موتی

☉ اپنی دل کی حالت کو کبھی مت بکھرنے دو کیونکہ لوگ ٹوٹے ہوئے مکان کی اینٹیں بھی اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

☉ کسی کو نصیحت کرنے والے عظیم اور نصیحت پر عمل کرنے والے عظیم تر ہوتے ہیں۔

☉ آپ کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات آپ کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے۔

☉ علم وہ روشنی کا مینار ہے جس کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑتی۔

☉ وقت وہ دریا ہے جو زندگی کی بہت سی خوب صورت چیزیں بہا کر لے جاتا ہے۔

مرسلہ: شرجیل اقدس۔ جیکب آباد

اقوال زریں

☺ لوگ نہ جانے نفرت کے لیے کہاں سے وقت نکال لیتے ہیں جب کہ یہ زندگی محبت کے لیے بھی کم ہے۔

☺ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے دل میں اتر کر اس کے دکھ کا اندازہ کر سکے۔

☺ خوش اخلاقی پر کچھ خرچ نہیں آتا بلکہ وہ آپ کا وقار بڑھاتی ہے۔

☺ جب آپ ہنسو گے تو سب آپ کا ساتھ دیں گے مگر جب آپ روئیں گے تو اکیلے ہی ہوں گے۔

☺ اچھے دوست کا ساتھ کبھی مت چھوڑو خواہ وہ تمہیں چھوڑ دے!

مرسلہ: بابر محبوب۔ کراچی

عظمت نامہ

* جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔
* جو جنت کا طالب ہے، اسے چاہیے کہ وہ ماں کی خدمت کرے۔
* اس کائنات میں ماں ہی وہ واحد ہستی ہے جس کی دعا اپنے بچوں کے حق میں جلد قبول ہوتی ہے۔
* دنیا میں ماں سے زیادہ ہمدرد ہستی کوئی اور نہیں ہے۔
* ماں کے بغیر گھر قبرستان کی طرح لگتا ہے۔
* ماں کی محبت کبھی دکھاوے کے لیے نہیں ہوتی۔
* جس کے دل میں ماں کے لیے محبت ہی محبت ہے، وہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر شکست نہیں کھا سکتا۔
* ماں کو کبھی نہ ستاؤ۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔
* جس کی ماں مر جائے، وہ کائنات کا مفلس ترین شخص ہے۔
* کتنا بدقسمت ہے وہ جو ماں کے ہوتے ہوئے اس کی محبت حاصل نہیں کر سکا۔
* جو ماں کی خدمت محبت کے ساتھ کرتا ہے، اسے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ اس کے سر پر ہر وقت ماں کی دعاؤں کا سایہ موجود رہتا ہے۔

مرسلہ: آیت سلیم۔ حیدرآباد

گُر کی باتیں

☆ صفائی ستھرائی کے بے حد شوق کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ غسل خانے میں باقاعدہ آباد ہو جائیں۔

☆ دسترخوان پر اتنا کھائیے کہ آپ اٹھ سکیں اگر اٹھیں گے نہیں تو دوبارہ بیٹھیں گے کیسے؟

☆ ایک نسل جن چیزوں کو غیر ضروری جان کر گلی میں رکھ آتی ہے۔ اگلی نسل ان چیزوں کو اٹھا کر پھر سے گھر میں سجا لیتی ہے۔ آثار قدیمہ کے طور پر۔

☆ ٹیکسوں کا نظام اس لیے بنایا گیا ہے کہ آپ کی جیب میں اس وقت تک تھوڑا سا سونا نہ آئے جب تک آپ کے بالوں میں چاندی نہ آ جائے۔

☆ نااہل کی تربیت کرنا گیند پر اخروٹ رکھنے کے مترادف ہے۔

مرسلہ: فراز۔ اسلام آباد

بزم آرائی

غزل

مجھ میں خوشبو بسی اسی کی ہے
جیسے یہ زندگی اسی کی ہے
وہ کہیں آس پاس ہے موجود
ہو بہو یہ ہنسی اسی کی ہے
خود میں اپنا دکھا رہا ہوں دل
اس میں لیکن خوشی اسی کی ہے
یعنی کوئی نہیں کمی مجھ میں
یعنی مجھ میں کمی اسی کی ہے
خود بخود رک گئے قدم میرے
ہو نہ ہو، یہ گلی اسی کی ہے

(رمزی آثم)

حسنِ انتخاب: شیما قوم۔ کراچی

☆

یہ حدیں نہ توڑ دینا، میرے دائرے میں رہنا
مجھے اپنے دل میں رکھنا، میرے حافظے میں رہنا
میرا بوجھ خود اٹھانا، مرا کرب آپ سہنا
مرے زخم بانٹ لینا، مرے رتجگے میں رہنا
میرے منظروں میں بسنا، میری گفتگو میں ہونا
میرے لمس کو سجانا، میرے ذائقے میں رہنا
میرا حکم خود سنانا، میری مہر خود لگانا
میرے مشورے میں سونا، میرے فیصلے میں رہنا
کبھی منزلوں کی صورت میری دسترس سے باہر
کبھی سنگِ میل بن کر میرے راستے میں رہنا
میرے ہاتھ کی لکیریں تیرا نام بن کے چمکیں
میری خواہشوں کی خوشبو میرے زائچے میں رہنا

(معین نظامی)

حسنِ انتخاب: قرۃ العین زینب۔ ملتان

☆

چہرے پہ میرے زلف کو پھیلاؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو، برس جاؤ کسی دن
رازوں کی طرح اترو میرے دل میں کسی شب
دستک پہ میرے ہاتھ کی کھل جاؤ کسی دن
پیڑوں کی طرح حسن کی بارش میں نہالوں
بادل کی طرح جھوم کے گھر آؤ کسی دن
خوشبو کی طرح گزرو میرے دل کی گلی سے
پھولوں کی طرح مجھ پہ بکھر جاؤ کسی دن
میں اپنی ہر اک سانس اسی رات کو دے دوں
سر رکھ کے میرے سینے پہ سو جاؤ کسی دن

(امجد اسلام امجد)

حسنِ انتخاب: سجاد علی۔ پشاور

☆

محبتوں میں ضروری ہے کچھ گلے رکھنا
مگر یہ شرط بھی ٹھہری دل ملے رکھنا
وہ کج ادائی سے اتنا سکھا گیا مجھ کو
کہ اب نہ دل کے کسی سے بھی سلسلے رکھنا
کیا اس کا ذکر کریں کوئی اور بات کریں
اب اس کی ذات سے منسوب کیا گلے رکھنا
کبھی ملو تو مہک جائیں بام و در سارے
ہماری یاد کے کچھ پھول ادھ کھلے رکھنا
وہ جس قدر بھی گریزاں ہے پر یہ کہتا ہے
بچھڑنا ہم سے مگر پھر بھی سلسلے رکھنا
تمہارا زخم تو ناسور بن گیا ہے غزل
تمہیں یہ کس نے کہا تھا کہ لب سلے رکھنا

(ذکیہ غزل)

حسنِ انتخاب: زرینہ جونیجو۔ بورڑی

☆

ذکرِ شبِ فراق سے وحشت اسے بھی تھی
میری طرح کسی سے محبت اسے بھی تھی
مجھ کو بھی شوق تھا نئے چہروں کی دید کا
رستہ بدل کے چلنے کی عادت اسے بھی تھی
اس رات دیر تک وہ رہا محوِ گفتگو
مصروف میں بھی کم تھا، فراغت اسے بھی تھی
مجھ سے بچھڑ کے شہر میں گھل مل گیا وہ شخص
حالانکہ شہر بھر سے عداوت اسے بھی تھی
سنتا تھا وہ بھی سب سے پرانی کہانیاں
شاید رفاقتوں کی ضرورت اسے بھی تھی
تنہا ہوا سفر میں تو مجھ پر کھلا یہ بھید
سائے سے پیار دھوپ سے نفرت اسے بھی تھی
محسن میں اس سے کہہ نہ سکا یوں بھی حالِ دل
درپیش ایک تازہ مصیبت اسے بھی تھی

(محسن نقوی)

حسنِ انتخاب: اشعر جواد۔ کراچی

☆

پیاس وہ دل کی بجھانے کبھی آیا بھی نہیں
کیسا بادل ہے کہ جس کا کوئی سایہ بھی نہیں
بے رخی اس سے بڑی اور بھلا کیا ہو گی!
ایک مدت سے ہمیں اس نے ستایا بھی نہیں
روز آتا ہے در دل پہ وہ دستک دینے
آج تک ہم نے جسے پاس بلایا بھی نہیں
شرم آتی ہے ہمیں اس کی شکایت کرتے
کہ وہ اپنا جو نہیں ہے تو پرایا بھی نہیں
سن لیا کیسے خدا جانے زمانے بھر نے
وہ فسانہ جو کبھی ہم نے سنایا بھی نہیں
تم تو شاعر ہو قتیل اور وہ اِک عام سا شخص
اس نے چاہا بھی تمہیں اور جتایا بھی نہیں

(قتیل شفائی)

حسنِ انتخاب: محمد عزیر۔ ملتان

تہوار

نہ میں نے چاند دیکھا
اور نہ کوئی تہنیت کا پھول کھڑکی سے اٹھایا
میرا ملبوس اب بھی ملگجا ہے
حنا سے ہاتھ خالی
اور چوڑی سے کلائی
نہ میرے پاس تھے تم
اور نہ میرے شہر سے گزرے
میں کیا افشاں لگاتی
مانگ میں سیندور بھرتی
رنگ اور خوشبو پہنتی
چاند کی جانب نظر کرتی
کہ میری لذتِ دیدار تو تم ہو
میرا تہوار تو تم ہو!

(پروین شاکر)

حسنِ انتخاب: سویرا جا[illegible]۔ کو[illegible]

اے حاکمِ وقت!

عبدالرزاق گویا بھاگناڑی

اے حاکمِ ملت و مملکت! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اعلیٰ عہدے پر فائز کیا ہے۔ اسی نے آپ کو اس ملک کے تقریباً سترہ کروڑ نفوس کا حاکم مقرر کر دیا تا کہ ان سب پر آپ کا حکم چلے اور یہ سارے آپ کے محکوم بن جائیں...... اسلامی مملکت کے امیر المومنین! (صدر) ہونے کے ناطے آپ کا یہ فرض بنتا تھا کہ خلافتِ عمرؓ کے سنہرے دور کے سنہرے طور طریقے اپناتے ہوئے ملک میں اسلامی قوانین و ضوابط لاگو کرتے۔ آپ خود عوام کی چوکھٹ پر جا کر ان کے مسائل سنتے...... کہ...... انہیں پوری طرح سے دو وقت کی روٹی نصیب ہے؟ کیا ان کے روزگار کے کوئی مستقل ذرائع ہیں؟ آپ کے بچے تو شاہی محلات میں قسم قسم کے نرم و ملائم اور آرام دہ پلنگوں پر خرگوش کی سی نیند سوتے ہیں۔ کبھی افلاس و بھوک اور غربت کے مارے غریبوں سے پوچھا کہ ان کے بچے موسم گرما میں گرمی کے لمبے دن اور موسم سرما کی سرد راتیں کن کن اذیتوں میں کاٹتے ہیں؟ کبھی تو ان کی روداد سن کر ان کی دادرسی کرتے......!! اک دور تھا کہ امیر المومنینؓ وقت کے حاکم تھے جو دن کو خلافت کے کام نہایت ہی ایمانداری سے سرانجام دیتے اور رات کو مدینہ کی گلیوں میں گشت کر کے لوگوں کا حال معلوم کرتے تا کہ کوئی بھوکا یا ضرورت مند نہ رہ جائے۔ اس حاکمِ وقت (حضرت عمر فاروقؓ) کو ہمیشہ یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ اس کے دورِ حکومت میں خدانخواستہ اگر کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو کل قیامت کے روز انہیں اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اے حاکمِ وقت! میری اس نگارش پر اگر نگاہ پڑے تو اسے نگاہ کج سے دیکھنے کی بجائے نگاہ کرم سے دیکھتے ہوئے مصیبت و افلاس کی ماری بے چاری عوام کی دادرسی کریں تا کہ عوام آپ کو نگاہِ ناز سے دیکھتے ہوئے آپ پر عزت و فخر محسوس کرے۔

جب گناہ، گناہ نہیں رہتا تو؟

شبانہ ناز۔ کراچی

اس دوڑتی بھاگتی جدید دور کی نسل نو...... جدید ٹیکنالوجی کی جدت سے اتنی متاثر ہو گئی ہے کہ انہوں نے گزشتہ نسل ان ہی کے پرانی یا دقیانوسی، ہر چیز کو حقیر گردانتے ہوئے اپنی زندگی سے باہر نکال کیا ہے...... وہ رسم و رواج اور اقدار جو کسی قوم کی بقاء کی پہرہ دار ہوتی ہیں' وہ قوانین و اصلاحات جو دینِ اسلام نے ہمیں بخشے جیسے اس نئی نسل نے مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر عجائب خانوں میں رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے یا یوں کہیے کہ جدید ٹیکنالوجی کے ایجاد کردہ کھلونوں نے ان کا دل موہ لیا ہے...... ہمارے یہاں ٹیکنالوجی کی صنعت میں تو کوئی جدت پیدا نہ ہو سکی، ہاں البتہ دوسری چیزوں میں اچھی خاصی ترقی ہوتی دکھائی دی گئی ہے۔

جی ہاں...... موبائل کی نت نئی سروسز سے نئی نسل کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ ان کی چندھیائی آنکھوں سے شرم و حیا کا پانی ڈھلتا ہی جا رہا ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ لڑکی لڑکے کے جوان ہوتے ہی ماں باپ کو ان کے اچھے بر تلاش کرنے کی فکر لاحق ہو جاتی تھی لیکن اب ہمارے یہاں کے بچے بڑے سعادت مند ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے ماں باپ کے سروں سے اس فکر کا بوجھ اتار کر اپنے سروں پر لاد لیا ہے۔ بس ان کے پاس ایک موبائل اور ہر کمپنی کا کنکشن...... لڑکے اچھی بیوی کی تلاش میں اور لڑکیاں اچھے شوہر کی تلاش میں ماہانہ ہزاروں کا بیلنس لوڈ کر ڈالتے ہیں۔ پہلے اس سلسلے میں والدین کی جوتیاں گھس جایا کرتی تھیں' آج تو جوانوں کی انگلیاں روںگ

نمبرز اور اوٹ پٹانگ ایس ایم ایس لکھتے ہوئے گھسنے لگی ہیں، ویسے قصور ان کا بھی نہیں، موبائل کمپنیوں کے پیکیجز ہی اتنے پُرکشش ہوتے ہیں کہ ایک پر گزارا نہیں ہوتا۔ صرف سوڈیڑھ سو کی سم دے کر کمپنیاں اپنے صارفین سے ہزاروں روپے کا بیلنس ماہانہ وصول کرتی رہتی ہیں۔ انہیں کیا غرض کہ ان کے پیکیجز کا فائدہ کس طرح اٹھایا جارہا ہے؟ رات گھنٹوں فری کال پر نوجوان لڑکی اور لڑکا گویا ایک ایسی آہنی جالی دار کھڑکی میں کھڑے ہو کر تفصیلی گفتگو کررہے ہوتے ہیں جہاں سے زبان تو ایک دوسرے تک پہنچائی جاسکتی ہے، ہاتھ نہیں، ساری ساری رات کی ایسی ویسی ہر قسم کی گفتگو کے بعد بھی نہ پردوں میں مستور دوشیزاؤں پر حرفِ بے شرم آتا ہے نہ مومن مرد اس جرم میں گرفتار کیا جاسکتا ہے مگر یہ دونوں مرد اور عورت بھول رہے ہوتے ہیں کہ ایک ہستی ہے جو انہیں مسلسل دیکھ رہی ہے۔ اتھاہ تاریکی میں بھی روشن نظر رکھنے والی وہ ہستی جس کے نام کا کلمہ پڑھنے والی زبان اس کے مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی کررہی ہوتی ہے اور وہ عالی ظرف ہستی اپنے مومن بندے کی توبہ کا انتظار کیے مزید مہلت ہی دیتا چلا جاتا ہے مگر یہ بھی یاد رہے کہ جب قوموں میں بے راہ روی حد سے تجاوز کرجاتی ہے اور گناہ، گناہ نہیں رہتا تو عذاب الٰہی ٹوٹ پڑتا ہے۔

یادیں

ممتاز احمد سندھو۔ سرگودھا

انسان کبھی بھی اپنی یادوں کو فراموش نہیں کرسکتا اگرچہ وقت اور ظالم حالات ہم سے سب کچھ چھین لیتے ہیں مگر یاد ایک ایسا قیمتی اور عظیم سرمایہ ہے جسے ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یاد ایک ایسا آئینہ ہے۔ جس میں ہم جب چاہیں اپنے ماضی کو دیکھ سکتے ہیں۔ ماضی میں کسی سے کی گئی سچی اور پاکیزہ محبت کبھی نہیں بھولتی اگر اسے بھولنا بھی چاہیں تو بھلا نہیں سکتے۔ کسی کی حسین یاد کو بھولنا درحقیقت اپنی ہستی کو مٹانے کے مترادف ہے۔ محبت سے وابستہ حسین یادیں سرمایہ حیات ہیں۔ تلخ اور حسین یادیں ہمارے مستقبل کا لائحہ عمل بھی ہوتی ہیں۔

محبت اور عشق

تنویر خالد

محبت ایک ایسا لفظ ہے جس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کچھ لوگ محبت کرتو بیٹھتے ہیں مگر شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ جب یہ اس زمانے کے لوگوں کو نہیں ملی جب انسان سیدھا سادہ ہوتا تھا تو پھر اب اس ماڈرن زمانے کے لوگوں کو کیسے ملے گی۔ محبت ایک چھوٹا سا لفظ مگر جس کو لگ جائے پھر اس کا کیا حشر کرتا ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے پہلے زمانے اور آج کے زمانے کی محبت میں۔ اس دور میں قیس، لیلیٰ کی بے وفائی سے مجنوں نہیں بنا تھا بلکہ لوگوں کے ستم سے مجنوں بنا تھا مگر آج کے دور کی محبت میں اکثر لیلیٰ کی بے وفائی ایک سیدھے سادھے آدمی کو مجنوں بنا دیتی ہے۔ عشق محبت بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہاں پر مجھے ایک غزل کا مصرعہ یاد آیا۔
''عشق ہوراں جیندے دل پائیاں جھاتیاں، عشق ہوراں جیندے سول پائیاں جھاتیاں رب پیراتے اوہ رویا ہجتا'' جب محبت کی آندھی چلتی ہے تو کچھ نظر نہیں آتا مگر جب یہ آندھی رک جاتی ہے، تب انسان کو پتا چلتا ہے کہ وہ تو اپنا سب کچھ تباہ کرچکا ہے۔ آندھی سب کچھ اپنے ساتھ اُڑا کرلے گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عشق اندھا ہوتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ ہم جان بوجھ کر اسے اندھا کردیتے ہیں۔ جب ہم کو پتا ہے اس کے انجام کا پھر کیوں آنکھیں بند کرکے کود پڑتے ہیں یعنی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو پہلے عشق کرگئے ہیں وہ سب پاگل تھے وہ پاگل تھے اسی لیے اپنی محبت حاصل نہیں کرسکے اور ہم بہت لائق ہیں، ہم ضرور حاصل کرلیں گے مگر جب وقت کے تھپڑ منہ پر پڑتے ہیں تو دوسرے کو بے وفا کہہ دیتے ہیں۔

بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ وہ کہتے ہیں ناں......!

وہ بے وفا نہ تھا، بس یوں ہی بدنام ہوگا
ہزاروں چاہنے والے تھے، کس کس سے وفا کرتا

مائی ڈیئر! خود کو سنبھال لو اور جہاں امی ابو کہیں وہاں پر سرِ تسلیم خم کرلو۔ اسی میں آپ کی بھلائی ہے اور خوشی بھی اور اگر بغاوت کرو گے تو کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اکیلے پڑ جاؤ گے زمانے میں مگر آپ کا بھی کیا قصور عشق محبت چیز ہی ایسی ہے۔ جب ہم خود کو نہیں روک پائے تو دوسروں کا کیا بھروسہ مگر پھر بھی...... شاید کوئی سمجھ جائے...... اللہ سب کو آباد و شاد رکھے۔ آمین!

شک

سدرہ انور علی۔ جھنگ صدر

کہا گیا ہے کہ شک انسان کی زندگی برباد کردیتا ہے۔ جس طرح حسد انسان کو کھا جاتا ہے جیسے دیمک لکڑی کو کھا جاتی ہے، شک سے بچنے میں ہی بقا اور عافیت ہے۔ شک اگر انسان کی زندگی میں آجائے تو ازدواجی زندگی کو ملیامیٹ کردیتا ہے۔ ہنستا بستا خوش و خرم خاندان ٹوٹ کر بکھرنے لگتا ہے۔ شک کی ہمارے مذہب میں بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ شک کرنے والا انسان دوزخی ہے، شک کرنے والا نا صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، وہ اپنے ساتھ دوسروں کی زندگیاں بھی برباد کردیتا ہے۔ شک کی عادت اگر پختہ ہوجائے تو پھر اعتبار کبھی بحال نہیں ہوتا، اسی طرح کئی زندگیاں داؤ پہ لگ جاتی ہیں۔ شک کا لگا ہوا زخم کبھی بھرتا نہیں ہے بلکہ وہ اور گہرا ہوجاتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز میں اگر شک کی دھند پھیلی ہو تو منظر واضح دکھائی نہیں دیتے۔ جس کی زندگی میں شک کا زہر گھل جائے وہ زندگی برباد ہوجاتی ہے۔

کیا عورت انسان نہیں؟

ارباب قربان علی اریری، بلوچستان

معاشرے، حالات اور وقت نے عورت کے ساتھ سنگین مذاق کیے ہیں، عورت جو ہر رشتے میں محترم ہے۔ آج کے اس تنگ نظر معاشرے نے عورت کے ہر رشتے کو ایک مذاق بنادیا ہے۔ آج اگر عورت گھر کی چار دیواری میں ماں کی حیثیت سے رہتی ہے تو اس کی تمام زندگی بچوں کی دیکھ بھال، گھر کی صفائی ستھرائی میں گزر جاتی ہے۔ دیہی معاشرے میں اسے نوکرانی تصور کیا جاتا ہے۔ آج اگر عورت بہن بیٹی کے روپ میں ہو تو اسے تعلیم سے دور رکھ کر جہالت کے اندھیروں میں صرف اس لیے دھکیل دیا جاتا ہے کہ ہماری بہن یا بیٹی پر کیوں کسی کی نظر پڑے لیکن...... افسوس چند پیسوں کے عوض اپنی غیرت، اپنی فکر، اپنی بہن و بیٹی کے عظیم رشتے کو بھول کر پچاس سال کے شخص سے اس کی شادی کردی جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ بہو اور بیوی کی حیثیت سے وہ ایک غلام اور لاوارث خادم کی حیثیت سے لائی جاتی ہے جسے بات بات پر طعنے ملتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ مرد کے پیچھے آئی ہے آج کے دور میں اگر عورت اپنے بل بوتے، محنت، ہمت و حوصلے سے تعلیم حاصل کرکے نوکری کرے تو اسے معاشرے کی تنگ نظری بے ہودہ القابات سے نوازتی ہے اور اسے یہ جدید معاشرہ قبول نہیں کرتا۔ آج کے اس جدید دور میں بھی ہمارا سامنا زمانہ جہالت کے رسم و رواج و اصولوں سے ہے۔ آخر کیوں ہماری ہر پابندی کا مرکز عورت ہی ہے؟ آخر کیوں ہمارے ہر ظلم و ستم کا شکار عورت ہی ہے؟ آخر کیوں آج پوری دنیا میں بے بس و لاچار دکھائی دینے والی مخلوق عورت ہی ہے؟ آخر کیوں انا پرستی، پتھر دل ہونے کی وجہ سے آج عورت کا ہر روپ ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے؟ آخر کیوں آج ہم عورتوں کے حقوق سے نظریں چرا رہے ہیں؟ آئیے آج اپنے آپ سے ایک مخلصانہ و حقیقت پسندانہ سوال کریں کہ کیا عورت کو اس جہاں میں جینے کا حق نہیں؟؟ کیا عورت انسان نہیں؟؟ ☆☆

روشن امکانات کا شاعر

احمد وقاص

عکاشہ سحر

دوصد دانا دریں محفلِ سخن گفت
سخنِ نازک تراز برگ سمن گفت
ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ فارے دیدواحوالِ چمن گفت
(اقبالؒ)

ترجمہ۔ ”سیکڑوں دانشوروں اور مفکروں نے محفلِ سخن میں کہا کہ شاعری چنبیلی کے پھول سے بھی نازک تر ہے لیکن مجھے بتاؤ کہ وہ کون سا دیدہ ور اور صاحبِ نظر ہے کہ جس نے کانٹوں کو دیکھ کر چمن کے احوال بیان کیے ہوں؟“

فطرت کے بے معنی طومار میں شاعر کی نظر نظم و معنی پیدا کرتی ہے۔ فطرت کے تضاد اور غیر ضروری تفصیلات کو شاعر الگ کر کے اُن میں ربط قائم کر دیتا ہے۔ وہ اپنے تخیل کے ذریعے فطرت سے تعلق پیدا کرتا ہے اور اپنے لفظوں کے ذریعے اُس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ وہ فطرت کی سرگوشیوں کو سنتا ہے۔ وہ اپنے جذب دروں سے حقیقتِ مدرکہ میں گہرائی پیدا کر دیتا ہے۔ فطرت کے جلوؤں کی بوقلمونی اسی کے دیدۂ بیدار کی رہینِ منت ہے۔

”ستارے منتظر ہیں“ کوئٹہ، بلوچستان کے نوجوان شاعر احمد وقاص کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جسے الحمد پبلی کیشنز، لاہور نے بہت ہی دلآ ویز گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

غزل میں موضوعات کے حوالے سے نئے امکانات تخلیقی صلاحیتوں کو برتنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں اور یہ بات خوش آیند ہے کہ احمد وقاص کے ہاں غزل میں نو بہ نو موضوعات کو برتنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کا لہجہ غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ ہلکی ہلکی کسک جو غزل کی آبیاری کرتی ہے۔ اس کی غزل اپنا قاری خود تلاش کر لیتی ہے۔ اِن اشعار میں دیکھیے، سوچ و فکر کے کتنے زاویے جلوہ گر ہو رہے ہیں۔

کوئی ستارہ پسِ آسماں بھی روشن ہے
مرا یقین بھی روشن، گماں بھی روشن ہے

میرا کمال دیکھ کہ میں شہرِ سنگ میں
ہر دم زبانِ دیدۂ تر بولتا رہا

پھر سفر کا کوئی پیغام نکل آتا ہے
اک ستارہ کہ سرِ شام نکل آتا ہے

عشق خود کرتا ہے اپنے لیے امکان گری
ہم نہیں وہ کہ جو محمل سے بندھے رہتے ہیں

احمد وقاص کے اشعار خواب آفریں ہی نہیں بلکہ کائنات گیری کا احساس دلاتے ہیں۔ اُس کے یہاں تیز نگاہی کے ساتھ ساتھ فنکارانہ تکمیل کا جذبہ بھی ہے۔ وہ اپنے احساسات و جذبات کو شعری سطح تک بلند کر کے ہمیں گہری معنویت کا احساس دلاتا ہے۔ مجموعی طور پر ”ستارے منتظر ہیں“ میں شامل غزلیات سلاست، شگفتگی کے ساتھ ساتھ اپنے اندر گہرائی اور گیرائی بھی رکھتی ہیں۔ جذبات و صداقت کی آنچ سے لبریز یہ غزلیات مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اپنی بات کو پر اثر انداز میں کہنے کا سلیقہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، یوں ”ستارے منتظر ہیں“ میں مختلف dimensions کی شاعری کا ایک خوبصورت اور حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔

یقین ہو گیا مجھ کو، گماں ہی اچھا تھا
زوال اوجِ تمنا، زیاں ہی اچھا تھا

یہ بھی حقیقت ہے کہ اشعار کی پرورش شاعر کے نرم جذبوں سے ہوتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ وہی جذبے حساسیت اور ارتعاش کے ذریعے جھنکار بن کر دل و دماغ کو قرینہ عطا کرتے ہیں۔

ستارے منتظر ہیں
ہمارے منتظر ہیں
ہے طوفانوں کا موسم
کنارے منتظر ہیں

احمد وقاص کی غزل میں عصری شعور اور فکری وجدان ہے۔ زبان بیان کی سادگی گہرے مشاہدات اور ذاتی تجربات کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ احمد وقاص کسی بے پناہ موج کے زیرِ اثر کسی روشن ستارے کی چمکتی روشنی سے منور ہو کر وقت کی دہلیز پر خوابوں کی کرچیاں تلاش کر رہا ہے۔

ہار کر اپنے ہی پندار سے لوٹ آئے ہیں
مرے آنسو ترے دربار سے لوٹ آئے ہیں

تجھ کو احساسِ ندامت سے بچانے کے لیے
ہم بڑے چاؤ، بڑے پیار سے لوٹ آئے ہیں

احمد وقاص کے ہاں ہمیں جو داخلیت دکھائی دیتی ہے، وہ داخلیت ہونے کے باوجود داخلیت نہیں بلکہ وہ خارجیت میں تبدیل ہو کر آفاق گیر بن جاتی ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ احمد وقاص کا انفرادی دکھ یا کرب انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

احمد وقاص کی شاعری میں انسان اور فطرت کا عکس اور شدید جذبات کا از خود چھلکنا اس بات کی بھی تائید ہے کہ جو اشعار تعقل اور تخیل کی مدد سے حقیقت اور صداقت کی تصویر بنیں، وہی توانا کہلاتے ہیں۔

مری آنکھوں کے قیدی تھے ترے خواب
انہیں آزاد کرنا پڑ گیا ہے
گوارا کب تھا دل مسمار کرنا
تمہارے بعد کرنا پڑ گیا ہے

احمد وقاص کی شاعری اظہار و ابلاغ کے نئے سانچوں میں ڈھلی ہونے کے باوجود ژولیدگی و پیچیدگی سے مبرا ہے۔

گھر سے نکلنا اک تارے کی راہبری میں
اور اک آنسو بھی اپنے سامان میں رکھنا

اس کی غزل کے آئینہ خانے میں جہاں عصرِ حاضر میں سانس لیتے شگفتہ چہرے ہمیں واشگاف نظر آتے ہیں، وہیں دل گداختگی، غمگی، شیرینی اور سوز و ساز سے مرصع ہونے کے سبب اس کی غزل دل میں جگہ بنا لیتی ہے۔

میں کیا کروں کہ اُسے دیکھتے ہی حیرت سے
مرا وجود سراپا سوال ہو جائے

•......•......•......•

کہیں آنسو تو کہیں زخم پرانے رکھے
تو نے اس دامنِ ہستی میں خزانے رکھے
جانے کس پل کے تعاقب میں رہا میرا شعور
چھوڑ آیا میں تصرف میں زمانے رکھے
میں نے طوفانِ زمانہ کے مقابل اے دوست......!
تیری یادوں کے بجھے دیپ جلانے رکھے

احمد وقاص کی غزل میں نغمگی اور جمالیاتی کیفیت دلکش انداز میں نظر آتی ہے اور قاری کو اپنی جانب متوجہ کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی تخلیق سازی کے عمل میں تلقین اشتعال اور تنظیم اعتدال کا جو انتظام رکھا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے مسائل کی گھمبھیر میں فکر سے کام لیا ہے۔ زندگی کے نازک ولطیف مسائل کو جس پیرائے میں اس نے ادا کیا ہے وہ بالغ نظری ہے جسے ہم بصیرت افروزی کہتے ہیں۔

دیارِ سنگ میں آنسو ہنر نہیں تو نہیں
کوئی کمال یہ خونِ جگر نہیں تو نہیں
نہیں لکھی مری تقدیر میں سحر تو نہ ہو
مری طرف نگراں وہ نظر نہیں تو نہیں

احمد وقاص کی غزل داخل وخارج کے تال میل سے نئے رنگ وآہنگ استوار کرتی نگاہوں کو اسیر اور سماعتوں کو مسحور کرنے پر قدرت حاصل کرتی جا رہی ہے۔

خواب بھی وہ نہیں، تعبیر بھی ویسی نہیں ہے
اب خیالوں کی وہ تصویر بھی ویسی نہیں ہے
اب تو بس شوقِ اسیری میں گرفتار ہیں ہم
ورنہ اس زلف کی زنجیر بھی ویسی نہیں ہے

غزل کے علاوہ احمد وقاص نے ثلاثی اور ہائیکو میں بھی اپنے ہنر وکمال کے خوب جوہر دکھائے ہیں

کہ جن پہ قفل پڑے تھے، وہ باب کھول دیئے
پرانے زخم نئے ڈھنگ سے ہوئے تازہ
کسی کی یاد نے سارے حساب کھول دیئے

جگنو رکھے ہیں
ہجر اندھیرے میں ہم نے
آنسو رکھے ہیں

عباس تابش کی رائے میں احمد وقاص جدید غزل گو شاعروں کی صف ایک نیا اضافہ ہے۔

سعید گوہر، کوئٹہ کی رائے میں۔

بنام خداوند حرف وقلم
وہ رحمت ہی رحمت، کرم ہی کرم

زندہ ناموں میں شمولیت پر دلی مبارک باد۔

ڈاکٹر عصمت درانی کی رائے میں...... احمد وقاص نے اپنی شاعری میں احساس اور فکر دونوں کو آمیز کیا ہے۔ وہ نہ مکمل طور پر احساس کا شاعر ہے نہ فکر کا، اس کے علاوہ وہ غیر ضروری تراکیب سے اپنی شاعری کو بوجھل نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ اس کا شعر پڑھنے اور سننے والے کے دل پر براہِ راست اثر کرتا ہے۔

مضطرب صرف جنوں ہی تو نہیں
اب خرد بھی کوئی صحرا مانگے

مجھے قرار کہاں تھا قرار منزل میں
مرا نصیب تھی ہجرت سفر سے پہلے بھی

ہم اپنا سب کچھ لٹا کے بھی بس یہی کہیں گے
دیارِ عشق وجنوں میں کیسا زیاں کا موسم

کی ہے کس یاد نے ہجرت، نہیں معلوم
کہ دل ایسا ویران ہوا ہے کہ کھنڈر لگتا ہے

اچھے موسموں کی سرسبز اور خوبصورت دعائیں خلوصِ دل سے احمد وقاص کے روشن مستقبل کے لیے۔

☆☆☆

پسند اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار، ادبی ذوق کے آئینہ دار

پروین شاکر......غزالہ شاہین، حیدر آباد
شام آئی، تری یادوں کے ستارے نکلے
رنگ ہی غم کے نہیں، نقش بھی پیارے نکلے
ایک موہوم تمنا کے سہارے نکلے
چاند کے ساتھ ترے ہجر کے مارے نکلے

بشیر بدر......روبینہ شاہین
آنکھوں میں رہا، دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے میرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

محسن نقوی......عبدالحکیم ساجد، منچن آباد
اس شب کے مقدر میں سحر ہی نہیں محسن
دیکھا ہے کئی بار چراغوں کو بجھا کر

شاہدہ حسن......عروسہ، جہلم
ہدایت رہی گمرہی سے الگ
اندھیرے ہوئے روشنی سے الگ
کیے اور بھی کام میرے لیے
فلک نے ستارہ گری سے الگ

ضمیر طالب......زاہد خان، لاہور
کچھ اس لیے بھی جھکتا نہیں ہوں اے دنیا
مری جبین مری ماں نے چوم رکھی ہے

سید مبارک شاہ......نوریہ فخر، سبی
زخمی ہوا پڑا ہے یہ خواہش کے وار سے
لیکن مرے ضمیر نے مانی نہیں شکست

فیصل عجمی......حضرت گل، پشاور
میں اس کو ڈھونڈ رہا ہوں، بلا رہی ہے مجھے
صدا زمیں کی سمندر سے آ رہی ہے مجھے

میر تقی میر......شبانہ زمان، سکھر
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

نعیم رضا بھٹی......وقاص علی، لاہور
غرورِ ماہ رخوں کے مزاج میں ہوگا
رضا یہ لطف وکرم ہر حسین پر ہوا ہے

ہما شاہ......محمد جواد، اسلام آباد
خاک کو خاک میں ملانے کا
موت کتنا عجب بہانہ ہے

عزم بہزاد......نسرین خان، لالہ موسیٰ
نقشِ پا بن نہ سکے حدِ سفر سے آگے
کوئی منزل نہ ملی اپنی خبر سے آگے
کوئی صورت نہ رہی اپنے یقیں سے ہٹ کر
کوئی منظر نہ رہا اپنی نظر سے آگے

ظفر اقبال......صاحب علی، چوکی
یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

سلیم احمد......نعمان شاہ، سوات
یہ سوچا ہے کہ پتھر بن کے جی لوں
سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

ناصر علی......زرینہ بختیار، کوئٹہ
جانے کیوں کر مجھ سے کچھ کچھ کام رہ جاتا ہے
آنسو پونچھ بھی لوں تو پھر بھی نام رہ جاتا ہے

ریاض مجید......شعبان کھوسہ، کوئٹہ
وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ آپ مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے

صابر ظفر......نائلہ غضنفر، کراچی
عجیب لوگ ہیں، زندہ نہ جانے کیسے ہیں؟
وہ جن کے پاس کمال ہنر نہیں کوئی

افتخار عارف......راشدہ اعجاز، کراچی

عذاب یہ کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

پیرزادہ قاسم، محبت انتظار، ملتان

شہر طلب کرے اگر تم سے علاج تیرگی
صاحب اختیار ہو، آگ لگا دیا کرو

انس معین......ام فزا خانم، گھوٹکی

حیرت ہے جو یوں میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا

حجاب عباسی......خینسہ گل، کالا ڈاگہ

چہرے پہ جیسے قوسِ قزح سی بکھر گئی
آنکھوں کے رنگ آج مثالِ شفق ہوئے

مم مغل......حمیرا بابر، کراچی

یہ کون دائرہ در دائرے مرے اطراف
حصار کھینچ کے محور بنا رہا ہے مجھے

ریاض الرحمان ساغر، صفیہ رضوان، اسلام آباد

در دل پہ پہلے دو ہلکی سی دستک
نہ آؤ نہ جاؤ اجازت لیے بن

نعیم ساگر......علی بخش، سکھر

ہمارے شہر کے پہلو میں ایک جنگل ہے
یہ کھیلتے ہوئے بچے اُدھر گئے تو گئے

احمد جاوید......مہرین واصف، حیدر آباد

جس دن سے اپنے چاکِ گریباں کا شور ہے
تالے لگا گئے ہیں رفوگر دکان کو

محمد جمیل......رفیعہ حسین، ٹنڈو آدم

چاندنی رات میں بھی نیرِ تاباں بن کر
یادیں امڈی ہیں ترے نور کا طوفاں بن کر

توصیف تبسم......زید علی، کراچی

ٹھیک ہے اے ضبطِ غم، آنسو کوئی ٹپکا نہیں
پر یہ دل سے آنکھ تک پیہم سفر میں کون ہے؟

ظہور نظر......زین ظہور، کراچی

رات بھر اک چاپ سی پھرتی رہی چاروں طرف
جان لیوا خوف تھا لیکن ہوا کچھ بھی نہیں

احمد خیال......عمر العطاس، کراچی

زندگی خوف سے تشکیل نہیں کرنی مجھے
رات سے ذات کی تکمیل نہیں کرنی مجھے
کسی درویش کے حجرے سے ابھی آیا ہوں
سو ترے حکم کی تعمیل نہیں کرنی مجھے

چراغ حسن حسرت، شاہین خان، کراچی

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

خرم نذیر......انزلہ راشد، حیدر آباد

لگا کر جبر کی مہریں صدا کو روکنا ہوگا
ہنر سارا محبت کا مجھے اب سیکھنا ہوگا
وہ میری روح میں بس کر مرے خوابوں میں رہتا ہے
حقیقت جب وہ سمجھے گا، اسے پھر لوٹنا ہوگا

محمد جمیل......ایم سعید انور سعید، لاہور

ہم سے فریبِ زیست تو سو بار ہو چکا
دامِ خیال میں ترے ہم کیوں نہ آ سکے

خالد احمد......شمع خان، پشاور

اس طرح ٹوٹ کے رویا کوئی
بے کسوں کا نہیں گویا کوئی

منصور حسین فائز......اللہ رکھی، چتوکی

مرے وجود سے سائے لپٹ گئے ایسے
مدار سے مہ خورشید کٹ گئے ایسے
بھروسہ ایسا ہوا اپنی ذات پر مجھ کو
جو سارے رنگ تھے نیلے، وہ چھٹ گئے ایسے

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔
شاعر کے نام کے بغیر شعر شاملِ اشاعت نہیں کیا جائے گا۔ (انچارج) پسند اپنی اپنی



حنیف سحر

گھائل آتما

احسن سلیم کا خیال

بے کار ہے غم، دشت میں اچھا ہوں اکیلا
کیا کم ہے مجھے تو بھی تصور میں یہیں ہے

اسرار کی دنیا سے کشید کیا گیا، دلچسپ اور عجیب سلسلہ، قسط نمبر 20

خلاصہ

نقاب پوش نے نقاب الٹا تو کشتا حیرت سے پتھر ہوگئی۔ وہ پریمودا کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ زندہ ہے اور اس روپ میں اس کے سامنے آئے گی۔ دونوں میں گھنی گفتگو ہوئی۔ اس کے مطابق، کشتا کو پریمودا کی شخصیت میں ایک ناقابلِ بیان بدلاؤ محسوس ہوا۔ پریمودا نے اپنے سارے پتے رجنی کی بنائی ہوئی چالوں کے عین مطابق کھیلے جس کی رو سے وہ کشتا رانی کو ایک ایسے مقام پر لے آئی کہ متر شنک ان کا وفادار نہیں بلکہ وہ کشتا کو استعمال کر رہا ہے، چنانچہ کشتا نے بڑی احتیاط اور اپنی چالباز فطرت کے مطابق ایک نیا جال پھیلانا شروع کر دیا، اس نے متر شنک کے ارادوں کو جن کے مطابق وہ کشتا کے بیٹے جالوت کو تخت پر بٹھا کر کنال کا صفایا کرے گا پھر جالوت کو ٹھکانے لگا کر وہ خود تخت پر بیٹھے گا اور یوں موریہ سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ کشتا کو یہ بات پوری طرح صحیح معلوم ہوئی کیونکہ متر شنک ایک ایسا بہادر سیناپتی تھا جو سینا کو اپنے ساتھ ملا کر نہایت اطمینان سے اور آسانی سے جالوت کو راستے سے ہٹا سکتا تھا، تب کشتا نے پریمودا سے پوچھا کہ متر شنک کو کس طرح مات دی جا سکتی ہے؟ پریمودا نے بڑے رسان سے کہا کہ اگر آپ کے ساتھ کرشن اور کرن مل جائیں تو متر شنک کو باآسانی راستے سے ہٹایا جا سکے گا۔ کرن پہلے ہی کشتا کے خفیہ تہہ خانے میں قید تھا اور کرشن کو راضی کرنے کے لیے کشتا نے پریمودا کی ہی خدمات حاصل کیں، ساتھ ہی اس نے کرن کو اپنی قید میں رکھنے والی بات پریمودا سے چھپالی۔ پریمودا نے کشتا کے پوچھنے پر کنال کی سینا میں ایک کنیا کی موجودگی کی اطلاع بھی دی مگر پریمودا نے اس بات سے قطعی انکار کر دیا کہ وہ لڑکی کرشن کے بہروپ میں ہے۔ پریمودا نے لڑکی کا نام رجنی ہی بتایا مگر وہ کرشن کے نہیں بلکہ شنکر کے بہروپ میں ہے۔ جالوت کا شمیرا سے چل چکا تھا، وہ پاٹلی پتر میں کنال کی تاجپوشی کی تقریبات میں شرکت کرنے آ رہا تھا جبکہ پہلے کشتا دھار مک مہا پروہت پانیتی سے مل کر کنال کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ متر شنک کو مہامنتری کی بنا دینے سے معاملہ اس کے حق میں سیدھا ہو جائے گا لیکن پریمودا سے متر شنک کے ارادوں کی حقیقت بالخصوص یہ جاننے کے بعد کہ مہامنتری بنانے کی پیشکش تو کنال نے بھی متر شنک کو دی تھی تو اس عہدے اور اختیار کے لیے تو متر شنک ان کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ کشتا کو یقین ہو گیا کہ متر شنک دراصل کشتا اور اس کے بیٹے جالوت

کے بعد خود تخت پر قبضہ کرلے گا' یوں اب کشتا نے نئی بساط بچھانی شروع کردی۔ پریمودا نے پاٹلی پتر سے کچھ دور پڑاؤ کرنے والی رجنی کو ساری بات بتادی۔ رجنی نے گہری سوچ بچار کے بعد مسئلہ کا حل ڈھونڈا اور وہ بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے رجنی' کنال تک پہنچی۔ اس نے کنال کو تمام روداد سنائی جسے سن کے کنال سخت کبیدہ خاطر ہوا مگر تقدیر کا یہی فیصلہ تھا اور اب دونوں کو وہ سب کچھ کرنا تھا جو وہ اپنے من سے نہیں چاہتے تھے۔ واپسی میں راستے سے رجنی نے اپنی ایک سکھی انسویا کو ساری کتھا سنا کر اسے رجنی بنایا اور سپاہی کے بھیس میں شنکر کا نام دیا۔ انسویا شروع ہی سے غضب کی بہادر اور جری تھی' وہ رجنی کے کہے پر سب کچھ باآسانی سمجھ گئی۔ پریمودا کو کشتا نے بتایا کہ وہ کنال کو مہاراج بنانے پر تیار ہیں اور اپنے بیٹے جالوت کے ساتھ وہ کنال کا استقبال اسی طرح کریں گی جیسے ہونے والے راجا کا کیا جاتا ہے۔ پریمودا سمجھ نہ سکی کہ کشتا اب کیا نئی چال چلنے والی ہے مگر اس نے اپنی حیرت کو چھپالیا۔ کشتا نے جب اس سے یہ کہا کہ وہ سیناپتی کرشن کو دیکھنا چاہتی ہیں تو پریمودا مزید الجھ گئی۔ پریمودا' رجنی کے پاس پہنچی اور اسے کشتا کا یہ پیغام دیا کہ کشتا اسے راجکمار کنال کے سواگت کو محل میں بلاتی ہیں۔ رجنی نے اس دعوت میں سازش کی بو بھانپ لی اور صرف ارجن اپنے بھائی کو کشتا کے پاس بھیجا' خود کنال کے ساتھ ہی پاٹلی پتر میں پدھارنے کا فیصلہ کیا۔ پریمودا' ارجن کو لے کر کشتا کے پاس پہنچی اور دوسری طرف رجنی' کرشن کے بھیس میں کنال کے شاہی خیمے میں جادھمکی۔ رجنی کو دیکھ کر مترشنگ کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور اسے لگا کہ اس کی کشتا کے ساتھ ملی بھگت کی سازش کرشن یعنی رجنی پر بے نقاب ہوچکی ہے کیونکہ وہ تو رجنی کی پاٹلی پتر میں کنال کے سواگت کی تیاریوں میں حصہ لینے کے لیے چلے جانے کی بعد یہ یقین کرچکا تھا کہ کرن کی طرح رجنی بھی کشتا کی قید میں ہوگی۔ اب جو یوں کشتا کے پاس یعنی پاٹلی پتر سے رجنی کی صحیح سلامت واپسی اس نے دیکھی تو اسے اپنی تباہی اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتی نظر آنے لگی۔ کنال نے مترشنگ کو آرام کرنے کی غرض سے خیمے سے بھیج دیا' ساتھ ہی مترشنگ کے گرد گھیرا تنگ کرنے کو رجنی نے دو تجویزیں دیں جنہیں سن کر مترشنگ کو یقین ہوگیا کہ اس کا راز فاش ہوچکا ہے۔ رجنی نے کہا۔ "کنال مہاراج' محل میں جابراجنے سے پہلے سات دن جنتا سے کوبہ کو محلے محلے جاکے ملیں اور اس جنتا یاترا میں کرن کو بھی ساتھ رکھا جائے۔ کنال نے ان دونوں تجویزوں پر عمل کرنے کا مترشنگ کو آدیش دیا۔ مترشنگ نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد یہ آدیش مان لینا ہی مناسب جانا' اسے یقین ہوگیا کہ رجنی کو دیوی دیوتاؤں کی مدد حاصل ہے۔

رات بڑی مہیب تھی اور بے پناہ گھٹاٹوپ اندھیرے میں ہتھیار بند کچھ سائے کنال کے خیمے کی طرف بڑھے۔

اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔

وہ سائے مترشنگ کے وفادار سپاہی تھے اور ان کی تعداد دس تھی' گیارہواں خود مترشنگ تھا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے چاروں طرف سے کنال کے خیمے کو گھیر لیا اور چار سپاہیوں کے ساتھ مترشنگ خیمے کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس جیسے ماہر جنگ باز کے لیے دروازے پر استادہ سپاہیوں کو ڈھیر کرنے میں کچھ بھی دقت پیش نہیں آئی اور یوں اندھیری رات کی مدھم روشنی میں کنال نے اپنے سب سے عزیز اور بچپن کے دوست کا اصل چہرہ دیکھا۔ ہاتھوں میں ننگی تلوار تھامے جب کنال کے سامنے مترشنگ آیا تو جیسے کنال کی آنکھوں میں سارے سنسار کی اداسی ڈول گئی۔ ان خوبصورت آنکھوں کی بے پناہ روشنی میں مترشنگ کو اپنا آپ بہت چھوٹا معلوم ہوا۔ اس کی تلوار میں لمحے بھر کو لرزش پیدا ہوئی اور اس کی نظریں یکبارگی شرمندگی سے جھک گئیں پھر دوسرے ہی لمحے شیطان جو خواہشوں کے منہ زور رتھ پر سوار تھا' اس کے چابک نے مترشنگ کو پھر سے راون بنادیا اور وہ نہایت سفاکی سے بولا۔

"راج کمار کنال خود کو میرا بندی سمجھیں' اب آپ کے پاس میرے ہر حکم کی تعمیل کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔"

کنال کی آنکھیں گہرے دکھ سے ڈبڈبا گئیں۔ "یہ سب کس لیے مترشنگ؟" کنال نے ایسی بے نیازی

سے کہا کہ مترشنگ گڑبڑا گیا۔ وہ زبردست اچنبھے میں مبتلا تھا کہ آخر شہزادے کے چہرے سے کسی بھی قسم کی گھبراہٹ اور پریشانی کیوں نہیں جھانک رہی؟

''ان باتوں کی تفصیل میں جانے کا سمے نہیں ہے' بس اتنا جان لیجیے کہ پریمیوں کے بھاگ میں راجیہ نہیں ہوتا۔ اب ہندوستان اور عظیم بھارت کا مہاراجہ مترشنگ کو بننا ہے' وہ شاندار تخت و تاج جس کے مالک آپ ہیں' اب آپ کی قسمت میں نہیں ہے۔''

''تو وہ تم لے لو' تمہیں مبارک' ہمیں نہیں چاہیے' ہمیں تو بس......''

''مطلب؟'' مترشنگ کی حیرت دیدنی تھی۔

''ہمیں بس یہ ضمانت دے دو کہ تمہاری سلطنت میں پرجا کو کوئی تکلیف نہ دی جائے گی اور ہمیں ہماری رجنی کے ساتھ یہاں سے سرکشت جانے دو گے۔''

شہزادے کی بات سن کر مترشنگ کچھ دیر کو جیسے مخمصے میں پڑ گیا پھر سوچ کر بولا۔ ''آپ کو زندہ چھوڑ دینا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔'' کنال نے اسے غور سے دیکھا اور اس کے مزید قریب آنے کی کوشش کی۔ مترشنگ مزید مستعد ہو گیا جیسے وہ کنال کے حملہ آور ہونے سے خود کو محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔

''تو کیا ہمارے بچپن کا دوست یہ سمجھا کہ ہم جو اسے راج پاٹ دیئے دیتے ہیں' وہ ہماری محض خود کو بچانے کو کوئی چال ہے اور تم ہمیں زندہ چھوڑنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتے؟''

''یہ سب بے کار باتیں ہیں' ان کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے ستاسٹ یہ بتائیں' رجنی کہاں ہے؟ اسے یہاں آپ کے پاس ہی ہونا چاہیے تھا؟''

''میں یہاں ہوں مترشنگ۔'' یہ سنتے ہی مترشنگ نے دیکھا کہ رجنی کی تیز چمکتی ہوئی تلوار کی نوک اس کی گردن میں چبھ رہی تھی اور اس کے چاروں سینک بھی رجنی کے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں کے ہاتھوں بے بس ہو چکے تھے۔

''یہ غلطی مت کرنا چھوری ورنہ مترشنگ کی سپاہ تمہاری اور تمہارے پریمی کی تکہ بوٹی کردے گی۔'' مترشنگ نے تلوار کی چبھن محسوس کرتے ہوئے رجنی کو دھمکی دی۔

''آخاہ...... کیسی زبردست خوش فہمی ہے میرے یار کو۔'' کنال نے بھاری طنز سے کہا جس میں بلا کا اعتماد بھی تھا' خوف اور ڈھیروں سوالوں کا قافلہ مترشنگ کی آنکھوں میں آ کے ٹھہر گیا۔ پیچھے مزید آٹھ دس سپاہیوں نے آ کر مترشنگ کی مشقیں کس دیں اور اسے نہایت سنگدلی سے مضبوط رسیوں میں جکڑ دیا گیا۔ مترشنگ بڑی غضب کی بے بسی اور حیرانی سے یہ سب تماشہ دیکھتا رہا اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟

''مترشنگ' بڑے افسوس کے ساتھ میں آپ کی باقی کی حیرانی دور کیے دیتی ہوں۔'' رجنی نے ایک نظر کنال کو دیکھا اور بولنا شروع کر دیا۔

''آخری بھینٹ میں آپ کی جو حالت تھی' اسے میں اچھی طرح بھانپ چکی تھی کہ آپ اگلا قدم یہی اٹھانے والے تھے کیونکہ میری واپسی اور میری باتوں سے آپ نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں آپ کی حقیقت جان چکی ہوں۔ آپ کرن کو واپس لانے اور پاٹلی پتر میں کشتا رانی کے ساتھ مل کر رچائے گئے اس کھیل کو اس صورت میں ناکامی سے دوچار ہوتے دیکھ رہے تھے کہ اگر راجکمار نے جنتا یاترا کی تو آپ اتنے دن تک ان انتظامات کو قائم

نہ رکھ سکتے جو کنال مہاراج کو بے دخل کرنے کے لیے آپ نے کشتا رانی کے ساتھ مل کر کیے تھے۔ آپ کرن کو بھی اس یاترا کا حصہ نہیں بنا سکتے تھے کہ خود آپ کو بھی یہ نہیں معلوم کہ کشتا نے کرن کو کس جگہ قید کر کے رکھا ہے لہٰذا آپ نے سوچا کہ پاٹلی پتر میں پہنچ کر کہیں کنال مہاراج جنتا کی پرجوش حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو جس سینا پر آپ کو پورا بھروسہ ہے' کہیں اس میں پھوٹ نہ پڑ جائے جو ایسا ہوا تو آپ بڑی رسوائی سے جنتا کے سامنے ذلت کی موت مارے جاؤ گے لہٰذا یہاں موجود فوج کے بھروسے پر جس کی چنوتی ابھی آپ نے مجھے دی' کنال مہاراج کے خلاف بغاوت کرنے اور انہیں بھگوان نہ کرے' جان سے مارنے اور بغاوت کرنے میں ہی آپ کو اپنی کامیابی نظر آئی اور آپ نے بغاوت کر دی مگر یہ آپ کی بھول تھی' پانسہ تو آپ کے خلاف کب سے پلٹ چکا ہے' سینا آپ کی نہیں' مہاراج کی وفادار ہے' جس کا ثبوت وہ سب ٹکڑیوں کے مہاسہنا ہیں جنہیں آپ اپنے ساتھ سمجھتے ہیں' وہ سب کے سب مہاراج کنال کے وفادار اور جاں نثار ہیں اور یہ نظارہ ہم آپ کو ضرور دکھائیں گے۔'' یہ کہہ کر رجنی نے زوردار تالی بجائی تو بیس ایسے وردی پوش سپاہی خیمے میں داخل ہوئے جو مختلف سطحوں پر فوج کے نگران تھے۔ ان میں دو ایسے سینک بھی تھے جنہوں نے کچھ دیر پہلے مترشنگ کے کہنے پر کنال کے خیمے کو اپنے پہرے میں لے لیا تھا۔

''ان میں سے ایک بھی آپ کے ساتھ نہیں ہے تو پھر آپ کو کیوں لگتا ہے کہ آپ کنال جیسے عظیم راجہ کی جگہ لے سکتے ہیں؟''

مترشنگ کے چہرے پر رجنی کی بات ختم ہونے تک ہوائیاں اڑ رہی تھیں جن مہاسیناؤں کے بھروسے پر اس

نے یہ اتنا بڑا اقدم اٹھایا اور اتنی بڑی بغاوت کی جرات کی' وہ سب کے سب اندر سے کنال کے وفادار نکلے اور اسے بے وقوف بناتے رہے۔ وہ دل سے مان گیا کہ رجنی واقعی دیوی دیوتاؤں کی اولاد ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کنال کو شکست دینا ناممکن ہے۔

''یہ آپ ٹھیک نہیں سوچ رہے سیناپتی' یہ سب میرے کہنے پر آپ سے باغی نہیں ہوئے بلکہ ان سب نے میری غیر موجودگی میں مہاراج کنال سے وفاداری کی شپت لی تھی' ان کی وفاداری کبھی بدلی ہی نہیں' یہ تو آپ خود غلط فہمی میں مبتلا تھے' یہ سب ہمیشہ سے اپنے راجہ کے وفادار ہیں۔'' رجنی نے کہا تو مترشنک کو لگا کہ رجنی من بھیتر کی باتیں بھی جانتی ہے حالانکہ اس وقت اس پورے واقعے سے باخبر ہونے والا کوئی بھی پرش یہی کہتا جو رجنی نے کہا اور یہ حقیقت ہے کہ سینا کے ان سب نگرانوں نے اپنی وفاداری کی شپت رجنی کے کہنے پر نہیں بلکہ راج کمار کنال کی محبت میں رجنی کی غیر موجودگی میں لی تھی۔

''ہم یہ سب جانتے تھے مترشنک' مگر تمہاری بے وفائی کے بعد ہم سنسار سے اتنے نراش اور بددل ہو چکے تھے کہ ہم نے تمہیں اپنی بے شمار خدمت اور بہت سی دوستی کے بدلے میں ایک موقع دینا چاہا کہ اگر تم جنتا کو اچھے سے رکھنے اور ہمیں یہاں سے جانے کی آ گیا دو تو ہم یہ سکھ سنسار' یہ راج پاٹ سب تمہاری دوستی کو' تمہاری محبت کو دان کیے دیتے تھے مگر تم نے اسے ہماری بزدلی سمجھا۔ ہم سب کچھ ہو سکتے ہیں' بزدل نہیں ہو سکتے۔ تم نے اسے ہماری جان بچانے کی کوئی چال سمجھا' آہ پرش بڑا لوبھی اور اندھا ہے' وہ اپنا فائدہ نہیں جانتا' اسے ہمیشہ دوسرے کے پاس کھوٹ دکھائی دیتا ہے' اپنا من جب کھوٹ اور دغابازی سے بھرا ہو تو دوسرے کو کیسے سچا اور ایماندار سمجھا جا سکتا ہے؟ افسوس کہ ایسا ہی تم نے بھی سمجھا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ دنیا کہیں ایسے ہی اوشواس اور لوبھ سے تو نہ اٹ جائے گی؟'' یہ کہتے ہوئے کنال کی آواز بھرا گئی۔

مترشنک کی آنکھوں سے شرمندگی کے آنسو بہنے لگے' وہ پوری طرح چپ تھا' اس کے من میں ایک سوال ہتھوڑے کی ضرب کی طرح گونج رہا تھا کہ وہ میں تھا جس نے یہ سب سے پہلے سمجھا کہ دنیا میں نئے دھرم کی نیو رکھی جا چکی ہے اور براہمنوں' دھارمک گیانی سیانوں کے پاٹ شالاؤں میں پڑھائے جانے والے اس اپدیش اور سیکھ سے قطعی مختلف آپ ہی آپ پیدا اور پروان چڑھنے والے دھرم کا نام پریم ہے۔ یہ کنال اور رجنی کا بے پناہ پریم ہی تھا جس کے کارن وہ پا تنی سے کئی بار مناظرہ کر چکا تھا اور ان کی نظروں میں برا بنا رہا پھر یہ کون سا سمے اور کون سا لمحہ تھا جو اس کا من جھٹاپٹ لوبھ اور لالچ سے بھر گیا اور اس نے خود ہی اس غیر معمولی پریم کو مٹانے کا فیصلہ کر لیا؟ سچ ہے' پرش کے قدم لڑکھڑا جائیں تو وہ مخملی قالین پر بھی پھسل سکتا ہے اور وہ بھی پھسل گیا' اپنے ایسے اچھے دوست سے بے وفائی کی۔ اب اس شکست زدگی کے بعد زندہ رہنے کی اس کی اچھا یکلخت مر گئی۔ اسے یہ خیال بھی بے معنی معلوم ہوا کہ کنال اگر ایک بار اسے معاف کر دے تو وہ اپنی جان اپنے دوست پر نچھاور کر دے گا۔

''مجھے جتنی جلد ہو' مرتیو دے دی جائے' میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔'' بڑی گمبھیرتا اور شکست خوردگی سے مترشنک نے کہا۔ رجنی نے ترنت کنال کی طرف دیکھا' اس کی توقع کے عین مطابق کنال کی آنکھوں میں اپنے دوست کی ایسی بھیانک بے وفائی کے بعد بھی پیار اور دایا ڈولنے لگی تھی۔ قبل اس کے کنال کمزور پڑتا اور کوئی ایسی بات کہتا جو کسی نئے فتنے کو جنم دینے کا شاخسانہ ہوتی' رجنی جلدی سے بولی۔

''مترشنک کو لے جاؤ اور قید کر دو۔'' سپاہیوں نے ایک لمحاتی نظر کنال پر ڈالی' کنال نے ناقابل برداشت دکھ سے منہ دوسری طرف موڑ لیا اور وہ مترشنک سے پیٹھ موڑ کے کھڑا ہو گیا۔ مترشنک نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کنال کی طرف دیکھا اور بولا۔

''بھگوان مجھے اگلے جنم میں بھی کنال کا دوست بنا کے پیدا کرنا اور بے وفائی کا بیج میری مٹی سے نکال دینا' بھلے مجھے کنال کا کتا بنا کے دنیا میں بھیجنا مگر بے وفائی کا لوبھ میرے بھاگیہ میں مت لکھنا بھگوان۔''

اس دعا پر کنال کی خوبصورت آنکھوں سے دو آنسو پھوٹ کر اس کے چہرے کو بھگو گئے۔ خیمے میں گہرے سکوت کی حکمرانی تھی' دیر تک کنال خاموش رہا' رجنی کی بھی سمجھ میں نہ آیا' کیا کہے؟ پھر بھی وہ بولنا چاہتی تھی تا کہ یہ جان لیوا خاموشی رخصت ہو سکے۔

''مہاراج' جیون میں انہونیاں ہوا ہی کرتی ہیں' بھلا کیا یہ انہونی نہیں ہے کہ آپ مجھ جیسی کم ذات ناری کو اپنے من میں جگہ دیتے ہیں؟''

''رجنی......'' کنال نے جھٹ رجنی کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔

''ایسی عجیب بات کیوں کہتی ہو؟ کیا تم نہیں جانتی کہ محبت اور بے وفائی میں کتنا فرق ہے؟ اگر یہ دو الگ الگ انہونیاں ہیں تو ایک ایسی کہ گگن بھی جس پر جھک کر پرنام کرے اور دوسری ایسی کہ دیوی دیوتا سب اس پر نفرین کریں۔ ان دونوں کا آپس میں کوئی میل نہیں' میری آتما کی شانتی' میرے من کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لیے تم انٹ شنٹ نہ بولو' میں ٹھیک ہو جاؤں گا' ٹھیک' کاش بھگوان نے مجھے راجکمار نہ بنایا ہوتا۔ عام پرش کے لیے بن باس لینا اور اپنے من کے روگ کا ماتم کرنا کتنا سہل ہے اور ایک شہزادے کو تنہائی میں بھی رونے کی اجازت نہیں' راجیہ کا یہی اصول ہے۔'' یہ کہہ کر کنال پھوٹ پھوٹ کے رو دیا اور اسے رجنی بھی اسے چپ کرانے کے بجائے اس کے ساتھ ہی رونے لگی۔ خیمے کے باہر رات نے اپنا دامن سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

•......•......•......•

کشتا کو اس وقت ایک نئی حیرت نے جکڑ لیا جب کنال کی طرف سے ایک قاصد یہ پیغام لایا کہ مترشنک کی بغاوت کچل دی گئی ہے اور انہیں بندی بنا لیا گیا ہے۔ اگر کشتا رانی انصاف سبھا میں پیش ہونے سے بچنا چاہیں تو فی الفور کرن کو اپنے خاص بندی خانے سے رہا کر دیں ورنہ انہیں گرفتار کر کے بغاوت کے مجرم مترشنک کے ساتھ انصاف کی سبھا میں پیش کیا جائے گا۔''

یہ سندیسہ پڑھ کر کشتا کے حواس جاتے رہے اور فوری طور پر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی' اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے؟ پورے منصوبے میں جو کشتا نے مترشنک کے ساتھ مل کر بنایا تھا' یوں پاٹلی پتر پہنچنے سے پہلے مترشنک کی بغاوت کا کہیں ذکر نہ تھا' یہ نہایت بچکانہ اور ادھ ما دا اقدام مترشنک نے کیوں اٹھایا؟ ساتھ ہی خود کشتا کا نام لے کر اسے بھی کنال کی نظروں میں اتنا گرا دیا کہ اب وہ کس طرح اپنے ایسے بیٹے کا سامنا کریں گی جو بھلے ہی ان کا سگا سپوت نہ تھا مگر ان کے پتی کا خون تھا اور خود کنال نے اپنی اور سے کبھی بھی کشتا کو اپنی سگی ماں سے کم کا درجہ نہ دیا تھا۔ کشتا کو احساس ہو گیا کہ وہ بہت بری طرح پھنس چکی ہے' قاصد کو نہایت تزک و احتشام سے مہمان خانے میں ٹھہرانے کا آدیش دے کر وہ گہری سوچوں میں غرق ہو گئی اور اپنی اس ذہانت پر جو انجانے میں اس سے سرزد

ہوئی کہ وہ ارجن کو قیدی بنانے کے بجائے بڑی شان و شوکت سے محل کے خاص مہمان خانے میں ٹھہرا چکی تھی جہاں مختلف ریاستوں کے راجے مہاراجے قیام کر چکے تھے ساتھ ہی کشتا کو یہ بھی یاد آیا کہ اس نے پریمودا سے کہا تھا کہ وہ مترشنگ کے بجائے کنال کو ہی اپنا مہاراج مان لینے کا فیصلہ کر چکی ہے یقیناً پریمودا نے یہ بات......" وہ سوچنا چاہتی تھی کہ ارجن کے بھائی بہادر کرشن کو بتائی ہوگی اور اس کے ذریعے کنال تک چلی گئی ہوگی مگر پریمودا تو بتا رہی تھی کہ اس کی ملاقات کرشن سے ہوئی نہیں' تب تو اس تبدیلی کی خبر کنال کو نہیں ہو سکی ہوگی کہ اب وہ مترشنگ کے ساتھ نہیں۔

"اب اس نئی افتاد میں کیا کروں؟ ابھی کل ہی تو مہا پروہت پانینی کے پاس سے آئی ہوں' یوں گھڑی گھڑی ان کے پاس دوڑے چلے جانا خود ان کی ذات کو بھی اندیشوں میں گھسیٹ سکتا ہے۔ چنانچہ کشتا نے اپنے بیٹے جالوت سے اس معاملے میں رائے لینے کا فیصلہ کیا اور جالوت کی محل سرا کی طرف کو چل پڑی۔

•......•......•......•

"ایک ہی راستہ ہے' سراسر اور ترنت کرن کو رہا کر دیجیے اور یہ بات کنال کو لکھوا بھیجیے کہ آپ اس کی تاجپوشی کے لیے مجھے یعنی جالوت کو بھی ستھرے من سے راضی کر چکی ہیں اور ہندوستان کا راج پاٹ' سنگھاسن اپنے مہاراج کنال کی باٹ دیکھتا ہے۔"

"اور وہ جو ہمیں اس نے مترشنگ کی سازش کی بھاگے دار قرار دیا ہے تو وہ من کا میل ایسا کہنے سے ڈھل جائے گا کیا؟" کشتا کی ناک چڑھ گئی۔ "کاش جالوت کے بھیجے میں بھی کچھ عقل ہوتی۔"

"آپ مجھے کبھی خود سے زیادہ تو کیا' اپنے برابر کارگی بھی نہیں سمجھتیں' آپ نے خط میں پڑھا نہیں کہ اگر آپ انصاف کی سبھا میں پیش ہونے سے بچنا چاہتی ہیں تو ترنت کرن کو رہا کر دیں یعنی کنال خود اپنی کشتا میا کو انصاف کی سبھا میں پیش نہیں کرنا چاہتا اور کرن کی رہائی اس کا ثبوت ہوگی کہ آپ مترشنگ کی بغاوت کی ناکامی کے بعد اب اس کے ساتھ نہیں ہیں لہٰذا کرن کو آزاد دیکھ کر کنال سمجھے گا کہ آپ اپنے ارادے سے باز آ گئی ہیں اور وہ آپ مجرموں کی صف میں جگہ نہ دے گا۔" جالوت نے بڑے سبھاؤ سے پوری بات سمجھائی۔

"اگر تم ٹھیک کہتے ہو تو یہ مان لینا ہوگا کہ تمہاری بدھی میں بھی عقل ہے اور وہ اب کام بھی کرنے لگی ہے لیکن اگر کرن کی رہائی کے بعد تمہیں اور مجھے پکڑ لیا گیا تو ہم بے موت مارے جائیں گے۔"

"آپ کچھ بھی قدم اٹھا لیں' طاقت اور سینا کے زور پر کنال کا راستہ نہیں روک سکتیں' یہ تو اس نے خود ہی اپنے پریوار کا مان سمان بچانے کے لیے آپ کو کرن کی رہائی کی صورت میں ایک موقع دیا ہے ورنہ وہ اپنی فوج کے ساتھ محل پر چڑھائی کر دے' تب بھی جیت اسی کی ہوگی پھر کرن کو آزاد کرا لینا اس کے لیے مشکل نہ ہوگا اور کنال نے اگر چڑھائی کر دی آپ کی کسی بھی غلطی کی وجہ سے تو بات پوری طرح عیاں ہے کہ پھر آپ کو اور مجھے مرتی سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ بغاوت سے بڑا کوئی جرم نہیں' موت کے گھاٹ اتارنے کے علاوہ یا اس سے کم کوئی سزا نہیں ہے لہٰذا کرن کو رہا کرنے کے علاوہ آپ کے پاس اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔"

کشتا نے پورے دھیان سے یہ سب سنا اور اپنے بیٹے کا ماتھا چوم کے بولی کہ اب ہمیں یقین ہو چلا ہے کہ تم ہندوستان کے تخت پر بیٹھنے کے لائق ہو۔"

واپس آ کر کشتا نے کرن کو رہا کرنے کا حکم دیا اور پریمودا کو پاس بلا کر بولی۔ "کیا تم جانتی ہو کہ مترشنگ نے

کنال کے خلاف بغاوت کر دی؟"

پریمودا ایک بات اچھی طرح جان چکی تھی کہ اب وہ کشتا کی پہلے والی کنیز نہیں ہے' کشتا بہانے بہانے سے اس کا امتحان لیتی رہتی ہے۔

"میں بھلا یہ کیسے جان سکتی ہوں' محلوں اور راج سنگھاسن کے کھیلوں کی خبر مجھے کیوں کر ہونے لگی' آپ ہی کی زبانی سنتی ہوں۔" حالانکہ پریمودا کا من جلد سے جلد اس بغاوت کا انجام جاننے کو شدید بے چین ہو چکا تھا مگر وہ کسی بھی قیمت پر اپنی بے چینی کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"خیر' ہم نے یونہی کہا' ٹھیک کہتی ہو تم بھلا کیسے جان سکتی ہو' دو دن بعد کنال کا قافلہ پاٹلی پتر میں براجے گا۔ ہمیں یقین ہے' تم اس ناری جس نے شنکر کا بھیس بدل رکھا ہے' کو پہچان لینے میں ہماری مدد کرو گی۔" کشتا نے الوداعی انداز میں کہا۔

"میں آپ کی باندی ہوں' آپ کا حکم بجا لانا میرے فرائض میں شامل ہے۔"

"ٹھیک ہے' ہمیں تم سے یہی امید تھی۔"

"کیا میں ارجن جی سے مل سکتی ہوں؟" پریمودا نے کہا تو کشتا ایک لمحے کو چونکی۔ "اس نے وہیں اپنے گھر پر کہا تھا کہ میں محل میں کسی کو جانتا نہیں ہوں تو مجھے آپ کی سنگت کی ضرورت ہوگی۔"

"اچھا' ہم تو واقعی بھول گئے تھے کہ ان کا تو جی اچاٹ اور بھاری ہوتا ہوگا' ضرور چلی جاؤ اور ان سے یہ ضرور کہنا کہ محل میں تو اور کنیزیں بھی ہیں' وہ ان سے بھی اپنا دل بہلا سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر کشتا ایک خاص ادا سے ہنسی۔ پریمودا کو اس مکروہ عورت کا طنز خوب اچھی طرح محسوس ہوا۔

کشتا کے سر پہ بھلے ہی باغی مترشنگ کا ساتھ دینے اور گٹھ جوڑ کرنے کا جرم تھا اور ایک طرح سے وہ بھی موت کے منہ میں تھی مگر وہ اپنی چالوں سے آخری سانس تک باز نہ رہنے والی استری تھی لہٰذا اس وقت بھی وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسے کنال کو کیسے ایسی مصیبت میں ڈالنا ہے کہ اول تو وہ تاجپوشی کی رسم ہی ادا نہ کر سکے اور جو ایسا ہو جائے تو چین سے حکومت نہ چلا سکے' وہ ایسی ہی ادھیڑ بن میں مصروف تھی۔

•......•......•......•

کرن کی رہائی ہوئی اور کشتا نے اس سے بڑی دلی معذرت کی' بہت ناٹک کیا' کرن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا کہ یہ حرفوں کی بنی عورت پہلے چیتے کی طرح غرا رہی تھی' جب اسے گرفتار کیا گیا تھا اور اب رہا کرتے وقت وہ کسی بھیگی بلی کی طرح کمزور اور خوفزدہ لگتی ہے۔ راستے بھر وہ اسی طرح کی سوچوں میں رہا' اسے صرف اتنا بتایا گیا کہ اسے فوری طور پر ہونے والے راجا کنال نے طلب کیا ہے۔ اس ایک بات سے وہ اتنا ضرور سمجھ گیا کہ کنال کی حالات پر گرفت مضبوط ہے اور کشتا کا دم خم اب پہلے جیسا نہیں۔ جب وہ کنال اور رجنی سے ملا تو اس کی سب سوچوں کے بادل چھٹ گئے۔ رجنی اسے دیکھ کر روایتی طور سے خوش ہوئی اور اس کا سواگت بھی خوب اچھی طرح سے کیا پھر بھی کرن نے مہاراج کنال کے رویئے میں ایسی سرد مہری محسوس کی جس سے وہ کچھ مزید سوچوں میں گھر گیا۔ وہ فوری طور پر رجنی سے ملنا چاہتا تھا تاکہ اصل معاملہ جان سکے۔ رجنی' کنال سے یہ کہہ کر رخصت ہوئی کہ وہ کرن کو ان کی نئی ذمے داریوں سے آگاہ کر کے واپس آتی ہے' یوں کرن اور رجنی آمنے سامنے ہوئے۔

"مترشنگ کہاں ہے کرشن؟" کرن نے حسب توقع پوری بے قراری سے پوچھا' تب رجنی نے اسے مترشنگ کی بغاوت اور دیگر تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔

"اوہ' تب ہی مہاراج ملول اور اداس ہیں؟"

"کنال مہاراج کو ان کے سب سے عزیز دوست کی بے وفائی نے بڑی گہری چوٹ پہنچائی ہے' ان کی سب کوششیں رائیگاں چلی گئیں اور اب وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے ہیں کہ اپنے اتنے قریبی دوست کو سزا دینے کا حکم کیسے دیں؟"

"کیا سزا تجویز ہوئی ہے؟" کرن نے گمبھیرتا سے ایک نامعلوم اداسی کے ساتھ پوچھا۔

"تاجپوشی کے بعد سر عام سزائے موت...... دار پر کھینچے جانے کی صلاح ہے تاکہ پھر مدتوں تک کوئی باغی ایسی غلطی نہ کر سکے۔" کرن چپ رہا۔ "آپ کیا کہتے ہیں؟" رجنی نے اس کی رائے لینا چاہی۔

"یہی سزا سب سے موزوں ہے۔" کرن نے ہر قسم کے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"ایک اور بھی راستہ ہے جس سے یہ معاملہ حل کیا جا سکتا ہے' مہاراج کنال کو اس طرح شاید سزا سے ہونے والا دلی صدمہ کم ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" کرن کو لگا کہ رجنی پھر کوئی انہونی بات کہنے والی ہے۔

"وہ یہ کہ مترشنگ کو عمر بھر کی قید میں ڈال دینے کی سزا دی جائے۔" رجنی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر یہ ممکن نہ ہوگا۔" کرن بولا۔

"وہ کیوں؟" رجنی نے متوقع اعتراض کے باوجود سوال کیا۔

"اتہاس اور حکومتی قوانین کی رو سے یہی سزا دینا لازمی ہوگی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایک گروہ باقاعدہ اس کی مخالفت کرے گا اور وہ ہے دھارمک براہمنوں کی جماعت جو قوانین کو سختی سے نافذ کرنے کی حامی ہے۔"

"سب جانتے ہیں کہ مترشنگ' راجکمار کا دوست اور چہیتا تھا' ایسے میں یہی سمجھا جائے گا کہ کنال مہاراج نے آپسی رشتے کا خیال رکھتے ہوئے ایسا کیا ہے' مزید یہ کہ خود سپاہیوں کو بھی یہ ناگوار گزرے گا اور وہ یہ مانگ رکھ سکتے ہیں کہ آئندہ ہر باغی کو یہی سزا دی جائے۔" کرن نے ہلکا سا توقف کر کے پھر سے اپنی بات مکمل کی۔

"یعنی مترشنگ کو پھانسی دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے؟" رجنی پہلی بار ایک الجھن محسوس کرنے لگی خود کو۔ کیونکہ دل سے وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح مترشنگ کو سزائے موت سے بچا لیا جائے ورنہ کنال اس کسک کو ساری زندگی محسوس کرتا رہے گا کہ اس نے اپنے سب سے عزیز دوست کی جان لی ہے مگر حالات اسے اس کسک سے چھٹکارہ پانے کی طرف کوئی راستہ نہ دیتے تھے۔

"کاش مترشنگ نے یہ غلطی نہ کی ہوتی۔" رجنی نے افسردگی سے کہا۔

"آپ نے اس کے گرد گھیرا تنگ کر دیا تھا' اسے دونوں طرح سے اپنی موت نظر آنے لگی تو مترشنگ نے سوچا کہ ساری سینا میرے قابو میں ہے کیوں نہ بغاوت کر کے راج سنگھاسن پر قبضہ کر لیا جائے حالانکہ یہ اتنا

آسان نہ تھا' بغاوتوں کا یہ سلسلہ بڑی دور تک پھیل سکتا تھا اور کچھ پتا نہیں کہ یہ بغاوتیں ساری سلطنتوں اور پورے ہندوستان کو ایک طویل اگنی کے جہنم میں دھکیل دیتیں' یہ قدم مترشنگ جیسے ذہین اور جی دار انسان سے تقدیر نے اٹھوایا کیوں؟ ہندوستان کا نصیب اسی طرح لکھا گیا ہے کہ اس کے تخت پر کنال جلوہ افروز ہوں؟" کرن کی باتوں کے بعد اب اس موضوع پر مزید کچھ بولنا عبث تھا لہٰذا رجنی نے اسے لیکھوں کا ان مٹ سمجھ کر خاموشی اختیار کی۔

"کشتارانی کا سب سے بڑا مہرہ پٹ چکا ہے' تب ہی انہوں نے مجھے رہا کیا۔ اب وہ مزید کیا کر سکتی ہیں؟" کرن نے خاموشی کو توڑتے ہوئے رجنی کے دماغ میں کیا چل رہا ہے' یہ جان لینا چاہا۔

"بھائی ارجن ابھی وہاں ہیں۔" رجنی جیسے اور کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔

"آپ ارجن کو بھی جنتا یاترا کے لیے بلوا لیجیے' اب ارجن کا وہاں رہنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔"

کرن کی یہ بات رجنی نے ایسے غبار میں سنی کہ وہ سوچ رہی تھی' انسویا کو اب بھی کنال مہاراج کی پریمکا اور شنکر سپاہی کے روپ میں پیش کرنا ٹھیک ہوگا یا نہیں کیونکہ فی الحال یہ معاملہ اپنی جگہ اسی شدت سے موجود تھا کہ جب بھی کنال اس کے اور اپنے پریم کی بابت زبان کھولیں گے اور اسے اپنی ملکہ بنانے کا خیال کریں گے تو دھارمک سبھا کی جانب سے اور تمام اونچے رتبوں پر بیٹھے لوگ اور اونچی ذاتیں ایک آواز ہو کر مخالفت کریں گی تب راج سنگھاسن ایک مرتبہ پھر ڈول جائے گا۔ جنتا یاترا کا اصل مقصد اب یہ نہیں رہ گیا کہ کنال رعایا سے اپنے لیے حمایت حاصل کرے کیونکہ یہ سب تو اس وقت کے لیے تھا جب مترشنگ اور کشتارانی کی سازشوں سے کنال کو کوئی خطرہ ہوتا اور ایسے میں جنتا کی پوری حمایت کنال کو حاصل ہوتی تو مترشنگ اور کشتا کے لیے یہ آسان نہ ہوتا کہ کنال کو راج سنگھاسن سے بے دخل کیا جائے۔ دھارمک براہمنوں سے ساز باز کر کے اب بھی یہ کیا جا سکتا تھا کہ کنال اپنے پریم اور رجنی کو اپنی ملکہ بنانے کے لیے ان کی وہ سب مانگیں مان لیتا جس سے ریاست ایک مرتبہ پھر ان کی گرفت میں چلی جاتی اور لوگوں کی زندگیاں پہلے سے زیادہ عذاب میں ڈال دی جاتیں۔ تاہم ایسا کرنے سے رجنی اور کنال کا پریم وصل کی لذتوں سے ہمکنار ہو سکتا تھا تو کیا اپنی محبت کے حصول کے لیے کنال کو یہ کرنا چاہیے؟

یہ سوال رجنی کے دل و دماغ میں کمان ہو چکا تھا' آخر اب کیا کرنا چاہیے' دوسری صورت میں اسے ان سب مخالفتوں کا سامنا کرنا ہوگا جس سے ریاست میں ان دیکھی گہری سازشوں کا جال کچھ اس طرح پھیل جائے گا کہ اس سے نمٹنا آسان نہ ہوگا۔

"آپ کسی بھاری سمسیا میں کھوئی ہوئی ہیں؟" کرن نے رجنی کو گہری سوچوں میں غرق دیکھ کر پوچھا' رجنی نے ساری بات اسے بتا دی' وہ بھی دبیز خاموشی میں منہمک ہو گیا۔

•......•......•......•

پاٹلی پتر پہنچ کر ایک خاص جگہ پر پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ کشتا کو یہ خبر بھجوا دی گئی کہ پڑاؤ دس دن رہے گا۔ پہلے کنال سارے پاٹلی پتر میں جنتا یاترا کریں گے پھر محل میں براجیں گے اور اسی وقت یعنی پورے دس دن بعد سواگت کیا جائے' ساتھ ارجن کو کنال کے قافلے کا حصہ بنانے کا بھی آدیش دیا گیا۔ پریموادا یہ سب جان کر پوری طرح باولی ہو گئی' اسے خوشی تھی کہ رجنی اور کنال کا پریم اب اپنی منزل کو پہنچنے والا ہے اور ان کے رستے کی

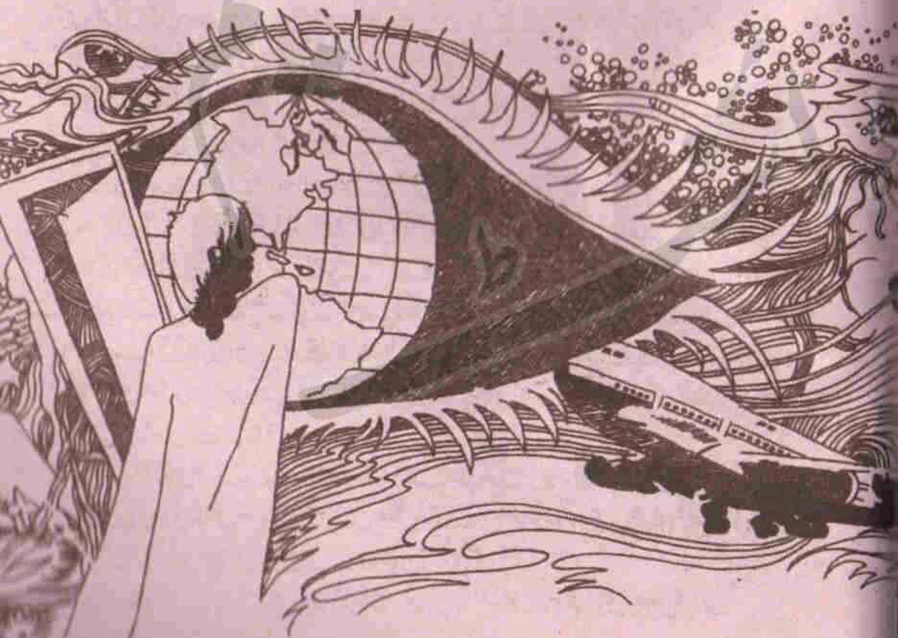
شازلی سعید مغل

تاشون

حزیں صدیقی کا خیال

عالم رنگ و تماشا سے گزر
کوئی قیمت نہیں بینائی کی

حیرت، تجسس، اسرار اور ستاروں سے جڑے بہت خاص سلسلے کی گیارہویں کڑی



سب دیواریں گر چکی ہیں۔ ایک کنیز پریموداس سے زیادہ اور سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کا من پوری طرح اس کے بس سے باہر ہو چکا تھا۔ ارجن کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس وقت کنال اور رجنی کے قافلے میں شامل ہونا چاہتی تھی مگر نہ کنال نے اسے بلوایا اور وہ کیوں بلواتا' وہ اتنی اہم بھی تو نہیں تھی نہ ہی کشتا ہی اسے بھیجنے پر راضی ہو سکتی تھی کہ اس کا محل سے چلے جانے کا اب کیا جواز تھا اور یوں بھی کشتا کی مرضی کے بغیر یہ ناممکن تھا۔ اب وہ پھر سے کشتا کی مرضی اور اشاروں پر چلنے والی ایک باندی تھی۔ جتنے دن اس نے محل سے باہر کنال کے قافلے میں گزارے' وہ اسے زندگی کے سب سے خوبصورت اور انمول دن محسوس ہوئے اور پھر یکایک اسے ایک راستہ نظر آ ہی گیا۔

جب ارجن کے ساتھ قافلے میں پریموداب بھی پہنچی تو رجنی کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''تم کیسے آ ئیں؟'' رجنی نے سرگوشی کی۔

''کشتا سے کہا' میں اس ناری کو پہچان لینے کی ٹوہ لیتی ہوں جو کنال مہاراج کی ملکہ بنے گی اور ایک سبب یہ بتایا کہ جو بظاہر کشتا کی کنال سے نوٹنکی محبت کا ایک دکھاوا ہے کہ انہوں نے کنال کی خدمت کے لیے ایک خاص کنیز بطور ماں کے بھیجی ہے جس سے کنال کے دل میں ان کے لیے مزید جگہ اور دایا پیدا ہو گی۔ بظاہر دونوں مقاصد کشتا رانی کے ہیں مگر میری بڑی غضب کی اچھا تھی کہ میں بھی جنتا یاترا کے قافلے میں شامل رہوں تو یہ چال میں نے ہی چلی۔'' پریمودا نے بتایا تو رجنی نے اسے غور سے دیکھا۔

''کشتا رانی کے ساتھ رہ کر بڑی چالیں چلنا سیکھ چکی ہو' اب کہیں تم سے بھی تو ہوشیار نہیں رہنا پڑے گا؟'' رجنی نے مصنوعی پن سے کہا۔

''جو کچھ میں نے تم سے سیکھا ہے' وہ کبھی کسی سے نہیں سیکھا اور وہ سب پر بھاری ہے۔'' پریمودا نے اس کے قریب پہنچ کر کہا پھر پریمودا اور رجنی صبح قافلے کی تیاری میں جٹ گئیں۔

•......•......•......•

تین دن بعد نہایت گھبراہٹ اور پریشانی میں کشتا پانینی کے سامنے عظیم آشرم میں داخل ہوئی۔ پانینی کسی تپسیا سے نہیں بلکہ ایک سنیاسی دھارمک مجلس سے فارغ ہوئے تھے کہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں اب انہیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہے' وہ کنال کی سوچوں سے واقف تھے جو اشوکا سے بھی زیادہ دھارمک گروہ کے لیے زہر قاتل تھیں اور وہ اپنے بچاؤ اور بقا کی جنگ چھیڑ چکے تھے۔ کشتا کی گھبراہٹ دیدنی تھی۔

''مہاراج' غضب ہو گیا' کنال جنتا سے اپنے لیے ایک نیچ ذات کی چھوری کو رانی بنانے کی حمایت حاصل کرنے کی باتیں کر رہا ہے اور جنتا تن من دھن سے اس کی ہم نوا ہو رہی ہے۔''

پانینی کو لگا جیسے آشرم کی سب دیواروں نے ہلنا شروع کر دیا' کوئی زلزلہ انہیں آشرم سے ٹکراتا محسوس ہوا' وہ کسی لڑکھڑاتے ستون کی طرح پاس پڑی نشست پر ڈھے گئے اور کشتا کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔

تاریخ سے جڑی اس اسرار بھری کہانی
کے باقی واقعات آئندہ مہینے ملاحظہ کیجیے۔

صبح کا ملگجا اجالا دھیرے دھیرے روشنی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اس صبح میں ہلکی سی خنکی بھی شامل تھی اِسی ہلکی سی خنکی میں لیونڈر، روزمیری، صندل، یوکلپٹس، گلِ شمدانی، ساج کی مہک کمرے میں موجود لوگوں کے اعصاب کو سکون بخش رہی تھی۔

مونگا نے تمام رات رانیہ کے بازوؤں، پیروں اور پیشانی پر، پورے چہرے پر مختلف خوشبودار تیلوں کا مساج وقفے وقفے سے کیا تھا۔ کمرے میں سوکھے پھولوں کی اور خوشبودار تیلوں کی ملی جلی مہک رچ بس رہی تھی۔

عمر سومرو بیدار ہو چکا تھا۔ زلفی بھی جاگ رہا تھا اور تاشون کے پاس بیٹھا تھا۔ ''یہ مونگا، رانیہ کو کیا کیا لگا رہی ہے؟'' زلفی نے سوال کیا تھا۔

''اروما آئلز ہیں۔'' تاشون جو کسی گہری سوچ میں گم تھا، چونک کر بولا تھا۔

''اروما آئلز؟'' عمر سومرو اس سوال کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھ کر تاشون کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

''یہ خوشبودار جڑی بوٹیوں سے کشید کیا جاتا ہے۔'' تاشون نے بات شروع کی تھی۔

''آپ لوگ ایسا کریں کہ اس مشرقی دریچے کی طرف بیٹھ جائیں۔'' مونگا اچانک اُن کے درمیان بول اٹھی تھی۔ ''کہیں رانیہ آپ لوگوں کی باتوں سے ڈسٹرب نہ ہو۔''

''ہماری باتوں سے رانیہ بالکل ڈسٹرب نہیں ہوگی۔ اس بات سے تم بے فکر رہو مونگا، بالکل بے فکر کیونکہ رانیہ 24 گھنٹے سے پہلے نہیں جاگ سکتی، یہ اس کے لیے ضروری ہے اسی لیے میں نے اس پر ایک میٹھی نیند طاری کی ہے۔ رانیہ کی روح اپنے جسم سے تقریباً تین گھنٹے دور رہی ہے، واپس اپنی جگہ آ کر اسے ایک پرسکون نیند کی ضرورت تھی، چنانچہ اس پر نیند طاری کرنا ضروری تھا ورنہ عام طور پر یہ اتنی گہری نیند نہیں سو سکتی تھی اسی لیے تو ہم سب اس کمرے میں موجود ہیں اور چوبیس گھنٹے رانیہ کے جاگنے سے پہلے ہم یہیں، اس کمرے میں رہیں گے۔'' تاشون نے مونگا کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا۔

''پھر بھی آپ لوگ یہاں مشرقی دریچے کی سمت آ جائیں، یہاں بیٹھنا مجھے بھی بہت پسند ہے، یہ عشق پیچاں کی بیل اور اس کے پھول کس انداز میں جھکے ہوئے ہیں؟''

''جیسے کوئی محبوب کے سامنے دوزانو ہو کر اپنے عشق کو محترم کر رہا ہو، تعظیم دے رہا ہو، لافانی دنیا کا راہی ہو جیسے عشق کا راہی۔'' تاشون نے مشرقی دریچے میں اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

عمر اور زلفی جیسے تاشون کی اس بات کے سحر میں آ گئے تھے، وہ عشق پیچاں کی بیل اور اس کے لاتعداد پھولوں کو دریچہ چومتے دیکھتے رہے۔ اس روز سے پہلے زلفی نے کبھی اپنے گھر میں لگی اس حسین اور پھولدار بیل کے بارے میں کچھ خاص غور نہ کیا تھا، یہ سب شوق تو اس کی رانیہ کے تھے، رانیہ کا خیال آتے ہی اس نے رانیہ کی طرف ایک پیار بھری نظر ڈالی تھی۔

مونگا تھوڑی تھوڑی دیر بعد رانیہ کے بازوؤں، پیروں اور پیشانی کا مساج کرتی اور کبھی مختلف سوکھے ہوئے پھولوں اور جڑی بوٹیوں سے اس کا جسم اوپر سے لے کر نیچے تک جھاڑتی۔

تاشون نے مونگا کی طرف دیکھا اور مخاطب ہوا۔ ''اب سب ٹھیک ہے مونگا، تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔''

''نہیں، اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں، تم لوگوں کے ساتھ ہی بیٹھوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے مونگا بھی مشرقی دریچے میں اُن تینوں کے درمیان آ بیٹھی تھی۔

''آپ اروما آئلز کے بارے میں کیا باتیں کر رہے ہیں؟'' مونگا نے تاشون سے سوال کیا تھا۔

''میں ان اروما آئلز کے بارے میں کچھ باتیں جاننا چاہ رہا تھا اور رانیہ کو لگائے جا رہے ہیں۔'' عمر سومرو نے مونگا کی بات کے جواب میں کہا تھا۔ ''مجھے کچھ بات لگتی ہے ان آئلز میں، میں جب انگلینڈ میں تھا تو وہاں اکثر اروما آئلز کا ذکر سنتا رہتا تھا، وہاں باقاعدہ ارومیٹک کلینکس، Healings consultancy موجود ہیں مگر یہاں پاکستان میں، میں نے اس کا اتنا چرچا نہیں سنا، میں ان اروما آئلز اور ان کے فوائد کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں اور یہ بھی کہ یہ آئلز رانیہ بھابھی پر کیوں استعمال کرا رہے ہو؟''

''یہاں پاکستان میں ابھی تک ان جڑی بوٹیوں یا ان کے فوائد اور ان سے نکالے گئے تیلوں کے بارے میں زیادہ شعور بیدار نہیں ہوا اور اگر کچھ لوگوں میں ہوا بھی ہے تو ایسے لوگوں کی بہت کم تعداد ہے جو اِن چیزوں اور اِن کی افادیت کے بارے میں کچھ زیادہ جانتے ہوں حالانکہ یہ جڑی بوٹیاں اور اُن سے نکالے گئے آئلز ایک خزانہ ہیں۔ جب لوگوں کو ان کے بارے میں مکمل آگہی حاصل ہو جائے گی تو وہ افسوس کریں گے کہ ان کی بہت سی تکالیف کا علاج ان کے آس پاس تھا اور وہ اپنی تکالیف کے علاج کے لیے کہاں کہاں بھٹک رہے تھے۔'' مونگا نے اپنی معلومات کا اظہار کیا تھا۔

''مونگا، تم نے بالکل درست کہا۔'' تاشون نے مونگا کی تائید کی تھی۔

''کیا یہ چیزیں جادو میں ہی استعمال کی جاتی ہیں؟'' عمر نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے دوست، یہ herbs اور ان کی خوشبویات بیماریوں کے علاج کے لیے ہیں۔ جادو اور ساحری کے لیے کچھ دوسرے ایلیمنٹ ہیں، یہ نہیں۔''

''لیکن......'' عمر نے تاشون کی بات ختم ہوتے ہی پھر کوئی سوال کرنا چاہا تھا۔

''تم سن تو لو یار، سوال پہ سوال کر رہے ہو۔'' زلفی بے ساختہ بول پڑا تھا۔

''ارے نہیں زلفی۔'' تاشون نے فوراً ہی مداخلت کی تھی۔ ''اس میں عمر کی کوئی غلطی نہیں، یہ تو انسانی فطرت ہے کہ ہر نئی چیز آپ کو حیرت میں ڈال دے گی اور آپ کے ذہن میں ہزارہا سوالات پیدا کر دے گی، چنانچہ عمر بھی اسی سچویشن کا شکار ہے۔ کیا تم اس بارے میں نہیں جاننا چاہو گے؟''

''میں تو سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ رانیہ کے ساتھ جو جو ہوا؟ اور پھر تم نے کس طرح میری دنیا بچائی، اس کا علاج کیا اور کر رہے ہو، میں وہ سب جاننا چاہتا ہوں جو تم مناسب سمجھو، مجھے بتانا۔''

''ایک منٹ زلفی۔'' تاشون نے نرمی سے کہا تھا۔ ''میں نے تمہاری دنیا نہیں بچائی، وہ تو اوپر سے حکم تھا جو میں نے بجا لانے کی توفیق کی۔'' تاشون نے اوپر آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے حکم کے بغیر میں کچھ نہیں، سب کچھ وہی ہے۔''

تاشون پر جذب کا عالم طاری تھا، آنکھیں نم سی ہو گئی تھیں، تھوڑی دیر خاموشی رہی تھی پھر تاشون نے ہی وہ خاموشی توڑی تھی۔

''عمر، تم اروما آئلز کی بات کر رہے تھے ناں؟ یہ لیونڈر اور روزمیری کی خوشبو جو ہمارے اعصاب کو بہت سکون بخش رہی ہے، یہ لیونڈر اور روزمیری سکون آور خوشبودار تیل ہیں، لیونڈر تمام خواب آور ادویات سے زیادہ خواب آور خصوصیات کی حامل ہوتی ہے اس لیے مونگا تھوڑے تھوڑے وقفے سے رانیہ کی پیشانی پر اس کا مساج کر رہی ہے۔''

''لیونڈر کی خوشبو صرف نیند اچھی لاتی ہے؟'' زلفی نے رانیہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"لیونڈر آئل کی مالش نیند کے علاوہ جلد کے نقائص کو دور کرنے، عام حشرات الارض جیسے مچھر، بھڑ، چیونٹیوں کے کاٹنے سے پیدا ہونے والے مضر اثرات کو دور کرنے کے لیے بھی مفید ہے، پوری دنیا کے اروما تھراپسٹ اس بات پر متفق ہیں کہ جب سانس کے ذریعے لیونڈر کی خوشبو کو محسوس کیا جاتا ہے تو یہ دماغ میں پہنچ کر limbic system کو متحرک کر دیتی ہے، دماغ کا یہ حصہ ہر ذی روح کے جذبات و احساسات کو کنٹرول کرتا ہے اور جب یہ لیونڈر کی خوشبو کی بدولت متحرک ہوتا ہے تو ذہنی سکون میسر آتا ہے اور نیند بہت گہری اور پرسکون آتی ہے۔" تاشون یہ بتاتے ہوئے ذرا رکا تھا۔ "یہ صرف ماخذ کی گئی باتیں نہیں ہیں بلکہ اس پر باقاعدہ ریسرچ ہوئی ہے۔ ویانا یونیورسٹی، آسٹریلیا کے کیمسٹ لیونڈر جیروویز اور ان کی ٹیم کے افراد نے لیونڈر کی خواب آور خصوصیات کا تجربہ چوہوں پر کیا، اس سلسلے میں چوہوں کے پنجرے میں لیونڈر کی خوشبو بکھیر دی گئی جس کے بعد کچھ دیر ہی میں چوہے اونگھنے لگے اور پھر کئی گھنٹوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے اور جب خوشبو کا اثر ختم ہوا تو چوہے بیدار ہو کر دوبارہ پنجرے میں اچھل کود کرنے لگے۔ اس ریسرچ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ لیونڈر گہری نیند کی راہ ہموار کرتی ہے۔"

"اوہ، جب ہی تم تھوڑے وقفے بعد لیونڈر کا اسپرے کمرے میں جاری رکھے ہوئے ہو زلفی، تاکہ رانیہ کی نیند کا وقفہ طویل ہو جائے؟"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔" تاشون نے کہا۔ "یہ رانیہ کے لیے ازحد ضروری بھی ہے اس لیے اکثر خوشبویات کو جادوئی اثر کہا جاتا ہے، جس میں یہ لیونڈر شامل ہے اور یہ سب جو مونگا کر رہی ہے، اس کو ہم 'اروما تھراپی' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے "Aromapathy" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علم فرانس سے نکلا ہے، اس کے موجد فرانس کے کیمیادان موریس گیٹے فوسے ہیں اور تم لوگ یہ جان کر حیران ہو گے کہ اس کی ابتدا ایک حادثے سے ہوئی تھی۔"

"حادثے سے؟" عمر اور زلفی ایک ساتھ بولے تھے۔

"ہاں۔" تاشون نے کہا۔ "اروما تھراپی کے اس عظیم الشان پراسرار علم کی ابتدا حادثاتی طور پر ہی ہوئی، ہوا کچھ یوں تھا کہ 20ویں صدی کی ابتدا میں ایک لیبارٹری میں کام کے دوران کیمیکل ری ایکشن کے سبب گیٹے فوسے کا ہاتھ جل گیا تھا، جلن اور تکلیف کے باعث فوری طور پر اس کے حواس معطل ہو گئے اور اس نے بنا سوچے سمجھے بالکل غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ لیونڈر آئل سے بھرے برتن میں ڈال دیا، جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ درد و تکلیف بالکل ختم ہو چکی ہے۔ گیٹے فوسے نے پھر عملی طور پر پہلی جنگ عظیم کے دوران زخمی سپاہیوں پر اس تیل کے تجربات کرنے شروع کیے جس سے یہ بات مشاہدے میں آئی کہ کئی فراری تیلوں کے لگانے سے زخم ٹھیک ہو جاتے ہیں چنانچہ پھر اس نے 1928ء میں اپنی ان قیمتی معلومات پر مبنی ایک کتاب لکھی جسے اروما تھراپی سے متعلق پہلی کتاب قرار دیا جاتا ہے۔ گیٹے فوسے کے بعد دوسرے ماہرین بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے۔ فرانس ہی کے بائیوکیمسٹری کے ماہر میڈم مائل ماوی نے تجدید شباب اور افزائش حسن کے اس طریقۂ علاج کی اہمیت کو اجاگر کیا اور پھر ان ہی دنوں ماہرین کی کاوشوں کے نتیجے میں آج اروما تھراپی ایک علم کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یہ طریقۂ علاج دنیا بھر میں تیزی سے مقبولیت کی سند حاصل کر رہا ہے اور اب یہاں پاکستان میں بھی اس کا شعور بیدار ہو رہا ہے لیکن یہاں ابھی دنیا کے مقابلے پر کم ہی ہے۔ اروما تھراپی جسمانی نظام خصوصاً جسمانی دفاعی نظام کے لیے ایک بہترین طریقۂ علاج ہے۔ جسمانی بیماریوں کے علاج میں

آج سنگِ میل کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں الباما یونیورسٹی، امریکہ کے سائنس دانوں نے حال ہی میں خوشبو کے اثرات پر تجربات کیے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے دیگر ہم عصروں کی طرح چوہوں کو ہی زیرِ تجربہ رکھا جنہیں ہر تیسرے دن چار گھنٹوں تک کافور سنگھایا گیا، کافور سنگھانے سے پہلے انہیں کیمیائی مرکب کا ایک انجکشن لگایا جاتا جس سے جسم میں انٹرفیرون جسم کے ان خلیات کو مستعد اور چوکس کر دیتے ہیں جن پر جسم کے ان خلیات کا دارومدار ہوتا ہے جو کینسر کے خلاف مزاحم ہوتے ہیں۔ میڈیکل سائنس کے ماہرین کے مطابق یہ کینسر کے خلاف ہمارے جسم کی پہلی دفاعی لائن ہوتی ہے۔ سائنس دانوں نے ان تجربات کو 9 مرتبہ دہرانے کے بعد چوہوں کو تین دن کا آرام rest دیا اور چوتھے دن ان میں بعض کو صرف کافور سنگھایا۔ اس بار انہیں وہ انجکشن نہیں دیا جو انٹرفیرون کو تحریک دیتا ہے، اس تجربے کے نتائج دیکھ کر سائنس دان ششدر رہ گئے تھے کیونکہ محض کافور سونگھنے سے ہی چوہوں کے جسم میں انٹرفیرون کی افزائش تین گنا بڑھ گئی تھی۔" تاشون نے ایک گہری سانس لی اور اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور پھر بولا۔ "یہ تو تم لوگ جانتے ہی ہو گے کہ سونگھنے کی حس کو قوتِ شامہ کہتے ہیں لیکن اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگاؤ کہ اگر ہم ایک ملی گرام کلوروفینال (chlorophenol) کو اگر ایک 230 کیوبک میٹر کے کمرے میں ڈال دیں تو اس کی smell محسوس کی جا سکتی ہے یعنی ایک ملی گرام کا 23 کروڑواں حصہ بھی ایک کیوبک سینٹی میٹر ہوا میں محسوس کر سکتے ہیں اس لیے ایک قطرہ لیونڈر یا بیسل آئل یا اور کوئی دوسرا اروما آئل براہ راست nervous system پر اثر انداز ہوتا ہے۔"

"واقعی تاشون، یہ بات تو ہے۔" زلفی نے کہا۔ "اگر کوئی خوشبو سونگھ لی جائے تو ہمیں کافی دیر تک اس کا احساس رہتا ہے لیکن خوشبویات بیماریوں کا علاج یا بے خوابی دور کرتی ہیں، یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ کہاں لوگ بے خوابی دور کرنے اور اعصاب کو سکون پہنچانے کی مہنگی ترین ادویات استعمال کرتے ہیں، ڈاکٹرز کے چکر پہ چکر لگاتے ہیں لیکن سب بے سود رہتا ہے اور کہاں یہ معمولی جڑی بوٹیوں سے کشید کیا گیا قیمتی ترین فوائد کا حامل اروما آئل۔"

"نہیں زلفی، ہر جڑی بوٹی معمولی نہیں ہوتی، کچھ جڑی بوٹیاں قیمتی ہوتی ہیں جیسے صندل اور تلسی وغیرہ، ان کے آئل بھی بہت ہی قیمتی ہوتے ہیں اور کچھ جڑی بوٹیاں بالکل عام معمولی ہمارے گھروں میں موجود ہوتی ہیں لیکن ہم ان کے فوائد سے انجان ہوتے ہیں۔"

"مثلاً......" زلفی نے فوراً پوچھا۔

"جیسے اجوائن۔" مونگا نے جواب دیا۔

"اجوائن؟" عمر نے حیرت کا اظہار کیا۔ "اس کی خوشبو بھی استعمال ہوتی ہے؟"

"جی جناب......!" مونگا نے کہا۔ "شکاگو یونیورسٹی کے ڈاکٹر ولیم ایلیٹ نے اپنی ریسرچ کے دوران یہ تجزیہ بھی کیا ہے کہ اجوائن کا ایک جز 3 بیوٹائل متھلائڈ ہوتا ہے اور اس کی بدولت اجوائن میں خوشبو ہوتی ہے، اجوائن کا اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ اسے کھانے سے اعصابی تناؤ اور ذہنی کرب سے چھٹکارہ ملتا ہے، تمہیں یہ جان کر مزید حیرت ہو گی کہ اس اجوائن کے محض دو ڈنٹھل سونگھنے سے ہی ذہنی دباؤ میں کمی آتی ہے اور بلڈ پریشر نارمل ہو جاتا ہے۔"

"واقعی یہ بہت حیرت انگیز ہے۔" عمر نے کہا تھا۔

"اچھا مونگا، یہ بتاؤ، تم نے رانیہ کو کون سی خوشبودار جڑی بوٹی کا تیار کیا ہوا تیل لگایا ہے؟" زلفی نے مونگا سے سوال کیا۔

اس مساج میں لیونڈر، بیسل آئل (Basil oil) یعنی تلسی کا تیل، صندل کا تیل، clary sage oil وغیرہ استعمال

ہوئے۔ اب تم یقیناً تلسی کے آئل اور باقی آئلز کے متعلق بھی جاننا چاہو گے تو یہ Basil oil یعنی تلسی ایک مشہور درخت ہے جو خوشبودار پتے اور پھول رکھتا ہے۔ ان سے ہی تیل کشید کیا جاتا ہے۔ یہ جو تیز کافوری خوشبو تمہیں محسوس ہو رہی ہے، تلسی کی ہی ہے، یہ ڈپریشن، افسردگی، مایوسی ختم کرنے میں جادوئی اثرات کا حامل ہے۔ ڈاکٹر جین والنٹ فرانس کے ایک مشہور اروماتھراپسٹ ہیں، ان کی تحقیق کے مطابق Basil oil عصبی اور اعصابی نظام کے لیے ایک ٹانک کا درجہ رکھتا ہے اور اس کو nervous system کی خرابیوں کو دور کرنے میں اہم مقام حاصل ہے۔ یہ جو دنیا کی کل آبادی کا 5 فیصد دردِ شقیقہ (مائیگرین) کا شکار ہے، تلسی کا تیل اس کا شافی علاج ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ!" مائیگرین کا تو میں عرصۂ دراز سے شکار ہوں۔" عمر نے کہا۔ "ہزار ہا علاج کرا چکا ہوں لیکن یہ درد پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

"اب چھوڑ دے گا۔" مونگا نے کہا۔ "کیونکہ مائیگرین کے درد کے لیے Basil oil خاص الخاص ہے۔ اگر اس کی اولین علامت میں Basil oil کا مساج کیا جائے اور اس کے پتوں کی چائے شہد ملا کر استعمال کرائی جائے۔ اس کا مساج خاص طور پر کنپٹیوں، گردن اور سولر پلیکسز یعنی سینے کی نچلے حصے کی ہڈی کے مقام پر دائرے کی صورت میں کیا جائے تو صرف بیس منٹ میں مائیگرین کے شدید ترین دورے میں افاقہ ہوتا ہے اور ایک گھنٹے میں آپ کھڑے ہو جائیں گے اور سوچیں گے کہ کیا مجھے مائیگرین تھا بھی یا نہیں؟" مونگا نے پرجوش انداز میں کہا تھا۔ "اور ہاں، رانیہ کی بے خوابی کے علاوہ اعصابی نظام میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے، اس کے لیے یہ لیونڈر، تعمیر نو کا کردار ادا کرے گا کیونکہ نفسیاتی طور پر Basil تلسی کی خوشبو انسان کے شعور کو جلا بخشتی ہے، سوچ و بچار اور فیصلہ کرنے کے لیے تلسی کے تازہ پتے مسل کر سونگھتے رہنا چاہیے۔ ایک قطرہ، صرف ایک قطرہ اگر Basil oil کا روئی پر ٹپکا کر اگر آفس ہو تو میز پر اور کمرہ ہو تو اپنی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ لینا چاہیے، یہ دماغ سے سارے فضول خیالات نکال کر یکسوئی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے ساتھ ذہنی تھکان دور کرتی ہے اسی لیے اب جب رانیہ اٹھے گی تو یہ افسردہ رنجیدہ یا ڈپریسڈ نہیں ہو گی اور جو اس پر گزری ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اعصاب بہت حد تک نئے سرے سے تعمیر ہو چکے ہوں گے۔" مونگا نے اپنی بات مکمل کی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ گھر میں تلسی کا پودا لگانا چاہیے تاکہ جب بھی سستی کاہلی، افسردگی، ڈپریشن محسوس ہو تو پتے توڑ کر مسل کر سونگھ سکیں یا پھر آپ سے Basil oil لے لینا چاہیے۔"

"جی بالکل، بالکل، میں آپ کو پودا بھی دے سکتی ہوں، میرے یہاں پاکستان میں جو گھر ہے، وہاں تلسی کے بے شمار پودے سب نے لگا رکھے ہیں۔" مونگا نے عمر کے سوال کے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"تو جناب، اب تو آپ کو یقیناً اروماتھراپی کی ہسٹری کچھ کچھ سمجھ آ گئی ہو گی؟" تاشون نے زلفی اور عمر سے سوال کیا تھا اور اُن کے اثبات میں سر ہلانے پر بولا تھا۔ "یہ ٹاپک بہت وسیع ہے، ابھی تو میں نے آپ کو صرف ایک دو آئلز کے بارے میں بتایا ہے، وہ بھی چیدہ چیدہ باتیں، یہ تو کچھ بھی نہیں، اگر آپ کو تفصیلاً ہر جڑی بوٹی کے بارے میں بتانے بیٹھ جاؤں تو نہ جانے آپ کے ساتھ کتنی نشستیں کرنی پڑیں مجھے، اسی لیے فی الحال میں چند ایک ایسنشیل آئلز یعنی اروما آئلز کے بارے میں خاص باتیں بتا دیتا ہوں، تفصیل اگلی کسی نشست میں ہو گی، ان میں ایک سرِفہرست آئل ہے جو سفیدہ یعنی Euclyptus oil جو کھانسی، زکام، بخار، جوڑوں کے درد اور گھر کو جراثیم سے محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لوبان یعنی Banzoin oil ایک درخت کا گوند ہے جس کی خوشبو کو بے خوابی،

ذہنی دباؤ، فوبیا، سانس کے عوارض سے نجات کے لیے مؤثر قرار دیا گیا ہے۔ گلاب، rose oil یا گلاب کی پتیوں میں عرقِ گلاب سے غسل کرنا بھی خواب آور خصوصیات کا حامل ہے، اس کے علاوہ یہ ٹینشن، معدے کے نقائص دور کرنے کے ساتھ ساتھ جلد کی خوبصورتی بھی بڑھاتا ہے۔ بنفشہ (voilet oil) کا بطورِ مساج استعمال وزن کو کنٹرول رکھتا ہے، سوجن دور کرتا ہے۔ صنوبر (cedar) کی خوشبو غسل کے پانی میں شامل کی جائے تو اعصابی تناؤ، مثانے کی خرابیاں اور اینٹھن وغیرہ میں مفید ہے۔ روزمیری بھی ایک اینٹی سیپٹک ہے، کیل مہاسے، جھائیوں، ایگزیما اور جلد کے انفیکشن دور کرنے میں کردار ادا کرتا ہے۔ ساج یعنی clary sage oil ہے، اس کے ایسنشیل آئل کی کاسمیٹک انڈسٹری اور ادویہ سازی میں بہت مانگ ہے اور خصوصاً امراضِ نسواں میں اس کے طبی خواص بہت باکمال ہیں۔ نہایت طاقتور اینٹی سیپٹک ہے۔ پندرہویں، سولہویں صدی کے تمام حکماء اور ڈاکٹرز کلیری سیج (clary sage) کے خواص کے معتقد تھے۔ 1639ء میں سائمن پالی نامی ماہرِ نباتات نے بھی چار سو صفحے کی ایک کتاب صرف اور صرف کلیری سیج کے خواص پر لکھی اور اس کا ایک مشہور جملہ آج بھی انگریزی محاوروں میں موجود ہے۔ "اگر ہاتھ پاؤں شل ہو جائیں اور اعصاب تباہ ہو چکے ہوں تو بھی کلیری سیج انسان کو مضبوط و توانا بنا سکتا ہے۔" جدید تحقیقات سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اعصابی قوت توانائی اور بیماریوں کے اثرات دور کرنے کے لیے کلیری سیج سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ اس آئل سے آنکھوں کے لاتعداد امراض میں شفایابی کا تناسب اتنا زیادہ تھا کہ اس آئل کا نام ہی کلیری سیج پڑ گیا کیونکہ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "شفاف آنکھیں۔" قدیم رومی اسے یادداشت گم ہونے یا حیات کی کمی کا شافی علاج تصور کرتے تھے اور قدیم مصریوں کے ہاں بانجھ پن کے امراض کا دنیا میں اور کوئی دوسرا علاج نہ تھا سوائے کلیری سیج کے، آج بھی یورپ کے اروماتھراپسٹ امراضِ نسواں اور امراضِ چشم میں سب سے پہلے اس کو استعمال کراتے ہیں پھر کسی دوسرے آئل پر توجہ دی جاتی ہے۔ اس کے سحری خواص میں سے ایک خواص یہ بھی ہے کہ شدید غم، ٹینشن اور مایوسی کی حالت میں چند لمحے اس کو سونگھا جائے اور پھر نیلی اور سنہری روشنی کا مراقبہ کیا جائے تو طبیعت میں بشاشت و راحت پیدا ہوتی ہے بلکہ غیر معمولی شفاف خواب نظر آتے ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے لیونڈر کے ساتھ اسے مکس کر کے سونگھنے سے نہایت گہری نیند آتی ہے۔" تاشون نے اپنی بات سمیٹتے ہوئے کہا تھا اور پھر وہ مونگا سے مخاطب ہوا تھا۔

"مونگا، تمہیں یاد ہے نا، رانیہ بھابھی کے جاگنے پر انہیں ان آئلز کا باتھ لینا ہے؟"

"تم بےفکر رہو تاشون، مجھے سب یاد ہے، بالکل ویسا ہی ہو گا جیسا کہ تم نے ہدایات دی ہیں۔"

"میں بہت مشکور ہوں تمہارا، تم نے جس طرح اس معاملے میں میرا ساتھ دیا ہے۔" تاشون نے تشکرانہ انداز میں کہا تھا۔

"ارے، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم دوست ہو میرے، دوست، یاد نہیں کیا؟" یہ کہہ کر مونگا شرارت سے مسکرائی تھی۔

•......•......•......•

دن کافی چڑھ آیا تھا، تاشون کی ہدایات پر مکیا کو صبح سویرے ہی جگا دیا گیا تھا، رات کس قیامت خیزی کو اپنے دامن میں سمیٹے گزر گئی تھی، مکیا کو معلوم ہی نہ ہو سکا تھا۔ اسے تو حسبِ معمول بس اتنا ہی پتہ چلا تھا کہ رانیہ بی بی کی طبیعت خراب ہے اور اوپر تاشون صاحب اس کا علاج کر رہے ہیں، ویسے بھی وہ ایک وفادار خدمت گزار تھی جو بتا دیا گیا، سن لیا اور جو نہ بتایا گیا، اس کی سن گن لینا اس کی سرشت میں شامل نہ تھا۔

عمر سومرو، تاشون سے اجازت لے کر نیچے لان میں آ کر بیٹھا ہوا تھا۔ تاشون اور زلفی، رانیہ کے پاس ہی

تھے۔ مونگا ہلکا پھلکا ناشتہ تیار کرنے میں ملکیا کی مدد کر رہی تھی۔ ناشتے کی تیاری کے بعد ملکیا نے ٹیبل لگانی چاہی لیکن مونگا نے روک دیا کیونکہ آج انہیں رانیہ کے پاس سے ہٹنا بالکل نہیں تھا۔ وہ سرونگ ٹرے (serving tray) میں ناشتہ لگا کر اوپری منزل پر آ گئی اور تاشون کے سامنے رکھی میز پر ناشتہ لگا دیا۔ عمر کو بھی بلا لیا گیا۔ تاشون نے زلفی کو اپنے ہاتھ سے ناشتہ سرو کیا تھا۔

زلفی بار بار رانیہ کو دیکھ رہا تھا' اس کے حلق سے اب بھی نوالہ نہیں اتر رہا تھا۔ تاشون اس کی یہ حالت دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا' اس وقت زلفی کو کچھ کہنا سننا بے کار ہے' چنانچہ بس خاموشی سے اسے دو چار نوالے لیتے دیکھتا رہا۔

''یہ میری نااہلیت کا نتیجہ ہے کہ ہم اس مصیبت میں پھنس گئے۔'' زلفی نے رانیہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اسی اثناء میں مونگا پیالیوں میں چائے انڈیل رہی تھی۔ تاشون نے گرم گرم چائے کی پیالی سے ایک خوشگوار گھونٹ لیتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

''پلیز زلفی......! اب تم خود کو کوسنا چھوڑ دو' تمہارا کوئی قصور نہیں ہے' قسمت میں جتنے دھکے ہوتے ہیں' انسان کو بہر حال اپنے گھر میں بیٹھ کر بھی کھانے پڑتے ہیں۔''

زلفی کی آنکھیں نم ہو گئیں' تاشون محسوس کر رہا تھا کہ زلفی کس قدر شدید قلبی اذیت میں مبتلا ہے۔ ''مجھے معلوم ہے زلفی' تم نے گزشتہ رات جو شیطانی تماشہ دیکھا ہے' اس نے تمہیں بے حد خوفزدہ کر دیا ہے لیکن اب ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان شیطانی قوتوں سے مرعوب ہو کر رہیں اور سمجھ لیں کہ شیطانی قوتیں سب کچھ کر سکتی ہیں' دنیا کی ہر چیز کی طرح ان شیطانی قوتوں کی بھی حد ہوتی ہے۔ غیر محدود قوت صرف اور صرف اللہ کی ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز محدود ہے اور میں تمہیں ایک انوکھی بات بتاؤں کہ یہ پراسرار قوتیں قوانینِ فطرت پر ہی قائم ہوتی ہیں لیکن سیل شیا ان قوانینِ فطرت کو توڑنے کی مرتکب ہوئی ہے۔ اب تم دیکھنا' اس کا ڈاؤن فال کیسے شروع ہوتا ہے۔'' تاشون نے اپنے پیارے دوست کے دل سے مجرمانہ احساس مٹانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد مونگا نے تاشون کے بیڈ روم اور رصدگاہ کو الگ کرنے والا درمیانی دروازہ کھول دیا تھا۔ تاشون جب سے پاکستان آیا تھا' اس نے زلفی کے گھر کے اندر اپنی اس رصدگاہ میں موجود اسٹڈی کو اپنے ذوق کے مطابق ترتیب دے دیا تھا۔ اس کمرے میں بہترین پالش کیا ہوا لکڑی کا فرش تھا جس پر اِدھر اُدھر آرام دہ صوفے اور بڑی سی آرام کرسی پڑی ہوئی تھی' سامنے ہشت پہلو کتابوں کی الماریاں تھیں جن میں اوپر چھت تک کتابیں بجی ہوئی تھیں' لکھنے کے لیے تاشون کی ایک بہت بڑی بیضوی میز کشادہ فرانسیسی دریچے کے سامنے پڑی ہوئی تھی' بڑے بڑے فرانسیسی دریچوں پر جب رات کو پردے گرائے جاتے اور چھت کے اندر چھپی ہوئی روشنیاں کام میں لائی جاتیں تو یہ کمرہ ایک نہایت پرسکون اور آرام دہ مقام بن جاتا تھا جو مطالعہ کرنے اور روحانی عملیات کرنے کے لیے بہترین ماحول پیش کرتا تھا۔

اس وقت مونگا کے ساتھ عمر بھی وہاں موجود تھا' وہ پہلے بھی اس کمرے میں کئی مرتبہ آ چکا تھا لیکن آج ایک بار پھر نئی دلچسپی کے ساتھ اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ گزشتہ رات اسی رصدگاہ یا دارالمطالعہ میں اس نے اپنی زندگی کا پہلا اور شاید آخری انوکھا تجربہ دیکھا تھا جس کا وہ خود حصہ بن چکا تھا لیکن یہاں دوبارہ آ کر اب اس کے دل میں کسی خوف کا شائبہ تک نہ تھا' اسے وہ جگہ اور بھی نئی اور پرسکون نظر آ رہی تھی' رونق ہی رونق تھی وہاں پر' عجیب سی سحر انگیز سی فضا تھی اور کمرہ بغیر روشنی کے روشن نظر آ رہا تھا۔ تاشون مشرقی دریچے کی سمت بیٹھا سامنے عمر کی حرکات نوٹ کر رہا تھا' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' عمر سومرو تیز تیز چلتا تاشون کے قریب آ پہنچا تھا۔

''کل یہاں اتنا کچھ ہوا لیکن حیرت کی بات ہے' اب یہاں رونق کتنی ہے' ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کہ آج سے پہلے میں نے یہ رصدگاہ ایسے نہیں دیکھی جیسے کہ آج۔''

''اس کی ایک وجہ ہے' نیپچون کے سعد نظرات......'' یہ کہہ کر تاشون مسکرایا تھا۔

''نیپچون؟'' عمر نے نا سمجھنے والے انداز میں کہا تھا۔

''ہاں' نیپچون' ایک پراسرار ستارہ ہے جس کو اب تک Astrology میں پوری طرح سمجھا ہی نہیں جا سکا' نیپچون ہر شخص کے زائچۂ پیدائش میں کہیں نہ کہیں ہوتا ہے' جب یہ ستارہ اپنے دوست ستاروں کے ساتھ سعد نظرات قائم کرتا ہے' تب سحر انگیز اوقات آتے ہیں یا ہم اپنے آپ کو ایسے مقامات پر پاتے ہیں جنہیں ہم جادوئی محسوس کرتے ہیں اور حقیقتاً جادوئی ہوتے بھی ہیں۔ یہ جو ابھی تمہیں اچانک دارالمطالعہ عجیب سحر انگیزی لیے محسوس ہوا ہے' یقیناً تمہارا نیپچون اور نظرات قائم کر رہا ہے اور حقیقتاً میرا دارالمطالعہ سحر انگیز بھی ہے ورنہ تمہیں نہ لگتا۔''

''اوہ......ویری انٹرسٹنگ۔'' اب زلفی اور مونگا بھی تاشون کے قریب آ گئے تھے۔ ''یہ اچھا ہے کہ تم ہمیں سحر انگیز اوقات اور مقامات کے بارے میں کچھ بتاؤ' اس طرح یہ ٹائم اچھا گزر جائے گا جو ہم رانیہ کے بیدار ہونے کے انتظار میں گزار رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے زلفی کے لہجے میں خاصا تجسس موجود تھا۔

''ہاں' یقیناً۔'' تاشون نے فوراً ہی کہا تھا۔ اسے خوشی ہوئی تھی کہ زلفی اب پہلے سے ریلیکس ہے۔ ''کیا تم نے کبھی دل موہ لینے والی جگہ دریافت کی؟ یا کبھی جنگل میں درختوں کے درمیان کوئی ایسا راستہ پایا جہاں انتہائی خاموشی اور سکون کا احساس ہو؟ اور کیا کمرے کو ایسا روشن' چمکدار دیکھا جو کسی روشنی کی وجہ سے نہ ہو' زندگی میں سب ٹھیک چل رہا ہو اور اس احساس کی کوئی معقول وجہ نہ ہو؟'' تاشون نے چند سوالات یکے بعد دیگرے کیے اور پھر خاموشی سے عمر اور زلفی کی طرف دیکھا۔ وہ انہماک سے گفتگو سن رہے تھے۔

''تم نے بتایا نا' ایسا نیپچون کے سعد نظرات کی وجہ سے ہوتا ہے۔'' عمر نے کہا۔

''ہاں' بالکل ٹھیک لیکن تم ان مقامات کو تلاش کرنا چاہو گے تو کبھی نہیں ملیں گے' یہ صرف اس وقت ملتے ہیں جب ہمارا پیدائشی نیپچون سعد نظرات بنا رہا ہو یا شمس' قمر' مشتری' زہرہ یا زحل مقام نیپچون پر آئے ہوں اس لیے کہ کواکب نیپچون کے دوست ہیں' ان میں سے کسی بھی ستارے کا جب آپ کے پیدائشی نیپچون سے قران ہو گا' آپ کو کسی بھی سحر انگیز مقام پر لے جائے گا' کوئی جگہ جو ایک دم خوبصورت' سحر انگیز اور پرسکون محسوس ہو' جو آپ میں خوشی کا احساس پیدا کرے' وہ دراصل سحر انگیز ہوتی ہے۔ ایسی کسی جگہ کا مل جانا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ زندگی میں بہتر تبدیلی آنے والی ہے اور اسے ایک اچھی علامت سمجھنا چاہیے اس لیے کہ نیپچون کے دوست کواکب اس سے سعد نظر بنا رہے ہوتے ہیں' اس طرح وہ آپ کی فلاح کے لیے کام کرتے ہیں۔''

''لیکن ایک سوال میرے ذہن میں آ رہا ہے' وہ یہ کہ......'' ابھی عمر سومرو نے اپنا سوال مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ اچانک باہر سے ملکیا کی ایک چیخ بلند ہوئی تھی......

حیرت' اسرار' تجسس اور علم و آگہی سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔



قدرت کی فیاضی

قدرت نے جس فیاضی کے ساتھ ہماری ارضِ وطن کو مختلف نعمتوں سے مالا مال کیا ہے اس کے لئے ہم جتنا بھی رب جلیل کا شکر ادا کریں، کم ہے۔ اس نے ہمیں زمین دی ہے تو زرخیز۔ پہاڑ دیئے ہیں تو معدنیات کے خزانوں سے معمور۔ صحرا عطا فرمائے ہیں تو قسم قسم کے ذخائر سے بھرپور اور دریا زمینوں کو سیراب کرنے والے۔ مختصر یہ کہ ارضِ وطن کی کوکھ سے سونا، تانبا، کوئلہ، تیل اور گیس بھی برآمد کی جارہی ہے اور زیر کاشت زمینوں سے ہر قسم کی اجناس بھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وطن عزیز میں ان محنت کش ہاتھوں کی بھی کمی نہیں جو زمین کا سینہ چیرنے، سمندری لہروں سے نبرد آزما ہونے اور دریاؤں کی روانی پر قابو پانے کے مشاق ہیں۔ یہی وجہ ہے اس خطہء زرخیز میں وعدوں کی کاشت بھی خوب زوروں پر ہے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ حکمرانوں کو اپنے وعدوں پر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا ملک ہو جو وعدوں کی پیداوار میں خود کفیل ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا تاکہ میرے علم میں بھی اضافہ ہو۔

سہام مرزا مرحوم نے یہ اداریہ ماہنامہ دوشیزہ میں نومبر 1994ء میں لکھا؟ یہ اداریہ یہ سوچ موجودہ دور کا عکاس نہیں